

سوانح خوشحال و غالب



شاه سردی



PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081



پی ڈی ایف (PDF) کتب حاصل کرنے اور واٹس ایپ گروپ «کتاب کارنر»
میں شمولیت کے لیے مندرجہ بالا نمبرز کے واٹس ایپ پہ رابطہ کیجیے۔ شکریہ

موازنہ خوشحال و غالب

ناز سرحدی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب موازیہ خوشحال وغالب

مصنف ناز سرحدی

کمپوزنگ ارشاد خان (پشتواکائیڈی پشاور)

پریس جہان پبلشرز، فیصل آباد

تعداد 500

سال اشاعت 2011ء

زرتعاون 300/- روپیہ

ملنے کا پتہ

☆ یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور شہر

☆ پشتواکائیڈی بک شاپ پشاور یونیورسٹی

☆ سعید بک بینک کیٹو نمٹ پلازہ ارباب روڈ پشاور کینٹ پاکستان

فون نمبر 091-5273761

☆ سعید بک بینک جناح سہرا سلام آباد پاکستان

فون نمبر 501-2651656-57-58

انتساب

خوشحال و غالب کے نام

فہرست

6	دیباچہ	ڈاکٹر راج ولی شاہ ٹٹک
11	حرف اول	ناز سرحدی
17	باب اول	شخصیت
18	حیات خوشحال وغالب۔ سنین کے آئینے میں	
26	ولادت و بچپن	
30	خوشحال وغالب۔ شخصیت	
65	تعلیم و تربیت اور علمیت	
87	مذہب و مسالک	
96	سے پرستی	
109	بڑھاپا	
125	باب دوم	فن
126	خوشحال وغالب کا نظریہ شعر	

- 138 خوشحال و غالب کی غزل
- 161 خوشحال و غالب کی قصیدہ گوئی
- 176 خوشحال و غالب اور سائنس
- 190 خوشحال و غالب کا فلسفہِ غم
- 202 خوشحال و غالب کی نثر
- 218 خوشحال و غالب کے کلام میں تصوف
- 243 خوشحال و غالب کی فارسی شاعری
- 261 خوشحال و غالب ۔ جراتِ اعلیٰ اور بے پاکی
- 294 خوشحال و غالب کی شاعری میں حسن و عشق
- 328 خوشحال و غالب کے ہاں طنز و مزاح
- 363 خوشحال و غالب ۔ اقبال کی نظر میں
- 391 خوشحال و غالب اپنے اشعار کے آئینے میں
- 427 **تنقید**
- 428 خوشحال و غالب کے اہم محققین اور نقاد

باب سوئم

ستون ہیں۔ جن کے سہارے ہماری ادبی تاریخ کا ڈھانچہ کھڑا ہے۔ یہاں اس امر کا ذکر ضروری ہے کہ یہ دونوں ہستیاں صرف پشتو اور اردو زبانوں تک محدود نہیں۔ بلکہ فارسی میں بھی جس کی ادبی روایت نے پشتو اور اردو کے ساتھ دیگر زبانوں 'چغتائی' 'ترک' 'کردی' 'عثمانی ترک' 'بلوچی اور پنجابی پر بھی گہرے اثرات مرتب کئے خوشحال و غالب نے طبع آزمائی کر کے اپنے اپنے علم و ہنر کا ثبوت دیا ہے۔

یہ بات لکھتے ہوئے مجھے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ باوی انگلش میں خوشحال و غالب کے تقابلی مطالعے یا شخصیت و فن کے موازنے کا وہ جواز نظر نہیں آتا جو ہمیشہ اس طرح کے علمی و ادبی مباحث کی بنیاد بنھتا ہے۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ شہد کی مکھی اور اڑدہ کبھی کبھی ایک ہی پھول سے رس لیتے ہیں۔ خوشحال و غالب کا بظہر غائر مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان دونوں فقید المثال ہستیوں کے حیات و افکار اور طرز اظہار میں بہت سی قدریں مشترک ہیں۔ جنہیں سامنے لانا اور ان پر بات کرنا از حد ضروری ہے کیونکہ ایسے ہی تقابلی مطالعے نہایت ہی جامع مواد کے ساتھ قلیل وقت میں ہمیں بہت کچھ پڑھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح سے اگر ایک طرف ہمیں ایک ہی مطالعے میں کئی جہتیں پڑھنے کو ملتی ہیں تو دوسری طرف موازنے کے عمل کے دوران بعض اوقات ہماری رسائی ان نکات تک بھی ہو جاتی ہے۔ جنہیں عام حالات میں دریافت کرنا قدرے مشکل ہوتا ہے۔

خوشحال خان خٹک جنہیں دنیا زیادہ تر پشتو کے بلند پایہ شاعر کے طور پر جانتی ہے

صرف ایک شاعر نہ تھے وہ ایک نڈر اور جنگجو سردار، مدبر سیاستدان، حاذق حکیم، تجربہ کار شکاری، بے بدل عالم اور صاحب طرز نثر نگار بھی تھے۔ ان کی شخصیت کا مطالعہ کرتے وقت ان کے ہر پہلو کے بارے میں یہی گمان ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی ساری توانائی اسی ایک پہلو پر صرف کی ہوگی، مگر آخر کار اس امر کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ ان کی کثیر الجہت شخصیت کی توانائیاں ہر سو پھیلی ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی خطے کی کسی بھی زبان میں خوشحال خان خٹک جیسی شخصیت کی مثال ابھی تک نظر نہیں آتی۔ مستشرقین کے علاوہ علامہ اقبال جیسی شخصیت بھی خوشحال کی شخصیت اور کارناموں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور انہی کی ہدایت و مشاوری سے برصغیر کی ایک بڑی خدیجہ فیروز الدین نے خوشحال خان خٹک کی حیات و افکار پر "The Life and works of illustrious Khushhal Khan Khattak" کے عنوان کے تحت پنجاب یونیورسٹی کے لیے پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ تحریر کیا۔ دوسری طرف غالب بھی اپنی گوں ناگوں خدیجیوں کے حوالے سے اذراہ کیا۔ تاریخ میں ایک عہد ساز شخصیت کی حیثیت سے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اردو شاعرانہ نے ان کے ہاں جوانی کا جوہن دیکھا اور جدید نثر نے ان کی آغوش میں آنکھ کھولی۔ شاید ہی دنیا میں کوئی ایسا شخص ہو جس نے اردو کا نام سنا ہو اور غالب کو نہ جانتا ہو۔

محترم ناز سرحدی داد اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔ جنہوں نے خوشحال و غالب جیسی بلند پایہ اور عظیم المرتبت ادبی ہستیوں کے حیات و فن کے موازنے کے حوالے سے اس گرانقدر تحقیقی اور تنقیدی کام کا بیڑا اٹھایا۔ اگرچہ انہوں نے تحقیق کے لئے انہی حوالوں

پراکتفاء کیا ہے۔ جو ایک عرصے سے دوست محمد خان کاکل، سید رسول رسا، پروفیسر حمید اللہ باغی، ڈاکٹر وزیر آغا، جمیل صدیقی، ایوب صابر، الطاف حسین حالی، ڈاکٹر ابوللیث صدیقی، ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر حمید احمد خان اور دیگر مرتب کرتے چلے آئے ہیں۔ جن کو استناد کا درجہ حاصل ہے اور اہل علم و دانش کے ایک وسیع حلقے کی شرف قبولیت بھی۔

گلوبل ویلج کے جدید تناظر میں خوشحال وغالب کا یہ تقابلی مطالعہ ہر لحاظ سے ایک قابل ستائش کاوش ہے۔ کیونکہ جس دور میں خوشحال وغالب زندہ تھے اس دور میں فاصلے اہل حقیقت کی طرح مواصلاتی رابطوں کی راہ میں حائل رہے ہوں گے۔ لیکن آج اس طرح کی علمی و ادبی معلومات کے لئے فاصلے اپنی حقیقت کھو چکے ہیں اور یوں یہ سوانح اردو ان طبقے میں خوشحال شناسی اور پشتو بولنے والوں کے لئے غالب شناسی کے حوالے سے بھرپور کردار ادا کرنے کا متحمل ہے۔

مصنف نے جی عرق ریزی اور جانفشانی سے خوشحال وغالب کے سوانح کے ضمن میں جن نکات کو موضوعات کے طور پر اٹھایا ہے۔ وہ اس بات کا یقین ثبوت ہے کہ وہ ایک وسیع مطالعے کے بعد ہی لکھنے بیٹھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں خوشحال وغالب کے حالات زندگی سے لے کر ہر دو شخصیتوں کے مذہبی، نظریاتی اور فنی پہلوؤں کا پورا پورا ادراک کرانے کے لئے مصنف حوالہ جاتی طریقہ کار اپناتے ہوئے ہیں۔ لیکن ان کا یہ عمل ان کے شعور اور تنقیدی نظر کی معیت میں استناد کی حدوں تک جا پہنچتا ہے۔ جو کہ نہ صرف خود مصنف بلکہ قاری کی ذات کے لئے بھی اعتبار اور معیار کا باعث بنتا ہے۔

اس حوالے سے مذہب و مسلک، حبِ علی، مینواری، یکساں نظریہ شعر، غزل گوئی و قصیدہ گوئی، فلسفہ، نظم، تصوف، جہازات اور بے باکی، حسن و عشق، طنز و مزاح وغیرہ وہ مماثلتیں ہیں۔ جنہیں محترم ناز سرحدی نے خوشحال و غالب کے موازنے کے دوران موضوع بحث بنایا ہے۔ ہر عنوان کے تحت جو تفصیلات اور تاویلات دی گئی ہیں انہیں معتبر حوالوں کے ذریعے مضبوط کرنے کی کافی بلکہ کامیاب سعی کی گئی ہے اور یوں نہ صرف خوشحال و غالب کا موازنہ پڑھنے کو ملتا ہے بلکہ ان تمام کتابوں تک قاری کی رسائی بیک وقت ہو جاتی ہے۔ جن کو اس موازنے کو مرتب کرتے وقت ٹٹولا اور پڑھا گیا ہے۔

میں محترم ناز سرحدی کو اس کامیاب تحقیقی منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے پر مبارکباد دیتا ہوں اور ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس اہم کتاب پر مجھے چند سطریں تحریر کرنے کی دعوت دی۔

ناز سرحدی اسکے بعد فارغ بیٹھنے والے نہیں۔ اس کے دو ایک اور اچھوتے

عنوان یعنی "The Political Thoughts of Khushal Khan Khattak" پر انگریزی میں کتاب لکھنے جارہے ہیں۔ اس کتاب کو مکمل کرنے کے سلسلے میں میری دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک

پشاور یونیورسٹی

حرف اول

میں ”موازنہ خوشحال و غالب“ کے موضوع پر قلم اٹھانے کی جرأت نہ کرتا اگر مجھے ان دونوں نابغہ ہستیوں کے شخصی حالات اور کلام پڑھنے کے بعد ان کی شخصیتوں، افکار اور فن میں ناقابل یقین حد تک ہم آہنگی نظر نہ آتی۔ گو کہ ان دونوں کی شخصیتوں اور فن کے کچھ گوشوں میں تفاوت بھی پایا جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی من حیث المجموع خوشحال و غالب ہماری دنیائے ادب کی تاریخ میں دوسرے شعراء و ادباء سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ یہی ان کا کمال ہے اور یہی ان کا مقام۔

خوشحال و غالب کی شخصیتوں اور فن کا مطالعہ کرنے کے بعد کسی شک و شبہ کے بغیر یہ احساس قوی تر ہوتا جاتا ہے کہ ان دونوں نادور ہستیوں کا موازنہ اردو اور پشتو ادب کے شیدائیوں کے لیے نہایت ہی مفید اور احسن قدم ثابت ہو سکتا ہے۔

میری خوش قسمتی رہی ہے کہ اردو میری قومی تو پشتو میری مادری زبان ہے۔ پھر یہ کہ شاعری کے ساتھ شغف رکھنے والے ایک قاری کی حیثیت سے مجھے اردو اور پشتو ادب کے مطالعہ کرنے کا موقع ملتا رہا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۶۹ء میں پاکستان ہائی کمیشن لندن (برطانیہ) میں

تعییناتی کے دوران میں نے برٹش میوزیم اور سٹیل سیکشن لائبریری کی رکنیت لے رکھی تھی۔ وہاں جو پہلی کتاب میں نے لائبریری میں بیٹھ کر پڑھنے کے لئے نکلوائی تھی وہ خوشحال بابا کے پوتے افضل خان خٹک کی کتاب ”تاریخ مرصع“ کا قلمی نسخہ تھا۔

ہمارے ان دونوں نادار الوقت شعراء کا مطالعہ کرنے پر کھلتا ہے کہ ان کے ادوار میں لگ بھگ دو صدیوں کے فاصلہ کے باوجود ان کی شخصیتوں اور فن میں باہمی موافقت کے ساتھ ساتھ جو تفاوت پایا جاتا ہے اسے قلمبند کر دینے سے اہل ادب حضرات کے لئے ایک مفید مطالعہ کا اہتمام کیا جاسکتا ہے۔ اسی جذبے کے تحت میں نے ۱۹۹۴ء میں اس موضوع پر کام شروع کیا ہے۔ تو تقریباً سترہ (۱۷) برس اس ضمن میں تحقیق کرنے پر اس خیال کو مزید تقویت ملتی گئی کہ موازنہ خوشحال وغالب پر قلم اٹھانا ایک مفید کام ہے۔ جسے مکمل کیا جانا چاہیے۔ یہ ایک ادبی ضرورت ہے تاکہ ہزاروں سال پرانی زبان پشتو اور نہبتانی زبان اردو میں ادا کئے گئے ان دونوں نامور شعراء کے خیالات و افکار ان کے انداز ہائے فن اور بڑی حد تک انکی شخصیتوں کے مطالعہ کے ذریعے نہ صرف اردو اور پشتو ادب کو ایک دوسرے کے نزدیک تر لانے کا اہتمام کیا جائے بلکہ ہماری قومی یک جہتی کو بھی مزید سنوارا جائے۔

ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو خوشحال خان خٹک کی عمر کا خاصا حصہ اپنے وطن کو مغل تسلط سے آزاد کرانے میں گزرا۔ جس سے خوشحال بابا کے جذبہ حریت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف غالب نے مغلیہ دور کے آخری لمحات میں ہندوستان پر

انگریزی تسلط کی ابتداء کو بظہر حیرت دیکھا۔ اس طرح ہمارے یہ ہر دو نابعد روزگار شعراء لگ بھگ دو ڈھائی سو سال پر محیط مغلیہ سلطنت کے ایک خاص دور کے دونوں سروں پر کھڑے نظر آتے ہیں۔

غالب نے زیادہ تر عشقیہ شاعری میں کمال حاصل کیا مگر اردو نثر پر ان کے مکاتیب نے ایک نہایت گہرا اثر چھوڑا ہے۔ انہوں نے فارسی میں شاعری کے علاوہ مغلیہ خاندان کی تاریخ (مہر نیم روز) اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے حالات (دہشتو) لکھنے کا کارنامہ بھی سرانجام دیا۔ ادھر خوشحال خان خٹک نے نہ صرف عشقیہ، فکری اور حماسی شاعری میں کمال دکھایا بلکہ مرد غیرت مند یعنی حکیمال اور باز کا تصور بھی دیا جسے بعد میں علامہ اقبال نے خودی مرد مومن اور شاہین کی صورت میں پیش کیا۔ امید ہے قارئین "موازنہ خوشحال و غالب" میں اس نکتے پر دی گئی تفصیلات سے بطور خاص محفوظ ہو گئے۔

پشتون نثر پر بھی خوشحال خان کا بڑا احسان رہا ہے کہ انہوں نے پشتو نثر میں "دستار نامہ" جیسی نادر کتاب تصنیف کی جسے اپنے مضمون (ایک سردار کو کن خصائل اور ہنروں کا حامل ہونا چاہیے) کے لحاظ سے افلاطون کی "جمہوریہ" امیر کیاوس کی "قابوس نامہ" اور نکولومیکیا ولی کی شہرہ آفاق کتاب "The prince" (شہزادہ) کے مقابل رکھ سکتے ہیں۔ دستار نامہ کی نثر خوشحال سے پہلے کی مسجع اور منقعی نثر کے مقابلے میں سادہ اور پشتو روزمرہ کے مطابق ہے۔

جناب خاطر غزنوی کے بقول "یوں اس کتاب کو پشتو نثر کے نئے دور کا حرف

آغا زکریا جاسکے ہے۔“ خوشحال بابا کا قاری کلام بھی موجود ہے۔

جہاں تک خوشحال و غالب کے موازنہ کا تعلق ہے تو جن چیدہ چیدہ خصائص کی وجہ سے یہ موازنہ ضروری سمجھا گیا ان میں یہ حقائق شامل ہیں کہ ہماری یہ دونوں نابعد روزگار ہستیاں مظہر دور میں ہو گزری ہیں۔ دونوں کا بچپن امیرانہ اور نوابانہ ماحول میں گزرا۔ دونوں نے چھوٹی عمر میں شاعری شروع کی۔ دونوں کو مغل دربار میں رسائی حاصل رہی۔ خوشحال بابا نے پشتو شاعری اور نثر کے پرانے باب کو ختم ہوتے دیکھا اور نئے باب کو شروع کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔ تو غالب نے اردو شاعری اور نثر کے پرانے باب کو ختم ہوتے دیکھا اور نئے باب کو شروع کیا۔ ان دونوں ہستیوں پر بڑھاپے میں ابتلاء کا دور آیا۔ دونوں نے ستر سال سے زیادہ کی عمر پائی۔ اور یہ کہ دونوں اپنے فکر و فن کی جدت کی بدولت اپنی اپنی زبان پر ثبت ہو گئے۔

اس کتاب کے مطالعہ کے دوران آپ دیکھیں گے کہ ان دونوں بین الاقوامی شہرت کے حامل شعراء کے کلام میں ہم آہنگی فکر بھی پائی جاتی ہے اور فکر مخالف بھی۔ اسکے ساتھ ساتھ آپ کے احساس میں کبھی ایک برتر نظر آئے گا اور کبھی دوسرا۔ گو کہ بیشتر مضامین کے آخر میں ان دونوں نابعد ہستیوں کی شخصیت، فن اور فکر پر ایک مختصر سا موازنہ پیش کیا گیا ہے۔ مگر میرے نزدیک خوشحال و غالب کا اصل موازنہ وہ ناثر ہے۔ جو قارئین کے اذہان میں اس کتاب کے ہر مضمون کے پڑھنے کے بعد خود بخود پیدا ہوتا چلا جائے گا۔ آپ جوں جوں اس کتاب کے مطالعہ میں آگے بڑھتے جائیں گے توں توں آپ کو اپنے اپنے دور

کے ان دونوں قد آور انسانوں کے فن اور شخصیت کے خدوخال صاف ہوتے نظر آئیں گے۔ اور یہی اس کتاب کا فضاء و مطمع نظر ہے۔

خوشحال و غالب ہمارے آسمانِ ادب کے درخشندہ ستارے ہیں۔ انہوں نے اپنی اپنی زبان کو آئیں نو دیا۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں اپنے اپنے ادب میں درجہ کمال پر فائز ہیں۔ دونوں اپنے متعلق یہ پیش گوئی کر گئے کہ ان کے بعد ان جیسا کوئی نہیں آئے گا۔

خوشحال

نہ بہ زما غندی بل ننگیالے راشی
نہ بہ زما غندی بل جنگیالے راشی
ختک خو پر پردہ بہ درست افغان کنہی
عجب کہ ہسی فرہنگیالے راشی
ترجمہ:- نہ ہی کوئی میری طرح ناموس پر کٹ مرنے والا آئے گا۔
نہ ہی (میرے بعد) کوئی مجھ جیسا جنگجو آئے گا۔
خنک کا کیا شمار ہے پوری افغان قوم میں
عجب کہ کوئی مجھ جیسا فیہم اور عقلمند آئے۔

غالب:-

در خورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

اس کتاب کو لکھنے کے لیے بے شمار کتابیں، ماہنامے، رسالے اور پیش قیمت مقالے میری نظر سے گزرے۔ جہاں مناسب سمجھا گیا وہاں ان تمام سے چیدہ چیدہ اقتباسات ”موازنہ خوشحال و غالب“ میں دے دیئے گئے ہیں۔ اور ان کتب، رسائل و مقالات کا ذکر ہر اقتباس کے ساتھ Reference کے طور پر کر دیا گیا ہے۔ اس لیے میں تمام متعلقہ مصنفین، مؤلفین، مقالہ نگاروں اور ناشرین کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ ان کے بیش قیمت خیالات سے ”موازنہ خوشحال و غالب“ کو از حد فائدہ پہنچا۔ اور اس کی اقدیت میں تاثرات قدر اضافہ ہوا۔

آخر میں اس کتاب کے مکمل ہونے پر میں اپنے رب ذوالجلال کا جس قدر شکر بجالاؤں کم ہے۔

تمہ ہی سے مانگنا میرا شعار ہو یا رب
ہمیش مجھ کو بچاتی رہے غنا تیری

ناز سرحدی

ناز سرحدی

۸ ہیرن گیٹ روڈ

ہمبرسٹون۔ لیسٹر (برطانیہ)

جون ۲۰۱۱ء

باب اول شخصیت

حیاتِ غالب

سنین کے آئینے میں

۱۷۹۷ء پیدائش، دسمبر مطابق ۸ رجب ۱۲۱۳ھ اسد اللہ خان عرف مرزا نوشہ ولد عبداللہ بیک بن میرزا قوکان بیک بمقام آگرہ۔

۱۸۰۲ء وفات عبداللہ بیک غالب اپنے چچا نصر اللہ بیک کی سرپرستی میں آئے۔

۱۸۰۳ء لاہور لک نے دہلی کو فتح کیا۔

۱۸۰۶ء غالب کے چچا مرزا نصر اللہ بیک کی وفات جنہوں نے غالب کو اپنا بیٹا بنا رکھا تھا۔

غالب اپنے نانا خواجہ غلام حسین کیدان دیکس آگرہ کی سرپرستی میں آئے۔

۱۸۰۶ء شاہ عالم کی وفات اور اکبر شاہ ثانی کی تخت نشینی۔

۱۸۰۷ء ایک روایت کے مطابق غالب نے شعر گوئی کا آغاز کیا۔

۱۸۰۹ء دوسری روایت کے مطابق اس سال سے شعر گوئی کا آغاز کیا اور رنگ بیدل کو

اپنایا۔

۱۸۱۰ء نواب الہی بخش خان معروف کی بیٹی اور نواب احمد بخش خان والہی فیروز پور جھر کہ

جاکیر دار لہارو کی بھتیجی امراؤ بیگم سے شادی ہوئی۔

۱۸۱۰ء نواب حسام الدین حیدر نے ان کا کلام میر تقی میر کے سامنے پیش کیا۔

۱۸۱۱ء عبدالصمد کی شاگردی۔

۱۸۱۳ء آگرے سے دہلی میں آمد اور قیام۔

۱۸۲۱ء اردو کلام کی تدوین بہ ترتیب ردیف (یہی دیوان غالب نسخہ بھوپال کی تاریخ کتابت ہے)

۱۸۲۲ء فارسی شاعری کا آغاز ۱۸۲۲ء تا ۱۸۵۰ء فارسی نظم و نثر

۱۸۲۵ء فارسی زبان میں پہلی نثری تصنیف رسالہ قواعد نیز پنج آہنگ تصنیف ہوئی۔

۱۸۲۶ء پنشن کی حصول کے لیے کلکتے کا سفر۔ مرزا الہی بخش معروف خسر غالب کی وفات۔

۱۸۲۶ء دہلی سے کلکتے کی طرف روانگی، انتخاب دیوان اردو۔

۱۸۲۷ء لکھنؤ کا سفر۔ لکھنؤ سے کانپور اور پھر پانڈرو۔

۱۸۲۸ء ورود کلکتہ، معرکہ حامیان قتل، دوبارہ انگریزی کا آغاز۔

۱۸۲۹ء دہلی میں مراجعت (۱۸۲۸ء - ۱۸۲۹ء انتخاب کلام فارسی و اردو۔ موسوم بہ ”گل

رعنا“ کی تدوین بفرمائش مولوی سراج الدین احمد)

۱۸۳۱ء پنشن کا دعویٰ جسے ولیم ٹینک نے خارج کیا۔

۱۸۳۲ء انتخاب کلام اردو دیوان مروج

۱۸۳۵ء فریزر کا قتل، نواب شمس الدین خان کو سزائے موت، کلیات فارسی ”میفانہ آرزو“

کے نام سے مرتب ہوا۔

۱۸۳۷ء کلیات غالب فارسی کی تدوین

۱۸۳۱ء دیوان غالب اردو کے پہلے ایڈیشن کی طباعت، مطبوعہ سید المطالع دہلی، قمار بازی کے الزام میں پہلی بار پڑس۔

۱۸۳۲ء دہلی کالج میں پروفیسری کی پیشکش اور غالب کا انکار۔

۱۸۳۵ء دیوان فارسی ”مختار آرزو“ کا پہلا ایڈیشن، مطبع دارالسلام دہلی سے شائع ہوا۔

۱۸۳۷ء دیوان غالب کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت، مطبع دارالسلام دہلی، قمار بازی کے الزام میں کوئٹال شہر فیض الحسن کے ہاتھوں گرفتار ہو کر تین ماہ تک قید میں رہے۔

۱۸۵۰ء بہادر شاہ سے نجم الدولہ ویر الملک نظام جنگ کا خطاب اور پچاس روپے ماہوار تنخواہ۔ تاریخ نویسی پر تقرر۔ ولی عہد شہزادہ فتح الملک کی استادی رینگنے گوئی کا دور ثانی۔

۱۸۵۱ء مرزا جواں بخت کی شادی اور غالب و ذوق کی کشیدگی۔

۱۸۵۲ء ”مہر نیمروز“ لکھی۔ وفات زین العابدین عارف

۱۸۵۳ء استاد شہ مقرر ہوئے۔ چار سو روپے سالانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔

۱۸۵۵ء مہر نیمروز کا پہلا حصہ شائع ہوا۔

۱۸۵۷ء جنگ آزادی، دیوان اردو ترتیب دیا اور اس کا ایک نسخہ رامپور بھیجا۔ دربار رام پور سے تعلق۔ وفات مرزا یوسف۔

۱۸۵۸ء دستخط کا پہلا ایڈیشن مطبع مفید الخلائق آگرہ

۱۸۵۹ء نواب رامپور نے سورہ پے ماہوار تنخواہ مقرر کی جو وفات تک ملتی رہی۔ سفر میرٹھ۔
۱۸۶۰ء نواب کی دعوت پر رام پور گئے۔ ترتیب کلام غالب بدست ناظر حسین مرزا قاطع
برہان لکھی۔

۱۸۶۱ء دیوان اردو کا تیسرا ایڈیشن 'مطبع احمد دہلی' مرزا صاحب درویش میں جٹلا ہوئے۔
ترتیب کلیات فارسی

۱۸۶۲ء دیوان اردو کا چوتھا ایڈیشن 'مطبع نظامی' کانپور

۱۸۶۳ء حکومت انگلیشیہ سے خلعت عطا ہوئی۔ "نگارستان سخن" مرتبہ ظہیر دہلوی میں
انتخاب کلام غالب کی طباعت (اس مجموعے میں ذوق، مومن اور غالب کے کلام کا انتخاب
تھا اور یہ مطبع مفید الخلاق آگرہ میں باہتمام منشی شیونرائن چھپا) کلیات فارسی کا دوسرا
ایڈیشن منشی نوکھر نے شائع کیا۔

۱۸۶۳ء مشکوی ابرگرہ باراکمل المطابع دہلی سے شائع ہوئی۔

۱۸۶۵ء نواب یوسف علی خان کے انتقال پر نواب کلب علی خان جانشین ہوئے۔ تو
غالب نے رام پور کا سفر کیا قاطع برہان نظر ثانی اور اضافوں کے بعد ویش کا دیبانی کے نام
سے شائع ہوئی۔ لطائف بھی اور سوالات عبدالکریم شائع ہوئی۔

۱۸۶۶ء آخری انتخاب کلام بفرمائش خلد آشیان نواب کلب علی خان دہلی رامپور۔

حواس باختگی کا اقرار

۱۸۶۷ء مولوی امین الدین پر ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ۔ "سہد چمن" کے نام سے

فارسی کلام مطبع محمدی، دہلی سے شائع ہوا۔ تیغ تیز شائع ہوئی۔ نکات و رقعات غالب شائع ہوئی۔ حسین علی خان منٹگی کی نواب احمد بخش خان کے حقیقی بھائی کی پوتی سے نسبت۔

۱۸۶۸ء عہد ہندی کا پہلا ایڈیشن مطبع مہبائی، میرٹھ کلیات نثر فارسی (بیچ آہنگ، دستبہ، مہر نمرود) فشی نو لکھنؤ نے پہلی مرتبہ مرزا غالب کی اجازت سے شائع کی۔ اولے قرض کے لئے والٹری رامپور سے اعانت کی درخواست۔

۱۸۶۹ء وفات غالب ۱۵ فروری مطابق ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ پیر کے دن ظہر کے وقت انکلام الدین اولیاء کے مزار کے قریب دفن ہوئے۔

حیاتِ خوشحال

سنین کے آئینے میں

۱۶۱۳ء۔ (جون مطابق ربیع الاول ۱۰۲۲ھ) خوشحال خان ولد شہباز خان بن بچئی خان بمقام سرائے اکوڑہ خٹک جہانگیر بادشاہ کے دور میں پیدا ہوئے۔

۱۶۲۶ء۔ خوشحال خان نے ۱۳ سال کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ یوسٹریوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔

۱۶۳۱ء۔ خوشحال خان کی پہلی شادی ۱۸ سال کی عمر میں ہوئی۔

۱۶۳۳ء۔ خوشحال خان نے ۲۰ سال کی عمر میں شعر گوئی کا آغاز کیا۔

۱۶۳۰ء۔ وفات شہباز خان، خوشحال خان کو اٹھائیس سال کی عمر میں باپ کی جگہ خٹک قبیلہ نے اپنا سردار مقرر کیا۔ عہد شاہجہان کے چودہویں سال فرمان شاہی کے ذریعے خوشحال خان کو اپنے قبیلے کا سردار مان لیا گیا۔

۱۶۳۱ء۔ خوشحال خان نے شہزادہ مراد بخش کے ہمراہ کانگڑہ کی مہم میں حصہ لیکر تاراگڑھ کے قلعہ پر کیا۔

۱۶۳۶ء۔ خوشحال خان نے شہزادہ مراد بخش کے ہمراہ پنج و بد بخش کی مہم میں حصہ لیا۔

۱۶۳۹ء۔ شاہ جہان بادشاہ قندھار کی مہم کے سلسلہ میں کابل پہنچا تو خوشحال خان نے کابل کا سفر کیا اور شاہی دربار میں حاضری دی
۱۶۵۸ء۔ اورنگزیب عالمگیر کی تخت نشینی۔

۱۶۶۳ء۔ گورنر کابل سید امیر خان خوانی کی تیار کردہ ایک سازش کے تحت خوشحال خان خٹک کو گرفتار کر کے پابہ سلاسل پشاور سے دلی لے جایا گیا۔ اور راتھستان میں جے پور کے نزدیک قلعہ رتھمبور میں قید کر دیا گیا۔ اُسوقت خوشحال خان کی عمر ۵۱ برس تھی۔ اپنا زیادہ تر کلام اور چند دوسری کتابیں خوشحال خان نے اسی قید میں تصنیف کیں۔

۱۶۶۹ء۔ پانچ سال کی قید اور نظر بندی کے بعد خوشحال خان کو رہا کر دیا گیا۔ وہ اکوڑہ خٹک پہنچا اور مغلوں کی مخالفت اختیار کی۔

۱۶۷۲ء۔ خوشحال خان نے پشتون سرداروں ایمل خان مہمند اور دریا خان افریدی کے ساتھ مغل صوبیدار محمد امین خان کے لشکر کے خلاف جنگ خیر میں تعاون کیا۔ اور پشتونوں کی اس فتح کو اپنے کلام میں بہت سراہا۔

۱۶۷۳ء۔ خوشحال خان نے قلعہ نوشہرہ پر حملہ کر کے مغلوں کو وہاں سے بھگایا اور انگریز عالمگیر کی بذات خود حسن ابدال میں آمد تا کہ سرحدی جنگوں کی کمان خود سنبھالے۔

۱۶۷۴ء۔ (۱) خوشحال خان نے پشتونوں کو مغلوں کے خلاف متحد کرنے کے لیے سوات کا سفر کیا۔ جسکے دوران ”سوات نامہ“ کے عنوان سے اپنا شعری سفر نامہ بھی ترتیب دیا۔ ۱۶۷۹ء

(۲) خوشحال خان اپنی زندگی کے آخری چند سال اپنے بیٹے بہرام اور اسکے امدادی مغلوں کے ساتھ برسرِ پیکار رہنے کے بعد آفریدیوں کے ہاں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔

۱۶۸۹ء۔ خوشحال خان ۷۶ برس کی عمر میں اپنے گھر سے دور آفریدیوں کے علاقہ میں وفات پا گئے۔ انہیں انگی دھیت کے مطابق اکوڑہ خشک کے جنوب میں چند میل کے فاصلے پر ایسوی بالانامی گاؤں کے متصل پہاڑیوں کے دامن میں سپردِ خاک کیا گیا۔

خورشمال اور غالب کی ولادت اور بچپن

”مغل شہنشاہ نورالدین جہانگیر کے عہد حکومت میں ربیع الثانی ۱۰۲۲ھ (مطابق مئی - جون ۱۶۱۳ء) میں شہباز خان کے ہاں ایک فرزند پیدا ہوا۔ جس کی قسمت میں نہ صرف افغانوں کی تاریخ کے ایک خاص دور میں ان کا قومی شاعر و مفکر اور ان کا فوجی و سیاسی قائد ہونا لکھا تھا بلکہ جسے اس کے فن اور علمی و ادبی آثار کی جامعیت و عمومیت کی وجہ سے (جوں جوں وہ سمجھا اور جانا جائے گا) ہر جگہ ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ جو شہرت و ناموری کے اس بلند مقام تک پہنچا جہاں معدودے چند افغانوں کو رسائی حاصل ہوئی۔ جس کا یوم ولادت افغانوں کی تاریخ میں آپ زور سے لکھا جائے گا۔ اس بچے کا نام خورشمال خان رکھا گیا۔ ”خیر عالمیانی“ ۱۰۲۲ھ اس کا مادہ تاریخ ولادت ہے“

(دوست محمد کامل، ”خورشمال خان خلک“)

”مرزا غالب کے دادا محمد شاہ کے زمانے میں سر قند سے ہندوستان

آئے اور لاہور میں معین الملک کی ملازمت اختیار کی۔ لاہور سے وہ
 دلہی گئے اور وہاں ذوالفقار الدولہ مرزا نجف کی سرکار میں انہیں ایک
 معقول ملازمت مل گئی اور پچاسو کا پرگنہ بطور جاگیر کے عطا ہوا۔ انہی
 کی اولاد میں مرزا غالب کے والد مرزا عبداللہ بیگ خان عرف مرزا
 دولہا تھے۔ مرزا عبداللہ بیگ خان کی شادی خواجہ غلام حسین خان
 کیدان کی بیٹی سے ہوئی اور ان کے دو بیٹے ہوئے ایک تو مرزا
 اسد اللہ خان غالب جنہوں نے فارسی اور اردو نظم و نثر میں نام پیدا کیا
 اور دوسرے مرزا یوسف خان۔۔۔۔۔ اسد اللہ بیگ خان عرف مرزا
 نوشہ، اسد اور غالب جنھیں 'قوم ترک' ۸ رجب ۱۲۱۲ھ (۲۷ دسمبر
 ۱۷۹۷ء) بہ مقام آگرہ پیدا ہوئے۔ انہوں نے جس خاندان میں
 آگے کھولی وہ ایک ترکوں کا مشہور خاندان تھا۔ (مرزا غالب نے
 اپنے آپ کو سلجوقی و افراسیابی و پشتلی کہا ہے)۔

(پروفیسر حمید اللہ شاہ ہاشمی۔ احوال و نقد غالب)

جہاں خوشحال نے ۱۳ برس کی عمر میں یونیورسٹیوں کے خلاف اپنی پہلی جنگ لڑی
 ۱۸ سال کی عمر میں پہلی شادی ہوئی۔ ۲۰ سال کی عمر میں شاعری شروع کی اور ۲۸ سال کی عمر
 میں انہیں اپنے باپ کی وفات پر تنگ قبیلہ کا سردار بنایا گیا۔ وہاں غالب ۵ سال کی عمر میں
 جیم ہو گئے ۱۲ سال کی عمر میں شاعری شروع کی اور ۱۳ برس کی عمر میں انکی شادی ہو گئی جس

کے بعد وہ آگرہ سے دہلی آئے۔

تعلیم و تربیت کے سلسلے میں خوشحال نے زیادہ دھیان شکار کو دیا اور کم مدرسے کو۔ کم و بیش یہی حال غالب کا بھی تھا۔ انہوں نے زیادہ دھیان عیش و عشرت کو دیا اور کم مدرسے کو۔ مگر ان کی تعلیم کسی قدر باقاعدگی کے ساتھ ہوئی۔ کیا عجیب اتفاق ہے کہ جناب صلاح الدین ندیم نے غالب کے مکتب کے ماحول اور انکے کھلنڈرے پن کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ بطور عمومی خوشحال کے بچپن کے بھی حسب حال ہے۔ آئیے دیکھیے :-

”مکتب کی روایتی اور تنگ فضا میں ٹھٹھن محسوس کرنے والا بچہ جب اس فضا کو قبول نہیں کرتا اور درسی کتب کی طرف توجہ نہیں کرتا اور بیشتر وقت کھیل کود میں صرف کرتا ہے اور مکتب سے باہر کی کھلی فضا کا محتلاشی رہتا ہے۔ تو بڑے بوزھوں کی نگاہ میں وہ اپنی زندگی خراب کرتا ہے۔ حالانکہ گریز پائی کا یہ انداز کسی اور حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ بزرگوں کی عمر بھر کا تجربہ ان کے اپنے زمانے کا تجربہ ہوتا ہے۔ اور اس تجربے کی حدود اس قدر وسیع نہیں ہوتیں کہ نئی نسل کے تقاضوں کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیں اور وسعت طلبی کے خمیر سے تخلیق پانے والے بچے کی اتنا اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہوتی۔ وہ بھانپ لیتی ہے کہ اس کی پرورش اور نمو کے لیے کون سا زمانہ مناسب ہے اور اس سلسلے میں نو خیز نگاہ کا تجسس اس کی رہنمائی کرتا

ہے۔ بچے کا تجسس خالص اور کھرا ہوتا ہے۔ اس کی کوئی جہت متعین نہیں ہوتی۔ وہ اپنی ذات کی تنگ پگھاؤں کو چکانے کے لیے اسے زمانے کے چڑھتے ہوئے تازہ اور نئے سورج سے توانا کر نہیں فراہم کرتا ہے اور پھر یہاں قیام نہیں کرتا۔ باہر نکل کر اپنے ارد گرد کو محسوس کرتا ہے اور اس کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور یہاں بھی نہیں ٹھہرتا اور کائنات کی لامحدود وسعتوں کو اپنی نگاہ میں سمیٹ لینا چاہتا ہے۔۔۔۔۔ غالب کی شخصیت بھی کچھ اسی قسم کے کھلنڈرے بچے کی اتا کی طرح ہے۔

(صلاح الدین ندیم۔۔۔ غالب کا ذوق تجسس)

ایک اور اتفاق یہ بھی ہوا کہ خوشحال کے والد شہباز خان اور غالب کے والد عبداللہ بیگ خان دونوں میدان جنگ میں بہادری سے لڑتے ہوئے مارے گئے تھے۔ اس سے آگے ان دونوں یعنی خوشحال و غالب کی نابہ شخصیتیں اپنی اپنی علیحدہ ڈگر پر مختلف حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے جا نکلتی ہیں۔

خوشحال و غالب شخصیت

خوشحال و غالب دونوں روزگار شخصیتیں گذری ہیں۔ انہوں نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیے وہ ان کی شخصیتوں کے زیر اثر تھا۔ تو چاہئے کہ ہم ان دونوں کی شخصیتوں کے تمام تر پہلوؤں پر نظر ڈالیں اور جانیں کہ یہ دونوں شخصیتیں برصغیر کے شعرو ادب کی تاریخ پر کیسے اور کیونکر ثبت ہوئیں۔

خوشحال کی شخصیت

”اتوا میں کی تاریخ میں ہر زمانے کا ایک مخصوص دورانیہ انقلاب کا تقاضہ کرتا ہے۔ اس تقاضے یا وقت کی پکار کو پورا کرنے کے لیے فطرت ایک انسان کا انتخاب کرتی ہے۔ اس منتخب انسان کو قدرت بڑی فیاضی سے اوصاف، سوچ اور کمال بخشی ہے۔ تاکہ وہ حالات کو بدلنے اور زمانے

کارخ دوسری طرف موڑنے پر قادر ہو جائے۔ ایسے لوگ اپنے دور کے تابع کہلاتے ہیں۔ کہیں ایک فنکار پیدا ہو جاتا ہے تاکہ حسن کی حقیقت و عایت کی تلاش میں دوسروں کی راہنمائی کرے۔ کوئی جرنیل پیدا ہوتا ہے کہ حق کا بول بالا کرنے اور انقلاب برپا کرنے کا داعی بنے۔ فلسفی اور حکیم پیدا ہوتا ہے کہ غور و فکر کی راہ راست کی نشاندہی کرے اور ذرات و موجودات کے اس بڑے کارخانے اور کائنات زیت کے چھپے رازوں سے پردہ اٹھائے۔۔۔۔ اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ علوم و فنون کی تمام خصوصیتیں ایک ہی شخصیت میں سرعکز ہو جاتی ہیں۔ قدرت اپنے جلال و جمال اور کمال کا اظہار ایک ایسے انسان کی پیدائش کی صورت میں کرتی ہے۔۔۔ ایسی ہی ایک شخصیت عظیم خوشحال خٹک کی ہے کہ دنیا کے نادر اور نایاب انسانوں میں ایک خاص امتیازی مقام رکھتا ہے۔

ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک: ”خوشحال خان خٹک“

سہ ماہی پشتو، جون۔ اگست ۲۰۰۱ء

قدرت کا احسان کہ اس نے خوشحال جیسے انسان کو پشتون قوم میں پیدا کیا۔ مگر خوشحال کی پہلو دار شخصیت کے پیش نظر ان پر قلم اٹھانا مشکل سے دوچار کر دیتا ہے۔ کہ کہاں سے شروع کیا جائے اور کیسے۔ مشہور ماہر خوشحالیات پروفیسر پریشان خٹک کو بھی یہی مشکل

درخش آئی:-

”خوشحال خان خٹک اگر نر شاعر ہوتا تو اس پر بات کرنے میں اتنی دشواری پیش نہ آتی۔ مگر جو شخص بیک وقت شاعر، ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نہایت ہی بہادر سپاہی، تجربہ کار جرنیل، فیلسوف، حکیم، ماہر فلکیات، ماہر النساب، تاریخ دان، سیاست دان، جغرافیہ دان، معلم اخلاق، شکاری اور اعلیٰ درجے کا شہسوار ہونے کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہو تو اس پر کچھ کہنے یا لکھتے وقت دشواری یہ پیش آتی ہے کہ بات کہاں سے شروع کی جائے اور کہاں پر ختم کی جائے“

(پروفیسر پریشان خٹک۔ ”خوشحال خان خٹک“ از خوشحال نامہ ص ۳۵)

اگر تاریخی تناظر میں دیکھنا ہو تو بات خوشحال کے پردادا ملک اکوڑے سے شروع کی جانی چاہیے کہ اس نے اپنے رشتہ داروں سے ناراض ہو کر کوہاٹ میں اپنا علاقہ کر بوندھ (ٹہری) چھوڑا اور درہ سوئیالہ میں آ مقیم ہوا۔ بعد میں شہنشاہ اکبر کو جب ایک سے پشاور جانے والی شاہراہ کی حفاظت کا خیال آیا تو اسکی نظر انتخاب ملک اکوڑے پر پڑی اور بادشاہ نے اسے بلا بھیجا۔ اس کی قدر افزائی کی اور اس شاهی سزک کی حفاظت کا کام اسے سونپ دیا اور خیر آباد سے نوشہرہ تک کا علاقہ اسے بطور جاگیر عطا کیا۔ یوں ملک اکوڑے مغل شہنشاہ کی ملازمت میں آ گیا۔ اس نے موقع کی مناسبت سے خیر آباد اور نوشہرہ کے درمیان شاهی سزک کے کنارے اپنا الگ گاؤں سرائے کے نام سے آباد کیا جو آجکل ملک اکوڑے کے

نام کی مناسبت سے سرائے اکوڑہ ٹٹک کہلاتا ہے۔ ٹٹک اکوڑے کا جانشین اس کا بیٹا بھٹی خان ہوا۔ اور جب بھٹی خان بولاق ٹٹکوں کے خلاف لڑتے ہوئے مارا گیا تو اسکے بیٹے شہباز خان نے اپنے باپ کی جگہ سنبھالی۔ یہی شہباز خان خوشحال کا باپ تھا۔ لیکن شہباز خان یوسٹریوں کے خلاف ایک معرکہ میں لڑتے ہوئے مارا گیا۔ اور آخر کار اپنے قبیلے ٹٹک کی سرداری کا بوجھ خوشحال کے کندھوں پر آ پڑا۔ اُس وقت خوشحال کی عمر ۲۸ برس تھی۔

جب خوشحال سردار بنا۔ تو سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے یوسٹری علاقہ پر چڑھ دوڑا اور اپنے دشمنوں کو شکست سے دوچار کیا۔ اُن دنوں مغل بادشاہ شاہجہان کا دور حکومت تھا۔ اگلے سال خوشحال خان نے شہزادہ مراد بخش کے ہمراہ بلخ، بدخشان اور کابل (تاراگزہ) کی مہمات سرکیں۔ جس کے عوض شاہجہان نے خوش ہو کر لاہور کے مقام پر اُسے چار لاکھ روپیہ نقد انعام اور اڑھائی لاکھ روپے کی جاگیر عطا کی اور ساتھ ہی خوشحال کو خدمت شاہی کے لئے پانچ سو سوار اور ایک ہزار پیدل فوج تیار رکھنے کا حکم بھی دیا۔

۱۶۳۹ء میں شاہجہان قدہار کی مہم کے سلسلہ میں کابل پہنچا تو خوشحال خان نے کابل کا سفر کیا اور شاہی دربار میں حاضری دی شاہجہان کی مہربانیوں کے پیش نظر خوشحال نے اپنے کلام میں شاہجہان کو قدردان کہہ کر یاد کیا ہے۔ مگر شاہجہان کی نظر بندی کے بعد جب اورنگزیب نے عمان حکومت سنبھالی تو بادشاہ کے عمال اور خوشحال کے درمیان کسی غلط فہمی کی وجہ سے خوشحال کو ۱۶۶۳ء میں جبکہ اُس کی عمر ۵۵ برس تھی۔ اور وہ تقریباً تیس سال

تک نہایت وفاداری کے ساتھ مظلوم کی ملازمت کرتا رہا تھا۔ گورنر کاٹل سید امیر خوانی کی تیار کردہ ایک سازش کے تحت پٹا اور بلوا کر گرفتار کر لیا گیا اور پابہ سلاسل دہلی لے جایا گیا۔ اسکے بعد اسے راجستان میں جے پور کے نزدیک رتھمبور کے قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ خوشحال نے اپنی کلیات کا بیشتر حصہ فراق نامہ اور دستار نامہ اسی قید کے دوران لکھے۔ اور اسی قید کے دوران خوشحال نے اورنگزیب کے خلاف متحدہ قصیدے بھی لکھے۔ اپنے وطن کی یاد اور ہند سے نفرت کے بارے میں بھی اسی قید کے دوران اپنے یادگار قصیدے اور غزلیں لکھیں۔ خوشحال کو کم و بیش پانچ سال کی قید اور نظر بندی کے بعد اپنے وطن واپس آنا نصیب ہوا۔ اب وہ ایک بدلا ہوا خوشحال تھا۔ اسے اپنی بے گناہی کا یقین اور قید کی وجہ سے ذلت پر بے انتہا صدمہ تھا اس نے قبیلے کی سرداری اپنے بیٹے اشرف خان کے حوالے کی اور خود مغل حکومت کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کرتے ہوئے واضحکاف الفاظ میں اعلان کر دیا:-

د افغان پہ ننگ مہی او تر لہ تورہ

ننگیالے د زمانہ خوشحال ختک یم

ترجمہ:- میں نے افغانوں کے نام کی خاطر (اپنی کمرے) تلواریں باندھی ہے۔ میں زمانے بھر کا غیرت مند خوشحال ختک ہوں۔

سراولف کیرو نے اپنی کتاب ”دی پوینز آف خوشحال خان ختک“ کے شروع ہی میں تعارف کے طور پر یہی شعر نقل کیا ہے۔

"My Sword I girt upon my thigh To guard our nations ancient
fame,
its champion in the age am I , The khattak khan, Khushhal my
name,

یاد رہے خوشحال کی لوح قبر پر اس کا اپنا یہ شعر آج بھی کندہ ہے۔

اب خوشحال کی زندگی کے دو بڑے مقاصد رہ گئے تھے۔ پشتونوں کا اتحاد اور
اورنگزیب کی مخالفت۔ یوں دیکھا جائے تو یہ ہر دو مقاصد ایک دوسرے میں پیوست تھے۔
پشتونوں کے اتحاد کے بل بوتے پر خوشحال مغل بادشاہ اورنگزیب کی مخالفت میں کامیاب
ہو سکتا تھا۔ ایک موقع پر خوشحال نے اتحاد کی برکت کو اجاگر کرنے کے لیے یہ اشعار کہے:-

چپی مغل وتہ می وت رہ تورہ

درست پښتون می و عالم وتہ بنسکاره کړ

اتفاق به پښتنو کښي پيدا نه شو

گڼي ما به د مغل گريوان پاره کړ

ترجمہ:- جب میں نے مغلوں کے خلاف تلوار اٹھائی

تو تمام پشتون قوم کو دنیا میں نمایاں کر دیا

(مگر) پشتونوں میں اتحاد پیدا نہ ہو سکا

ورنہ میں مغلوں کے گریبان پارہ پارہ کر دیتا

پشتونوں کے اتحاد کی خاطر خوشحال تمام پشتون قبائل کے پاس گئے اور انہیں متحد کرنے کی کوشش کی۔ چند ایک قبائل یعنی مہمند، آفریدی اور شنواری تو خوشحال سے آٹے لیکن پشتونوں کے سب سے بڑے قبیلے پوسٹوئی نے خوشحال کا ساتھ نہ دیا۔ حالانکہ ان کے ساتھ اتحاد کی خاطر خوشحال نامساعد حالات میں پوسٹویوں کے گڑھ سوات پہ نفس نہیں گئے تھے۔ سفر سوات کا جو فائدہ ہوا وہ خوشحال کی کتاب سوات نامہ کی شکل میں سامنے آیا یعنی اتنے مشکل حالات میں بھی خوشحال نے لکھنے لکھانے کا کام جاری رکھا۔ سوات نامہ میں سوات کی تاریخ، وہاں کے لوگوں اور وہاں کے جغرافیے سے متعلق باتیں درج ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہوئی کہ سوات نامہ خوشحال کی وہ کتاب ہے جسے پشتو میں پہلے سفر نامے کا درجہ بھی حاصل ہوا۔ اسی سفر کے دوران خوشحال اور اخون درویش کے مرید خاص شیخ میاں نور کے درمیان اخون درویش کی کتاب مخزن اسلام کے بارے میں مناظرہ بھی ہوا۔ جس میں خوشحال نے مخزن کی خامیاں منظر عام پر لائیں۔ جو پشتون قبائل خوشحال سے آٹے تھے۔ ان کی مدد سے خوشحال نے مغلیہ افواج کو چھ مقامات پر شکست سے دوچار کیا۔ ان جنگوں میں مغلیہ سلطنت کے ہزاروں فوجی اور چند نامور جرنیل بھی مارے گئے۔ ادھر اورنگزیب نے خوشحال کی کامیابیوں کو روکنے کے لیے دو کام کئے۔ پشتون قبائل میں اپنی دولت ایسی پھیلانی کہ اکثر قبائل زر کی خاطر مغلیہ سلطنت کی وفاداری کا دم بھرنے لگے۔ دوسرا کام اورنگزیب نے یہ کیا کہ خوشحال کے بیٹے بہرام کو خوشحال کی جگہ سردار مان لیا۔ اور خٹک قبیلے کے دوسرے سرکردہ افراد کو بھی انعامات سے نوازا۔ بہرام کو یہ مشن دیا گیا کہ وہ

اپنے باپ کو زندہ گرفتار کرے۔ کہتے ہیں کہ اس کے نتیجے میں خوشحال خان اپنا علاقہ چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ اور ہر وقت گھوڑے کی پیٹھ پر سوار رہنے لگے۔ وہ کسی ایک مقام پر زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ آخر کار انہوں نے افریدیوں کے پاس پناہ لی۔ اور کچھ عرصہ بعد ۱۶۸۹ء میں ایشتر ۷۸ سال کی عمر میں جلاوطنی کے دوران وفات پائی۔ وفات سے پہلے خوشحال بابا وصیت کر گئے تھے۔ کہ انہیں ایسی جگہ دفن دیا جائے جہاں وہ مغلوں کے گھوڑوں کی ناپوں سے آٹھنے والی گرد سے محفوظ رہیں۔ علامہ اقبال نے اس وصیت کو بال جبریل میں یوں جگہ دی ہے۔

قبائل ہوں ملت کی وحدت میں گم کہ ہو نام افغانوں کا بلند
محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کند
مغل سے کسی طرح کتر نہیں کہستان کا یہ بچہ : ارجمند
کہوں تجھ سے اے ہمنشیں دل کی بات

وہ مدفن ہے خوشحال خان کو پسند
اڑا کر نہ لائے جہاں باد کوہ
مغل شہسواروں کی گرد سمند

جیسا کہ خوشحال کے حالات زندگی سے ظاہر ہے وہ ایک آزاد طبیعت انسان تھے۔ شکار کھیلنا، حرب و ضرب کو عزیز رکھنا قلم سے محبت رکھنا، پشتون قوم کو متحدہ اور آزاد دیکھنے کی بے حد خواہش، جمہوریت پسند، تنگ اور غیرت پر مرثیے والے باہمت انسان جو ایک رنگین مزاج

اور رومانی شاعر بھی تھے۔ جن کے اشعار کی تعداد چالیس ہزار کے قریب بتائی جاتی ہے۔
 نثر اس کے علاوہ ہے۔ جو بہار کے موسم میں اپنی بیاض بغل میں دبائے سیر چمن کو نکلتے
 تھے۔ ساتھ میں ان کی حماسی شاعری کا بھی جواب نہیں۔ انہوں نے نہ صرف مرد اور نیکمال
 کا تصور پیش کیا بلکہ باز کا ایسا تصور دیا کہ علامہ اقبال نے اس سے استفادہ کرتے ہوئے
 شاپن کا تصور اپنایا۔ جس کی شاعری میں علامہ اقبال اور ڈاکٹر سید عبداللہ کے مطابق شعر
 عرب کی جھلک نظر آتی ہے۔ اور سراپوں ہاؤل کے مطابق جس کے اشعار کی بحور انگریزی
 شاعری کے قریب ہیں۔ خوشحال علم طب میں بھی طاق تھے۔ انکی کتاب طب نامہ اسی
 حقیقت کی غماز ہے خوشحال نے اگر ایک طرف افریدی حسین دوشیزاؤں کے متعلق ایک
 دلکش انداز میں لکھا اور پشتون عورت کو جینن و خطا کی خوبصورت حسیناؤں سے زیادہ
 خوبصورت جانا تو دوسری طرف قید رنجموہر کی یادگار کے طور پر ہندی حسیناؤں کی بھی
 تعریف کی اور انکے گن گائے ہیں۔

اپنے وطن کے خشک پتھروں کو سونے سے زیادہ عزیز رکھنے والے خوشحال کو گنگا جنا
 کے پانی سے زیادہ دریائے لنڈا (دریائے کاٹل) کے پانی کی یاد ہند میں قید کے دوران
 ستاتی رہی۔ مذہبی لحاظ سے ایک کڑی مسلمان جسے لہو و لہب سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔
 لیکن اگر آپ ان کی مے اور مے پرستی سے متعلق غزلیں پڑھیں تو ان سے زیادہ مے
 پرست آپ کو شاید کہ ملے۔ صوفیانہ شاعری اس کے علاوہ ہے۔ وہ اخلاقیات کے معلم کے
 طور پر بھی جانے جاتے ہیں

خوشحال کے اخلاق و عادات پر بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ لیکن خوشحالیات کے باہر میاں سید رسول رسا نے ان کے اخلاق و عادات کے متعلق بڑا مربوط تبصرہ کیا ہے۔

”خوشحال خان اونچے اخلاق کے پشتون سردار تھے۔ مہمان نواز، مروت اور سخاوت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ دوسروں کی مالی مدد کرنے کے لیے مشہور تھے۔ اور اسوقت کے پشتون خوانین کی طرح شکار کے دلدادہ تھے۔ باز کے ذریعے شکار کے لیے خاص رغبت رکھتے تھے۔ گھوڑے باز اور شکاری کتے انکو بہت پسند تھے۔ اور باز تو بڑے شوق سے پالتے تھے۔۔۔۔ باز کا شکار خوشحال خان کی شاعری پر بہت اثر انداز ہوا۔ انکی شاعری میں شکاری پرندوں یعنی شاہین اور عقاب کا بہت زیادہ ذکر ملتا ہے“

سید رسول رسا آگے چل کر یوں رقمطراز ہیں:

”خوشحال خان پیدائشی شاعر تھے عاشق مزاج اور حسن پرست تھے لیکن عیاش اور اوباش نہیں تھے۔ خود فرماتے ہیں نہ تو میں خراباتی ہوں نہ قمار باز ہوں اور نہ ہی زنا کار ہوں“ اور خوشحال جب یہ کچھ کہتے ہیں تو صحیح کہتے ہیں ان میں کسی قسم کی بد عادت نہیں پائی جاتی تھی۔ البتہ ان کا جنسی ہیجان بہت تھا لیکن اس قسم کے خواہشات کی تکمیل کے لیے کوئی ناجائز اور حرام طریقہ انہوں نے نہیں اپنایا

اور اپنے آپ کو دوسری عورتوں سے بچاتے ہوئے انہوں نے ایک سے زیادہ شادیاں کی تھیں۔ اپنے جنسی تجربات اور مشاہدات کا ذکر کلیات میں بے باکی کے ساتھ کیا ہے۔ یہ انکی صاف گوئی اور حق گوئی پر دلالت کرتا ہے۔۔۔۔۔ باتوں سے سنجیدگی چپکتی تھی مگر ظرافت سے بھی کام لیتے تھے۔۔۔۔۔ خوشحال خان کے اخلاق و عادات کا رٹا مٹوں اور تصانیف کے مطالعے کے بعد گمان ہوتا ہے کہ روہ کے پہاڑوں کے یہ سفید شہباز بشر نہیں بلکہ فوق البشر تھے“

(میاں سید رسول رسا، مقدمہ ارمغان خوشحال“)

، خوشحال خان خلک کی زندگی بڑی پر آشوب اور ہنگامہ خیز تھی انہوں نے کبھی بھی معمولی اور حقیر کاموں میں وقت ضائع نہیں کیا۔ وہ حق گوئی اور بے باکی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ اور ان کی تلواریں جو چمک اور تیزی تھی ان کی شاعری میں اس سے بڑھ کر قوت اور زور تھا۔ انہوں نے اپنے زمانے میں اگر مغلیہ خاندان کے لئے اپنا خون پسینہ ایک کیا اور ان کی سلطنت کو استحکام بخشنے میں ان کا مدد ہوا تو دوسری جانب جب انہوں نے مغلیہ خانوادوں کی غلط پالیسیوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تو آخر دم تک اپنی بات پر ڈٹے رہے“

(فہم دل رانی، دیدہ و خوشحال“ از خوشحال نامہ)

خوشحال خان خٹک ایشیا کا عظیم ترین باغی تھا۔ جس نے دنیاوی عظمت کو ٹھکرا کر آزادی کا علم بلند کیا۔ جب تک روئے زمین پر ایک بھی حریت پسند باقی ہے صوبہ سرحد کے اس بطل جلیل کا نام اس وقت تک صفحہ ہستی سے مٹ نہیں سکتا۔ اس کے باغیانہ اشعار کی بازگشت رہتی دنیا تک درباب فکر و نظر کے دل میں گونجتی رہے گی:

”آزادی کا مقام بادشاہی سے بلند ہے جب انسان کسی کا محکوم ہوتا ہے تو وہ قیدی ہوتا ہے۔“

(ایوب سابرؒ از خوشحال نامہ)

جب ہم اخلاقیات کا ذکر کرتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ خوشحال خود ایک بااخلاق شخصیت کے مالک تھے بلکہ انکے کلام میں جا بجا اخلاقیات پر اشعار ملتے ہیں۔

چی زرہ لہ تانہ د چا بنہ کیہی

بنہ کرہ دعا گتہ دعا قبلہ پی

ترجمہ: اگر تیری وجہ سے کسی کا دل خوش ہوتا ہے۔ تو تو بھلائی کر دے گا میں لے کر دعا قبول ہوتی ہے۔

آزار د ہیچاد اخستونہ دے

بنیرے د خوبو زرو نو لگیہی

ترجمہ:- بدعا کسی کی بھی نہیں لینی چاہئے، کیونکہ وہی دلوں کی بددعا لگتی ہے۔

کہ دی زرہ دے چھ بد نہ مومے لہ چانہ
 اول تہ پری پدہ دبدو خصلتونہ
 ترجمہ:- اگر تو چاہتا ہے کہ کوئی تمہارے ساتھ بدی نہ کرے تو پہلے اپنی بُری خصلتوں کو چھوڑ
 دے۔

خوشحال کے کلام کا مطالعہ انہیں ایک فلسفی اور مفکر کے طور پر بھی متعارف کرتا ہے۔ اسلئے یہ
 نہ سمجھا جائے کہ وہ ایک پہاڑی قبیلے کے فرد ہونے کے ناطے ایک محدود سوچ رکھنے والے
 انسان تھے۔ بلکہ بدخشان، کامل، سوات، انک، لاہور، دہلی، آگرہ، تاراگڑھ اور رنجنپور انکے
 دیکھے بھالے مقامات میں سے ہیں۔ بلکہ بلخ و بدخشان اور تاراگڑھ میں تو انہوں نے مغلیہ
 سلطنت کے ایک سردار کی حیثیت سے جنگی معرکوں میں حصہ لیا۔ اپنے کلام میں دوسرے
 مقامات کے علاوہ دہلی اور لاہور کا ذکر کیا ہے۔ دہلی شہر کی تعریف اور اس میں گزرنے
 والے پشتون اور مغل بادشاہوں کی تاریخ ایک طویل قصیدے کا شکل میں لکھی ہے۔
 پنجاب کی رومانی داستان ہیر رانجھا اور شور کوٹ کا ذکر انکے کلام میں ملتا ہے۔ صلح کل کے
 داعی تھے۔ اپنی ایک غزل میں اپنے وقت کی مروج اردو کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ پشتو
 کے علاوہ وہ فارسی کے بھی ایک اچھے شاعر تھے۔ انکی خوبیاں کہاں تک گنتوائی جائیں۔ بس
 سمجھیے کہ اکوڑہ کے پاس ایسوزی کی پہاڑی کے دامن میں اپنے مزار میں آسودہ آرام یہ
 ہستی خوشحال خان خٹک ہم سب کے ہیرو تھے۔ کیونکہ جس علاقہ کو وہ مغلیہ سلطنت کے پنجہ
 سے (جسے وہ غیر ملکی طاقت سمجھتے تھے) آزاد کرانے کا عزم رکھتے تھے۔ وہ قندھار سے لیکر

ایک تک کا علاقہ ہے جس کا بیشتر حصہ آج آزاد پاکستان میں شامل ہے۔ یوں خوشحال پاکستان کے شاعر کے طور پر جانے جائیگے۔ خوشحال کے مندرجہ اوصاف کو اجاگر کرنے کے لیے انکے چیدہ چیدہ اشعار پیش خدمت ہیں:-

یو د بنکار بل د کتاب بل د دلبرو

پہ جہان کنہی نورِ نہ شوے دا درِ مینہی

ترجمہ:- ”شکار“ کتاب اور حسینوں سے پیار ان تینوں کے علاوہ دنیا میں اور کوئی پیار نہیں۔“

پہ خان او پہ جہان کنہی ما دوہ خیزہ دی وکنہلی

پہ خان کنہی دواہ سترگہی پہ جہان کنہی وارہ کنہلی

ترجمہ:- اپنی ذات میں اور باقی ساری دنیا میں میں نے دو چیزیں انتخاب کی ہیں۔ اپنی ذات میں دونوں آنکھیں اور دنیا میں سارے حسین۔

د خوشحال خٹک خوشی بہ ہفہ وخت شی

چی برہنہا د سپینو تورو شی پہ زغرو

ترجمہ:- خوشحال خٹک کی خوشی تو اسوت ہوتی ہے۔ جب چمکتی ہوئی کمواریں زرہ سے ٹکرا کر روشنی پیدا کریں۔

بلہ ہیخ لیدلہ نہ شی پہ دا مہنخ کنہی

یا مغل د مہنخہ ورگ یا پہنتون خوار

ترجمہ:- کوئی درمیانی راستہ نظر نہیں آتا۔ یا مثل بیچ میں سے دفع ہو جائیگے یا پشتونوں کو خوار ہونا پڑے گا۔

کہ یہی موسیٰ اور ہرے ژمے گبینہ خورہ

خو بہ سود یہی خبر مہ کرہ خیل پلار

ترجمہ:- اگر تمہیں شہد ملے تو اسے گرمی سردی دونوں موسموں میں کھاؤ مگر خبردار اس کے فوائد سے اپنے والد کو آگاہ نہ کرنا۔

پہ جہان د ننگیالی دی دا دودہ کارہ

یا بہ و خوری ککری۔ یا بہ کامران شی

ترجمہ:- دنیا میں غیر تمند کے لئے بید و کام ہیں۔ یا تو انہاں سر ہار بیٹھے گایا کامران ہو جائیگا۔

تنگہ خولہ د غنچہ گل دہ پہ لیانولکہ مل دہ

ترجمہ:- تمہارا تنگ دھانہ غنچہ گل کی طرح اور تمہارے لب شراب کی طرح ہیں۔

شور و شربہ درانجا پہ جہان نہ وو

کہ د ہیر صورت پیدا نہ وے پہ شور کنبی

ترجمہ:- رانجی کی دنیا میں شور و شر نہ ہوتا اگر ہیر شور کوٹ میں پیدا نہ ہوئی ہوتی۔

ہندو وائی چہ رام رام

مسلمان وئیل رب رب کا

وارہ بولی د خدانے نام

ہر یوہ و تہ چہ گوری

ہندو رام رام جپتے ہیں

ترجمہ:- مسلمان رب رب کہتے ہیں

ان میں سے جس کسی کو بھی دیکھو وہ خدا ہی کا نام لیتا ہے

دنمانخہ تر قضا گرانہ دا قضا دہ

چی قضا شی د خلورو مصلحت

ترجمہ:- جہاں چار آدمیوں کا صلاح مشورہ قضا ہو جائے۔ تو یہ قضا نماز کی قضا سے زیادہ مشکل ہے۔

کہ هر خودی پستنی جونہ طناز

دا د هند سکنی ہم نہ دی بی نیاز

پہ جیو جیو درتہ پستی خبری وائی

هر زمان لہ تا پہ خورنگہ ہمراز

عجب سرمے پہ پانیو شونلہی درتہ خاندی

میخی غائب پہ مسی تور عشوہ پرداز

ترجمہ:- پشتون عورتیں کتنی ہی شوخ و شک کیوں نہ ہوں مگر ہندوستان کی یہ سانولیاں بھی اتنی بے نیاز نہیں۔ نری اور جی جان سے باتیں کرتی ہیں۔ ہر گھڑی تمہارے ساتھ ہیں اور ہر طرح سے تمہاری ہمراز۔ پان سے مجب طرح ہونٹ لال کر کے تمہارے سامنے کھل کھلائیں گی۔ دانتوں میں سونے کی میخیں جڑی ہوئی، مسی طے ہوئے، ناز و انداز دانی۔

خوشحال کی ۳۰۰ ویں برسی کے موقع پر منظوم نذرانہ ہائے عقیدت

مرے خوشحال کے نغمے بھی اک ایسے ہی لافانی ستارے کی ضیا ہیں
 مری مٹی کے چہرے کی حیا ہیں
 انہی نغموں کے پرتو سے انگلیں جھجکاتی ہیں
 انہی سے اس زمیں کی آنکھ میں دہن کی آنکھیں مسکراتی ہیں
 اسی تارے کی مشعل سے ہے اپنا تن بدن روشن
 کرن اندر کرن روشن
 مرے خوشحال کے نغموں سے ہے میرا وطن روشن

امجد اسلام امجد

تو جام غزل میں قطرہ قطرہ
 صہبائے حیات گھولتا ہے

اشعار میں تیرے نکتہ نکتہ
ہفتون خمیر ہوا ہے

محسن احسان

خٹک نکلا تھا ، نان جویں کا مگر
میں نے قدو نبات و لبن کر دیا
پاکہ تھی ابھی تک یہ پشتو غزل
اس اچھوتی کو میں نے دہن کر دیا

اس مسافت میں افکار و انکار کی
کچھ نہیں فاصلہ ماہ کا سال کا
پیشرو تھے ابوالفضل و فیض مرے
پیشرو ہوں میں غالب کا اقبال کا

رضا ہوائی

غالب کی شخصیت

غالب کی شخصیت کے بارے میں سب سے پہلے ہمیں وہ تہذیبی ماحول دیکھنا ہوگا۔ جس میں غالب کی پیدائش ہوئی اور بچپن گزرا۔

، غالب نے جس خاندان میں آنکھ کھولی وہ دہلی اور آگرہ کے چند معزز خاندانوں میں سے تھا۔ یہ خاندان عام انسانوں کے مقابلے میں بادشاہوں اور ان کے خاندانی معاملوں منصب داروں اور انکی سازشوں، مرہٹوں روپیلوں نوابین اودھ اور انگریزوں کی ریشہ واریوں اور ان کی باہمی رقابتوں یعنی شیطان کے غموں سے زیادہ آشنا تھا۔ اس کے اغراض بھی مختلف موقعوں پر ان ہی طاقتوں میں سے کسی ایک سے وابستہ رہے۔ خواجہ غلام حسین کبیران شاہی خاندان کے پروردہ تھے۔ غالب کے باپ الود کی ریاست سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے چچا مرہٹوں کی طرف سے آگرہ کے صوبیدار تھے۔ بعد میں لارڈ لیک کی سرکردگی میں لڑے اور ان کی اولاد کمپنی کے دھندے کی مستحق سمجھی گئی۔ غالب کے ایک اور بزرگ نواب احمد بخش تھے۔ جن کی بھتیجی سے غالب کی شادی ہوئی۔ یہ انگریزوں کے بہت

بڑے دوست اور دہلی کے شاہی خاندان سے منسلک تھے۔ گویا بچپن میں غالب مغلوں، مرہٹوں اور انگریزوں کی مربیانہ توجہ سے بالواسطہ فیض یاب رہے۔ غالب ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی ہوگی کہ مثل بادشاہ ہے اور نہیں بھی ہے۔ مرہٹہ مغلوں کا نائب ہے اور حاکم بھی ہے۔ انگریز مسلمان نہیں ہندو نہیں لیکن دہلی پر حکومت کرتا ہے اور میرے خاندان کے بزرگ ہر طاقت کے ساتھ ہیں اور سچ پوچھو تو کسی کے ساتھ بھی نہیں۔“

ڈاکٹر خورشید الاسلام، غالب کا تہذیبی ماحول

جیسا کہ معلوم ہے غالب کی عمر ابھی مشکل سے پانچ برس کی تھی کہ انکے والد عبداللہ بیک خان وفات ہو گئے اور غالب اپنے چچا نصر اللہ بیک خان کی کفالت میں آ گئے جنہوں نے انہیں بڑے ناز و نعم سے پالا۔ نصر اللہ بیک خان ایک خوشحال جاگیردار تھے۔ ایسے دیکھیں کہ اس ماحول نے غالب کی شخصیت پر کیا اثرات مرتب کیے:-

”غالب نے اپنے بچپن میں فراوانی دولت اور آسائش کا جو رنگ دیکھا۔ اس نے غالب کے مزاج کی تشکیل میں ضرور ایک اہم حصہ لیا ہوگا۔ غالب کی زندگی میں آسائش، عزت اور زر کے حصول کی مسلسل تگ و دو کی ایک اہم وجہ غالب ابھی تھی کہ اس نے خوشحالی کا ایک دلکش دور دیکھا تھا اور قطعاً غیر شعوری طور پر اس دور کو ایک معیار قرار دے

دیا تھا۔ چنانچہ اس نے عمر بھر خوشحالی اور آسائش کے معیار تک پہنچنے کے لیے تنگ و دو کی اور ہر ناکامی اس کی آتش شوق کو فزوں تر کرتی رہی۔ ان حالات میں غالب کی شخصیت کی تکمیل میں اس کے خون گرم نے بھی حصہ لیا۔ ایک عام انسان تو شاید پیہم صدمات کے پیش نظر انفعالیات کے رجحان کو اختیار کر لیتا اور شکست و یاس کی ایک تصویر بن کر رہ جاتا لیکن غالب کے اندر زندگی کی رمت کچھ زیادہ ہی توانا تھی۔ چنانچہ اس نے ناکامیوں اور نامرادیوں کے باوجود ایک بہتر اور خوب تر معیار زندگی کو ہمیشہ ملحوظ رکھا اور اس کی زندگی ایک مسلسل تنگ و دو بے قراری اور اپنی تمام زندگی سے بے اطمینانی کی تفسیر بن کر رہ گئی۔“

ڈاکٹر وزیر آغا ”غالب کی شخصیت“

غالب کے سرنواب الہی بخش معروف شاعر بھی تھے۔ اور شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ ان کے علاوہ ذوق اور مومن بھی شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس زمانے کے شمالی ہند کی دنیائے شاعری میں ان تینوں کا ڈنکا بجاتا تھا۔ معروف نے غالب کو شاہ نصیر کی شاگردی کے لیے ضرور کہا ہو گا مگر غالب اپنی انفرادیت کے ہاتھوں مجبور تھے۔ وہ کسی کو اپنا استاد ماننے پر تیار نہ ہو سکے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین نے غالب کی اس انفرادیت کا نقشہ یوں کھینچا ہے:-

دیا۔ اپنے آپ کو دوسروں سے منفرد سمجھنے والا اپنے آپ کو دوسروں سے اونچا بھی سمجھتا ہے اور اس کے احساسات اور جذبات میں رفعت بھی آ جاتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اس صورت حال کو اپنے مقالے میں یوں سمیٹا ہے:-

”غالب کی عام زندگی میں خود پرستی کا جذبہ بالکل معمولی باتوں سے وجود میں آیا ہے۔ مثلاً خاندانی وجاہت، پیشہ آباء، پنشن، نسب، خلعت، دربار تک رسائی وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام باتیں نہ صرف غالب کو عزیز ہیں بلکہ وہ ان باتوں کو اپنی شاعرانہ کاوشوں کے مقابلہ میں زیادہ اہم بھی خیال کرتا ہے۔ اور ان کے باعث اس کے ہاں جو ”خود پرستی“ کا جذبہ ابھرا ہے اس کی نوعیت ایک بڑی حد تک عامیانا ہے۔ لیکن شعر کی دنیا میں جہاں مادی عوامل جذباتی تقاضوں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں یہی خود پرستی اس روپ میں ابھرتی ہے کہ محسوس ہوتا ہے گویا غالب ایک اونچے سنگھاسن پر بیٹھا ہے اور ایک نگاہ غلط انداز سے گزرتے ہوئے کاروائی کو دیکھتا چلا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں غالب اپنے شعر میں خود کو احساسی اور جذباتی طور پر لوگوں کی سطح سے اونچا تصور کرتا ہے۔ خود پرستی کا جذبہ وہاں ہے جو غالب کی عام زندگی میں موجود تھا لیکن ارتقاع پا کر کیا سے کیا ہو گیا ہے۔ چند اشعار دیکھئے:-

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
 وہ اک گلہ مست ہے ہم بے خودوں کے طاق نسیاں کا
 باز پوچھ اطفال ہے دنیا مرے آگے
 ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
 جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
 پر طبیعت ادھر نہیں آتی“

ڈاکٹر وزیر آغا ”غالب کی شخصیت“

سفر کلکتہ غالب کی زندگی میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ بنگال ایسٹ انڈیا کمپنی کا پہلا بڑا احداث تھا گو کہ اس کی یلغار ہندوستان کے جنوب مغربی ساحل سے شروع ہوئی تھی۔ کلکتہ بنگال کا اہم شہر اور مرکز تھا۔ سید احتشام حسین نے اسے ”نیم فرنگی نیم ایشیائی“ شہر سے موسوم کیا ہے۔ غالب کو سفر کلکتہ اسلئے درپیش آیا کہ انکے چچا کی جاگیر کے صلہ میں انہیں جویشن انگریزی سرکار سے ملتی تھی وہ بند کر دی گئی تھی۔ جس کی واکزاری کے لیے غالب کو عدالت میں پیشی کے سلسلہ میں کلکتہ کا سفر درپیش ہوا۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً تیس برس (۳۰) تھی۔ وہ لکھنؤ، بنارس اور دوسرے مقامات سے ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچے جہاں انہوں نے اپنے دو سالہ قیام کے دوران مقدمہ بھی لڑا اور ادبی معرکے بھی سر کئے۔ سید احتشام حسین غالب کے قیام کلکتہ پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:-

”غالب نے وہاں (کلکتہ میں) جو چہل پہل دیکھی، جو عمارتیں

دیکھیں، جو حسین و جمیل عورتیں دیکھیں، جو ایک نیا بنتا ہوا تمدن دیکھا
اس نے انکا دل موہ لیا۔ بتارس میں مناظر فطرت اور حسن انسانی نے
ان کے جوان حسن پرست دل پر گہرا اثر ڈالا تھا تو انہیں وہاں
(کلکتہ) کے ”سبزہ زار اور ہائے مطرہ“ اور ”نازمین تان خود آرا“ یاد
آتے اور سینے پر تیر لگتا۔ کلکتہ میں کچھ ایسی کشش تھی کہ احباب کی
دوری کا غم بھی مٹتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ایک خاص طبقے سے تعلق رکھتے
ہوئے بھی انسان کا ذہنی افق اسی طرح وسیع ہوتا ہے اور شعور اسی
طرح وہ ذخیرہ جمع کرتا ہے جو اسے اپنی طبقاتی تنگ نظری سے باہر
نکلنے میں مہم ہوتا ہے۔“

(سید احتشام حسین ”غالب کا نظریہ“)

غالب کے قیام کلکتہ کو مولانا ابوالکلام آزاد نے انکی زندگی کا اہم موڑ کہا ہے۔ اگر دیکھا
جائے تو غالب کو کلکتہ میں سبزہ زار اور نازمین کے علاوہ بہت کچھ دیکھنے اور سمجھنے کو ملا۔ سب
سے پہلے تو غالب کو مقدمے کے سلسلے میں انگریزی عدالتی نظام اور انگریزی طرز حکومت
سے آگاہی حاصل کرنے کا موقع ملا۔ شیم انجن، ٹیلیفون، ریلوے اور بجلی سے واقفیت ہوئی
کلکتہ سے غالب ایسے خیالات اور تصورات لائے جو ان کے ہم عصر شعراء وادباء کے وہم
وگمان میں بھی نہ تھے۔ سید احتشام حسین تو یہ تک کہتے ہیں کہ ”کوئی قطعی ثبوت تو نہیں دیا
جاسکتا۔ لیکن غالب کے اردو خطوط میں کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کی اردو میٹر کی سادگی دیکھ کر

یہ خیال ضرور ہوتا ہے کہ غالب نے کلکتہ کے دو سالہ قیام میں اس جدید نثر کا مطالعہ کیا اور اس سے فائدہ اٹھایا جس کے حسن اور اثر سے اردو کے نثر نگار اس وقت ناواقف تھے۔

غالب نے اپنے سفر کلکتہ میں جو کچھ جانا اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے شعور میں نئے انگریزی نظام حکومت و اقتصاد کا ایک دھندلا سا نقشہ بنتا چلا گیا۔ جس کا مقابلہ وہ ہندوستان کے موجودہ جاگیر داری نظام سے کر سکتے تھے۔ نتیجتاً انہیں کہنا پڑا:

صاحبان انگلستان راگر

شوہ و انداز اپناں راگر

داد و دانش را بہم بیوستہ اند

ہند را صد گونہ آئیں بستہ اند

آتش کز سنگ پیروں آورند

ایں ہنرمنداں زخس خوں آورند

کلکتہ میں جو کچھ ہو رہا تھا۔ اسکے اثرات کا شمالی ہند تک پہنچنا ناگزیر تھا۔ جو عذر کی صورت میں دہلی پہنچا۔ سفر کلکتہ غالب کی زندگی کا اہم موڑ تھا۔ عذر ناکی زندگی کا ایک موڑ تو کہلایا جاسکتا ہے مگر اتنا اہم نہیں کہ غالب کو حیراں کر دے گو کہ اپنے بھائی یوسف مرزا کی عین عذر کے دوران وفات سے غالب اپنی بے سرو سامانی کی وجہ سے پریشان ضرور ہوئے۔ غالب پر عذر کی اثرات کی نوعیت کیا تھی:

”عذر کے متعلق غالب کوئی گہری سیاسی رائے نہیں رکھتے تھے۔ اس

کے علاوہ وہ پہلے ہی سے اس نظام کی جاہی کا اتنا احساس رکھتے تھے کہ جب حکومت بدلی تو انہیں حیرت نہ ہوئی بلکہ ان کے لیے یہ کوئی ایسی بات ہوئی جس کا انہیں پہلے سے یقین تھا۔۔۔ غالب کا نقطہ نظر اس سلسلہ میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ عذر کی وجہ سے پیدا ہونے والی سیاسی تبدیلی کو ایک حقیقت سمجھ کر اور انگریزی حکومت کو ایک نئی سلطنت سمجھ کر قبول کر لیا جائے۔ اس لیے اس کے اندر اس نئی حکومت کے خلاف کوئی جذبہ نہیں معلوم ہوتا۔“

(سید احتشام حسین ”غالب کا نظریہ“)

اگر غالب کے ذہنی ارتقاء پر غور کریں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ غالب کی ذہنی ترقی کا دور عذر تک ختم ہو چکا تھا۔ وہ عذر کے بعد بارہ برس اور زندہ رہے جس کے دوران شعر گوئی تقریباً ختم کر دی۔ شاعری میں شاگردوں کی غزلوں کی تصحیح تک محدود ہو گئے ہاں البتہ انہوں نے اردو میں خطوط نگاری شروع کر کے شاعری کی کمی کا ازالہ کرنے کی ایک صورت ضرور نکالی:-

”غالب کے یہاں نکتہ نخی اور شوخی شروع سے تھی۔ اور اس کے اثر سے ان کی شاعری میں ایک لطیف چاندنی بھی موجود تھی مگر خطوں میں اس دولت بیدار نے ایک ایسا حسن اور کیف بھر دیا ہے جو غالب کی جامعیت اور ان کی بھرپور شخصیت کا اردو ادب کو آخری تحفہ

ہے۔۔۔ غالب کو آخری وقت تک اپنے اوپر قابو رہا۔ وہ اپنے جگر پاروں کی قربانی بھی کر سکتے تھے اور جب ایک شمع بجھنے یا دھم پڑنے لگتی تو دوسری شمع جلا سکتے تھے۔ ڈاکٹر جانسن کی طرح وہ بھی ایک ایسی شخصیت رکھتے تھے جو ان کے سارے کارناموں سے بڑی معلوم ہوتی ہے۔۔۔ ان کی شخصیت کی آب و تاب سے ان کی تصانیف کو روشنی ملتی رہی مگر ان کا اپنا شعلہ رخشندہ و تابندہ رہا۔“

(آل احمد سرور ”غالب کا فنی ارتقاء“)

کہتے ہیں کہ غالب کی شخصیت ان کی شاعری سے زیادہ انکے خطوط میں جھلکتی ہے۔ انکی خطوط نویسی کی افادیت ذیل کے اقتباسات سے پوری طرح عیاں ہوتی ہے۔ اور ساتھ میں غالب کی شخصیت بھی:-

”غرض مرزا نے اپنی شخصیت کے مختلف پہلو اس تفصیل سے واضح کر دیئے ہیں کہ تجا انہی کو سامنے رکھ کر ان کی زندگی کا جامع اور مکمل نقشہ تیار کیا جاسکتا ہے۔ یہ خطوط محض اس وجہ سے بیش بہا نہیں کہ غالب کے خطوط ہیں بلکہ ان کی بیش بہائی کے دوسرے وجوہ بھی ہیں مثلاً ان کے آئینے میں غالب کی شخصیت ایسے رنگ میں جلوہ گر نظر آتی ہے کہ اکثر اصحاب کو زندگی میں بھی اسے اس تفصیل سے دیکھنے کا موقع شاید ہی ملا ہو۔ ان میں غالب کے دل و دماغ کی مکمل تصویر

خود ان کے موقف سے تیار ہو کر سامنے آگئی ہے اور یہ تصویر اس جامعیت سے نہ ان کے کلیات نظم فارسی میں ملتی ہے نہ کلیات نثر فارسی میں اور نہ اردو یوں ان میں۔“

(مولانا غلام رسول مہر ”خطوط غالب کی اہم خصوصیات“)

”اردو کے اس بڑے شاعر کی داستان حیات یوں تو بڑی سادہ ہے لیکن حقیقت میں اس میں بڑی رنگارنگی ہے جس کا ایک ہلکا سا عکس ان کی شاعری میں نظر آتا ہے مگر اس کی پوری جھلک ہم ان کے خطوط میں دیکھتے ہیں۔۔۔۔۔ غالب کی زندگی میں جو رکھ رکھاؤ ہے جو حسن سلیقہ اور نفاست ہے وہی رکھ رکھاؤ حسن سلیقہ اور نفاست ان کے خطوط میں بھی ہے اور یہی ان کا فن ہے“

(ڈاکٹر شوکت ہنزاداری ”غالب خطوط کے آئینے میں“)

جب ہم غالب کے مزاج کی بات کرتے ہیں تو دراصل ہم ان کے مزاج کی بات کر رہے ہوتے ہیں۔ ان کے اکثر نقاد اس بحث پر متفق ہیں۔ حالی نے غالب کو حیوان ظریف کا درجہ دیا ہے۔ غالب کے اکثر اشعار کو ان کی جس مزاج کو دماغ میں رکھتے ہوئے پڑھیے تو ان میں چھپا ہوا مزاج سامنے آ جاتا ہے۔ بادی نظر میں یہی اشعار سنجیدہ محسوس ہوتے ہیں یہ چند اشعار دیکھیے جو ڈاکٹر احسن فاروقی نے اپنے مقالے ”حیوان ظریف“ کے لیے چنے ہیں۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاساں کے لیے

گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت
می توان یافت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

غنیہ نوکلغہ کو دور سے مت دکھا کر یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

اب ان کے اخلاق و عادات سے متعلق بھی جانکاری ضروری ہے۔ کیونکہ انسان کی شخصیت اس کے اخلاق و عادات کا بھی پرتو ہوتی ہے۔ جیسا کہ گذر چکا غالب کے اخلاق و عادات اور ان کی شخصیت کے باقی مظاہر ان کے خطوط میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ مگر ان کے چند نظادان کے اخلاق و عادات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ آئیے دیکھیں:-

”مرزا کے اخلاق بہت وسیع تھے۔ وہ ہر ایک شخص سے جوان سے ملنے جاتا تھا۔ بہت کشادہ پیشانی سے ملنے تھے۔ جو شخص ایک دفعہ ان سے مل آتا تھا اس کو ہمیشہ ان سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا۔ دوستوں کو دیکھ کر وہ باغ باغ ہو جاتے تھے۔ اور ان کی خوشی سے خوش اور ان کے غم سے غمگین ہوتے تھے۔ اس لیے ان کے دوست ہر ملت اور مذہب کے نہ صرف دلی

میں بلکہ تمام ہندوستان میں بے شمار تھے۔ جو مخلوط انہوں نے دوستوں کو لکھے ان کے ایک ایک لفظ سے مہر و محبت اور غم خواری و یگانگت چمکی پڑتی ہے۔“

(الطاف حسین حالی ”اخلاق و عادات“)

”سب سے پہلے یہ بتانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غالب ایک بے شکایت زندگی پر یقین رکھتا ہے اور یاد رکھنا چاہئے کہ بے شکایت زندگی کوئی معمولی مطمع نظر نہیں بلکہ انسانی اخلاق کا ایک نہایت بلند مقام ہے کسی آدمی کی شخصیت ناپنے کے لیے یہ جاننا کافی ہے کہ وہ اپنے ماحول یا اپنی قسمت کے خلاف شکایت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ یا ان سے سمجھوتہ کر کے خوش رہنے کی کوشش کرتا ہے۔“

(اقبال سلمان ”اخلاقیات غالب“)

”غالب کی شخصیت و اہمیت کا تصور کرتے وقت ہم کو یہ باتیں نظر انداز نہیں کرنی چاہئیں۔ غالب نے کسی حال میں سوا اپنے کسی اور کی آڑ نہ پکڑی اور اس آڑ پکڑنے میں وہ کہیں بھاگتے چھپتے نہ پھرے۔ ہر طرح کی مشکلات کا تمام عمر سامنا رہا لیکن انہوں نے فریاد کی نہ بغادت۔ ہر مسامری کے نیچے سے پھنے حال لیکن مسکراتے ہوئے نکلے۔ تورانی خون گر ماحول پر اپنے ناقدوں پر جی کھول کر برس بھی پڑتے۔ اردو شاعری

میں غالب پہلے شخص ہیں جنہوں نے طنز میں خدا کو مخاطب کیا ہے۔

(رشید احمد صدیقی ”کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا“)

اگر پوچھا جائے کہ غالب کا پیغام کیا ہے۔ تو ان کے کلام کے مطالعہ سے کوئی ایسا پیغام نہیں ملتا جس سے ظاہر ہو کہ وہ اپنی قوم یا اہل قوم یا اہل دنیا کو کوئی خاص پیغام دینا چاہتے تھے۔ نہ ہی کوئی ایسی علامت ہی ملتی ہے جیسے اقبال کے ہاں شاہین کی علامت ہے یا خوشحال کے ہاں مردِ تکیال کی علامت ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ غالب نے اردو شاعری اور اردو نثر کو ایک نیا رنگ عطا کیا۔ آل احمد سرور بھی اس سے متفق ہیں:-

”غالب کی شاعری کا کوئی پیغام نہیں ہے جس طرح حالی یا اقبال کا پیام ہے۔ وہ میر کی طرح ایک بڑے اور گہرے رنگ کے مالک بھی نہیں ہیں ان کے یہاں ایک رنگارنگی اور اس رنگارنگی میں انفرادیت اور انوکھا پن ہے۔ یوں تو انہوں نے ہر صنفِ سخن میں داؤدِ کمال دی اور حالی نے انہیں جامع حیثیات اور خسر و اور فیضی کی بساط کا آخری فردِ غلط نہیں کہا ہے۔ مگر دراصل ان کی سب سے اچھی ترجمانِ غزل ہے۔ غزل گو شاعر کوئی پیام پیش نہیں کرتا۔ وہ بحر کی تہہ سے موتی چننے میں یا باغ میں کلیاں توڑنے ہی میں مصروف رہتا ہے۔“

(آل احمد سرور ”غالب کا ڈنڈی ارتقاء“)

اب مرزا کا آخری وقت آن پہنچا تھا۔ ضعیف ہو گئے تھے۔ یہ اچھا ہوا کہ انکے قاری اور

اردو دیوان اور خطوط کا مجموعہ عود ہندی ان کی زندگی ہی میں چھپ چکے تھے۔ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء مطابق ۲ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ ہجری کے دن ظہر کے وقت غالب اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ نظام الدین اولیاء کے مزار کے قریب دہلی میں دفن ہوئے۔ ۷۲ برس کی عمر پائی۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد

عالم مقام حلقۂ دام خیال ہے

جان دی " دی ہوئی اسی کی تھی

حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

آخر میں غالب کے چند اشعار جن سے ان کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل

دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے

کہ موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودمیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

نام کا میرے ہے وہ دکھ کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا

وہ مری چین جنہیں سے غم پنہاں سمجھا
راز مکتوب پہ بے ربطی عنوان سمجھا

کوئی دیرانی سی دیرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی تلا دو کہ ہم بتلائیں کیا

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رنہے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

فکر دنیا میں سر کھیپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وہاں کہاں

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تمہی
من کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینہ پہ مارا کہ ہائے ہائے

وہ سبزہ زار ہائے عطرا کہ ہے غضب
وہ نازیں بتان خود آرا کہ ہائے ہائے

نہ سنو گر بُرا کہے کوئی
نہ کہو گر بُرا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

خوشحال و غالب کی تعلیم و تربیت اور علمیت

خوشحال خان خٹک

خوشحال نے پشتونوں کے خٹک قبیلے کے سردار شہباز خان کے ہاں آنکھ کھولی۔ ظاہر ہے ان دنوں جیسا کہ دستور تھا تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے خوشحال کو مکتب میں بٹھایا گیا۔ لیکن جیسا کہ ان کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے وہ مکتب کی تعلیم پر پورا دھیان نہ دے سکے۔

”میں پورے جہان کا علم سیکھ لیتا اگر مجھے شکار کی است نہ پڑی ہوتی“

خوشحال کی تعلیم و تربیت میں ان کے والد ملک شہباز خان خاص دلچسپی لیتے تھے۔ انہوں نے جہاں مکتب کے علاوہ خوشحال کی تعلیم کے لیے گھر پر بھی انتظام کیا ہوا تھا وہاں تربیت کے سلسلہ میں زیادہ فکر مندر ہے۔ ان حالات کے متعلق خوشحال کے کلام میں یہ شعر ملتا ہے:-

دہر ز ما پہ تربیت وو

تل بہ نسی ما سرہ شدت وو

ترجمہ:- ”میرے والد کو میری تربیت کا بہت زیادہ خیال رہتا تھا۔ اسی لیے وہ اس ضمن میں مجھ سے ہمیشہ سختی برتتے تھے۔“

بچپن میں خوشحال کا زیادہ تر وقت شکار اور سیر و تفریح میں گزرتا۔ کہتے ہیں کہ اسکے بعد خوشحال نے علم عمومی مطالعے اور ذوقی تجربوں اور مشاہدوں سے حاصل کیا۔ خوشحال نے اپنے کلام میں اپنی طبیعت کو عطا کی کہا ہے۔ یہ محض اپنی انکساری اور عاجزی کا اظہار تھا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ایم اقبال نسیم خلک پشتو ڈیپارٹمنٹ پشاور یونیورسٹی فرماتے ہیں:-

”خوشحال نے اپنے دور کے مروجہ علوم پر بخوبی عبور حاصل کیا۔ عربی جانتا تھا۔ فارسی ادبیات کا اچھا عالم تھا۔ پشتو زبان میں سرتا سر آدروزگار تھا اس سب کچھ کے باوجود وہ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ شکار کے شوق نے اسے علم حاصل کرنے نہ دیا۔ لیکن اصل صورت حال وہ تھی جو خوشحال بابا نے اپنے ایک قطعہ میں یوں بیان کی ہے:-

ترجمہ:- نظم ہو کہ نثر ہو یا خط

پشتو زبان پر میرا بے حساب حق ہے

نہ تو اس زبان میں ماضی میں کوئی کتاب تھی نہ ہی اس کا اپنا

کوئی رسم الخط۔ ہاں البتہ میں نے اب پشتو میں چند کتابیں تصنیف

کر ڈالی ہیں“

(ڈاکٹر ایم اقبال نسیم خلک ”مقدمہ دہ خوشحال“)

بقول خوشحال: ”کارِ قلم اور کتاب کے ساتھ انکارِ شہ آفرینک استوار رہا۔ قلم اور کتاب کے ساتھ تو یاری بڑھا پے میں بھی رہی:

ترجمہ:- ”میرا اگر کوئی یار ہے تو قلم ہے یا پھر کتاب لیکن بڑھا پے میں نظر کی کمزوری کی وجہ سے اب یہ یاری بھی ختم ہوئی۔“

حقیقت یہ ہے کہ خوشحال ایک عالم فاضل انسان تھے۔ انکا اسلامی علوم پر عبور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اور شاہ اولیس صدیقی ملتانی کی صحبت کا نتیجہ تھا۔ پروفیسر شاہ جہان خان کے مطابق خوشحال اپنے کلام میں اپنے استاد مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کا ذکر یوں کرتے ہیں:-

مولانا عبدالحکیم د دنیا و دین حکیم

یعنی ”مولانا عبدالحکیم جو دین اور دنیا کے حکیم تھے“ اسکے علاوہ اپنی کتاب دستارِ نامہ کے تیسرے ہنر ”تحریر“ کے داخل کب کمال ہے کے ذیل میں حضرت شاہ اولیس صدیقی ملتانی کے متعلق یوں کہا ہے ”نیک بخت شخص کبھی فن سے چشم پوشی نہیں کرتا۔ عیث کام نہیں کرتا“ ہمارے استاد شاہ اولیس صدیقی ملتانی بہت بزرگ اور مقدس شخصیت کے مالک تھے۔ وہ علوم ظاہری و باطنی سے بہرہ ور تھے۔ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے:-

معشوقہ کتاب است و کمان است و قلم

دیگر ہمہ محنت و رنج است و الم

کہتے ہیں کہ خوشحال کے کلام میں صوفیانہ رنگ اپنے استاد مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کے

تشریف سے آیا جو جہانگیر اور شاہ جہان کے دور میں گزرے تھے۔ اور ۱۰۶۷ھ میں وفات پا گئے۔

خوشحال کی تعلیمی استعداد کے متعلق قاضی محمد وجہ الدین یوں رقمطراز ہیں:-

”خوشحال عالم تھا اور علم دوست بھی علماء کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا اور اسی لئے علماء کے ساتھ محبت رکھتا تھا۔ اپنے زمانے کی فارسی، عربی اور دوسرے مروجہ علوم کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ فارسی زبان پر عبور کا یہ حال تھا کہ فارسی زبان میں بھی قابل قدر شاعری کی۔ اپنے کلام میں عربی الفاظ استعمال کرنا اور قرآن پاک کی تعلیمات سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے دینی علوم حاصل کرنے کے لئے کافی جدوجہد کی تھی۔ اسی لئے اپنی اسلامی فقہ کی کتاب ”فضل نامہ“ میں اس نے فقہ اور دوسرے مذہبی مسائل پر بحث کی ہے خوشحال نے عربی کی مشہور کتاب ”حدایہ“ کا پشتو میں خوبصورت ترجمہ کیا ہے“

(قاضی محمد وجہ الدین ”دخوشحال مطالعہ ص ۷۱“)

خوشحال کا دیوان اس کی علمیت اور تربیت پر دل ہے خوشحال اپنے دیوان کے متعلق خود کہتے ہیں:-

ترجمہ:- اگر میرے دیوان کے ایک ایک شعر کو شمار کیا جائے تو ان کی تعداد چالیس ہزار سے بڑھ جائے گی“

ایک دوسری جگہ یوں رقمطراز ہیں:-

ترجمہ:- ”میرا دیوان علم کے خزانوں کا پارغ ہے جس میں قسم قسم کے پھول کھلے ہوئے ہیں“

”میں نے وزن‘ مضمون‘ نزاکت اور تظہیر میں پشتو اشعار کو عین فارسی تک پہنچا دیا“

”پشتو شعر کو تازہ بہ تازہ مضمون کی بدولت میں نے شیراز اور زنجند کا ہم پلہ بنا دیا“

”جو زمانے کا فاضل ہو گا وہی سمجھ سکے گا کہ خوشحال خان خٹک کا یہ شعر کتنا دل نشیں ہے“

خوشحال نے اپنے کلام میں جا بجا اپنے استادوں کو بڑی عزت سے یاد کیا ہے:-

ترجمہ:- ”مجھ پر بار بار میرے استاد کا احسان ہو کہ اس نے میرے ضمیر کو زنگ سے پاک کر دیا“

”یہ جو خوشحال کے دل کا طوطا بولنے لگا ہے (تو اس لیے کہ وہ) اپنے استاد کا آئینہ اپنے سامنے رکھے ہوئے ہے“

”ہر اس شخص کو اپنا استاد گردانو جو تجھے کچھ سمجھائے۔ اپنے سے عمر میں چھوٹے کو اپنا بڑا جانو اگر وہ تمہیں کوئی اچھی بات بتائے“

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی سابق وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی خوشحال کی علیست پر اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

”خوشحال خان خٹک کو پشتون روایات اور پشتو ادبیات میں بلند درجہ

حاصل ہے ان کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فطرت

انسانی اور مظاہر کائنات کا صحیح علم و مشاہدہ اور تجربہ رکھتے تھے۔ انکے کلام میں بیک وقت قدیم 'روایات' کلاسیکی رجحانات اور جدید تقاضوں کا عکس نظر آتا ہے ان کے علم کی وسعت، نظر کی دقت اور فکر کی صحت کا ثبوت ہے۔

(ڈاکٹر رضی الدین صدیقی "پیش لفظ منتخبات خوشحال خان خٹک")

استاد محترم جناب ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی مرحوم استاد شعبہ اردو پشاور یونیورسٹی خوشحال کی علمیت کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:-

"خوشحال خان خٹک کا کلام انکی وسعت نظر، مطالعہ کائنات اور غیر محدود تجربات و جذبات پر شاہد و عادل ہے۔ رنگارنگی، تنوع، ہمہ گیری اور گہرائی دیکھ کر اس کے فطری شاعر اور باکمال صاحب فن ہونے پر ایمان لانا پڑتا ہے اس کے کلام میں زندگی اپنی پوری تابناکی اور بولسورنی کے ساتھ وافر و غریب اور خوشنما جلوے دکھاتی نظر آتی ہے"

(ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی "منتخبات خوشحال خان خٹک")

پروفیسر پریشان خٹک اس موضوع پر یوں رقمطراز ہیں:-

"خوشحال خان خٹک پر لاہور کی بیگم خدیجہ فیروز الدین نامی جس خاتون نے پہلی بی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اس نے خوشحال کی

کتابوں کی تعداد ۳۵ بتائی ہے جبکہ میجر راورٹی نے یہ تعداد ۲۵۰ بتائی ہے اور لکھا ہے کہ اب صرف ۱۶ کتب دستیاب ہیں۔“

جہاں تک خوشحال کی عظمت کا تعلق ہے تو اوپر اس کے متعلق بہت کچھ کہا جا چکا ہے مزید تفصیل کے لیے ہمیں جناب میاں سید رسول رسا کی کتاب مقدمہ ارمغان خوشحال کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ خوشحال کی تصانیف کے متعلق میاں صاحب فرماتے ہیں:

”خوشحال خان قلم و نثر کی بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ جن میں چند ایک یہ ہیں: کلیات خوشحال خان، دستار نامہ (نثر)، فضل نامہ، باز نامہ، سوات نامہ (منظوم سفر نامہ) ہدایہ آئینہ فراق نامہ، اخلاق نامہ، فرض نامہ، نام حق، طبع منظوم، زنجیری (پشتو شارٹ چینڈ) اور بیاض۔ خوشحال نے فارسی میں بھی غزلیں چھوڑی ہیں۔

آگے چل کر میاں صاحب کلیات خوشحال خان پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:-

”خوشحال کی تمام تصانیف میں جتنی کتابیں ہم تک پہنچی ہیں ان سب میں قلم میں خوشحال خان کی کلیات ایک اہم کتاب ہے۔ یہ اہمیت کے لحاظ سے نہ صرف قلم کی بائبل ہے بلکہ مضامین کے خورج، وسعت اور ہمہ گیریت میں پشتو کا شاہنامہ ہے۔ اس کتاب کو پڑھے بغیر پشتون کی فطرت کی رنگارنگ کون تا کوں اور قسما قسم حبیہ سادگی کی سمجھ آنا مشکل کام ہے۔ اور جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے پشتون کو پہچاننے کے لیے خوشحال خان کی کلیات کا

مطالعہ ضروری ہے۔“

(میاں سید رسول رسا ”مقدمہ ارمغان خوشحال“)

”انظم کی بھٹیک کے نقطہ نگاہ سے خوشحال خان کی کلیات پشتو ادب میں ایک یگانہ موتی ہے۔ اور انہیں بہت سی اصناف پائی جاتی ہیں مثلاً غزل، رباعی، قطعہ، قصیدہ، خمس، مسدس، معشر، ترکیب بند، مریح، مثنوی اور ترجیع بند وغیرہ جیسے کہ فارسی ادب کا بہترین سرمایہ فردوسی کا شاہنامہ ہے۔ اسی طرح پشتو ادب میں ہر لحاظ سے بلند ادبی اور فنی شاہکار خوشحال خان کا دیوان ہے۔ اگر پشتو ادب کا پورا سرمایہ ایک طرف رکھیں اور کلیات خوشحال خان دوسری طرف تو خوشحال خان کا دیوان پھر بھی بھاری نکلے گا۔“

(میاں سید رسول رسا ”مقدمہ ارمغان خوشحال“)

سراولف کیرو اور ایلمن ہاول نے اپنی کتاب The Poems of Khushal Khan کhattak - 1963 میں صفحہ ۱۱ پر خوشحال کی علمیت پر یوں روشنی ڈالی ہے:-

“ Khushal was no crude swash- buckler, but a gentleman, well educated after the fashion of his day with some knowlege of Arabic derived from the Study of the Koran and fine Vocabular of Arabic words. To hold his own at court as he

did, he must have been quite at home in
 person of the kind written and spoken in India
 and he Obviously had some knowledge of
 persian literature. It is chiefly to him that his
 native tongue which he wielded with complete
 mastery owes its enrichment with loan words
 borrowed from these sources and they are to it
 as words from Greek Latin and Norman French
 are to English"

اسی کتاب کے صفحہ ۱۳ پر خوشحال کی حسن پرستی پر یوں تبصرہ کیا گیا ہے۔

"For beauty in all its forms whether of mountains
 trees flowers birds or women, he had ever an
 eye and for the beauties of nature more than eye
 an almost wordsworthian sense of interfusion
 which leads him to make the startling
 confession. "Da khulio da Jamal puh nendare
 kkhe mi khudai byamund" .

"In contemplation of perfection of beauties, I
 found God."

پشتون قوم کی خوش بختی ہے کہ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے خوشحال خان خٹک کی عظمت کا ذکر
 ان ذریعہ الفاظ میں کیا ہے۔

خوش سرود آں شاعر افغان شناس آں کہ جیند باز گوید بے ہراس
 آں حکیم ملت افغانیاں آں طبیب علت افغانیاں
 راز قوسے دید و بے باکانہ گفت حرف حق ہاشونجی رندانہ گفت

خوشحال نے اپنی طبیعت سے متعلق جو کچھ کہا وہ انکے ان اشعار سے عیاں ہے:-

پہ درون کنبی مې پراته دی ډېر گنجونه

پہ معنی کنبی لکہ کان د سیم وزریم

ترجمہ:- میرے باطن میں بڑے خزانے چھپے ہوئے ہیں (اسلئے) معنی کے لحاظ سے میں
 سیم وزر کی ایک کان ہوں۔

ما خوشحال څه دا اشعار ویلی نه دی

یو اسرار مې هوسدا کړله اشعاره

ترجمہ:- مجھے خوشحال نے صرف اشعار ہی نہیں کہے بلکہ ان کے ذریعے ایک اسرار کو ہویا
 کیا ہے۔

دارنگینې معنې چیرې دی خوشحالہ

چې را درومی لکہ گل پہ بیاض ستا

ترجمہ:- اے خوشحال یہ رنگین معنی کہاں پر ملتے ہیں کہ تیری بیاض پر پھول بن کر اترتے
 ہیں۔

خوشحال خان کا یہ تاریخی قطعہ انکی شخصیت اور طبیعت پر دال ہے:-

”پھر نہ مجھ جیسا عزت مند اور تنگ و نام کا متوالا پیدا ہوگا

اور نہ مجھ جیسا جنگجو پیدا ہوگا

خنک (قبیلے) کا کیا ذکر تمام افغان قوم میں

شاید ہی مجھ جیسا دانشمند پیدا ہو۔“

اسد اللہ خان غالب

ادھر مرزا غالب نے ایک ترکوں کے ایک مشہور خاندان میں آنکھ کھولی۔ باپ اور بعد میں چچا کی وفات کے بعد غالب کی پرورش نضیال میں ہوئی۔ جہاں کا ماحول امیرانہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انکی زندگی کا ابتدائی زمانہ رنگینیوں اور سرمستیوں میں گزرا۔ اس ضمن میں غالب نے خود کہا ہے کہ ”میں لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور اور عیش و عشرت میں منہمک ہو گیا“

باوجود اس سب کچھ کے غالب کی تعلیم کسی قدر باقاعدگی کے ساتھ ہوئی انکو شیخ معظم اور نظیر اکبر آبادی جیسے استاد ملے۔ ملا عبد الصمد سے انہوں نے بہت کچھ حاصل کیا۔ غالب دو سال ملا عبد الصمد کے ساتھ رہے۔ چونکہ غالب کو تعلیم حاصل کرنے کے مواقع ملے اس لیے انکی تعلیمی استعداد خاصی تھی۔ وہ فارسی زبان بخوبی جانتے تھے۔ فارسی ادب سے لگاؤ تھا۔ عربی زبان میں بھی کچھ استعداد تھی۔ عربی میں صرف و نحو بھی اپنے استاد سے پڑھا۔ فلسفہ، تصوف، طب، منطق اور معانی و بیان سے دلچسپی رہی۔ فن عروض میں بھی پوری دستگاہ تھی۔

”غالب ایک نورانی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اسلاف کا گرم

خون انہیں ورثے میں ملا تھا۔ آبا و اجداد کی امارت نے جسے وہ کہیں

سچہ گری سے کہیں مرزبانی سے تعبیر کرتے ہیں ان کے دل میں
انانیت کے جذبے کی تخلیق کی تھی۔ باپ اور چچا کی بے وقت موت
کے باوجود ان کا بچپن نضیال میں بڑے ایلے تلے کے ساتھ رنگ
رلیوں میں بسر ہوا۔ تاہم جوانی کی عمر کو پہنچتے پہنچتے وہ علوم متداولہ کی
تحصیل کر چکے تھے۔ جو ان دنوں شرفاء کے لیے ضروری سمجھی جاتی
تھی۔ فارسی کی تکمیل کے علاوہ جس سے انہیں فطری لگاؤ تھا وہ منطق
فلسفہ تاریخ طب اور نجوم میں تھوڑی بہت دستگاہ رکھتے تھے۔ وہ عمر
بھر شریعت کی قید سے آزاد رہے۔“

(ڈاکٹر ناظر حسن زیدی ”غالب اپنے اشعار کے آئینے میں“)

اسکے علاوہ غالب نے بیدل، حزیں، ظہوری، عرفی، نظیری اور میر کا مطالعہ بھی کیا۔ جس نے
اسے دماغی وسعت بخشی۔ یہ جو بعض محقق غالب کو ”کم پڑھا لکھا آدمی“ ثابت کرنے کی
کوشش کرتے ہیں ذیل کا اقتباس انکے لیے ایک جواب کی حیثیت رکھتا ہے:-

”غالب کی ابتدائی تعلیم بالکل رسی ہو کر رہ جاتی اگر مثلاً عبدالصمد نے
غالب کو کچھ راہیں نہ دکھائی ہوتیں ہر مزد جو اصلاً ایران کا زرتشتی تھا
مسلمان ہو گیا اور غالب کی خوش قسمتی سے آگرہ پہنچ کر ان کا استاد
بن گیا غالب نے اس سے فارسی زبان اور پارسی مذہب کے متعلق
فیض اٹھانے کا تذکرہ بڑی محبت اور گرجھوٹی سے کیا ہے۔ غالب کا

ذاتی مطالعہ بھی وسیع معلوم ہوتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس وقت مطالعہ میں مذہب، اخلاق، تصوف، طب، ہیئت، منطق اور قصص وغیرہ کی وہی کتابیں ہو سکتی تھیں جو عرب، ایران اور ہندوستان میں پانچ چھ سو سال سے رائج تھیں۔ یہ جو اکثر آج کے محققانہ معیار سے غالب کو ”کم پڑھا لکھا آدمی“ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہ اس وقت بالکل معمولی نظر آنے لگتی ہے جب ہم غالب کو مولانا فضل حق خیر آبادی، مفتی صدر الدین آزرہ، حکیم احسن اللہ خان، نواب مصطفیٰ خان شیفتہ، حکیم مومن خان اور صہبائی وغیرہ کی صحبتوں میں دیکھتے ہیں۔ یہی اس عہد کے بڑے عالم اور دانشور تھے۔ غالب ان سے بہتر نہ سہی ان کے ہم محفل اور باعزت دوست ضرور تھے۔

(اختتام حسین ”غالب کا فکر“)

اسکے علاوہ بیدل کے متبع کا زمانہ ختم ہوتے ہی مرزا نے اپنے بیان کی قدرت اور تخیل کی جدت کے لیے اپنا الگ طرز ایجاد کیا جو انہی کے لیے مخصوص تھا۔ اس طرز نے مرزا کو اردو زبان کا بے مثل اور کامل شاعر بنا دیا۔

جب ہم غالب کی تصانیف کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ معلوم کر کے حیرانگی ہوتی ہے کہ اردو میں صرف ان کے دیوان اور خطوط کے مجموعے ہی موجود ہیں۔ اور یہ کہ انہوں نے اردو سے زیادہ فارسی میں شاعری کی اور نثر بھی لکھی۔ غالب کی تصانیف کی تفصیل درج ذیل ہے:-

دیوان غالب کے نسخے

اردو دیوان غالب کے پانچ ایڈیشن غالب کی زندگی ہی میں چھپ گئے تھے۔ اور انکی وفات کے بعد وقتاً فوقتاً چھپتے رہے۔ بعض میں اشعار کی کل تعداد ۷۰۷۰ بعض میں ۱۱۱۱ کسی میں ۹۶۷۱ کسی میں ۱۸۰۲ اور بعض میں ۷۹۶۷ آتی۔ اردو دیوان غالب کے مشہور نسخے یہ ہیں۔ نسخہ طابریہ نسخہ عرشی نسخہ سردار جعفری اور نسخہ مالک رام۔

خطوط غالب کے مجموعے :-

- (۱) مجموعہ ہندی ۱۸۶۸ء
- (۲) اردوئے معلیٰ ۱۸۶۹ء
- (۳) ادبی خطوط غالب مرتبہ مرزا احمد عسکری ۱۹۲۹ء
- (۴) مکاتیب غالب مرتبہ امتیاز علی عرشی ۱۹۳۷ء
- (۵) نادر خطوط غالب مرتبہ محمد اسماعیل رسا ہدائی ۱۹۳۹ء
- (۶) خطوط غالب مرتبہ مولوی مہیش پرشاد ۱۹۴۱ء
- (۷) نادرات غالب مرتبہ آفاق حسین آفاق ۱۹۳۹ء
- (۸) خطوط غالب مرتبہ مالک رام ۱۹۶۲ء
- (۹) غالب کی نادر تحریریں مولوی ظلیق انجم ۱۹۶۲ء

تصانیف غالب فارسی

- (۱) پنج آہنگ (۲) مہر-نم روز (امیر تیمور سے ہمایوں تک کے حالات)
- (۳) قاطع برہان (۴) دخیو تندر کے حالات
- (۵) کلیات نثر غالب (۶) آہنگ-نغم (فارسی مکاتیب)
- (۷) کلیات غالب (فارسی نظم کے دس ہزار اشعار)
- (۸) سبد چمن (نایاب فارسی کلام (۹) متفرقات غالب
- (۱۰) مارث غالب - ۳۲ فارسی خطوط

غالب کی طبیعت مسلم ہے۔ انکے کلام میں ارتقائے خیال کے ساتھ بڑی شاعرانہ صنایع بھی پائی جاتی ہے۔ اور استعاروں کی مدد سے بڑی معنی آفرینی کی گئی ہے غالب کے ہاں غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی کی صنعتیں پائی جاتی ہیں۔ کبھی کبھی مرثیہ فوجہ اور سہرہ بھی لکھتے تھے۔ فارسی کی طرح ان کے اردو کلام کا مجموعہ بھی ضخیم تھا۔ احباب کے مشورے سے انتخاب ہو کر شائع ہوا۔ وہی اب تک تبرک ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ طاہر نمبرہ آزاد دہلوی مرتب نسخہ طاہر یہ غالب کی شخصیت اور شاعری کا مقام یوں متعین کرتے ہیں:-

”بچپن اور لڑکپن اکبر آباد میں گزرا۔ جوانی میں بسلسلہ مناکحت دہلی چلے آئے پھر ساری عمر یہی رہے۔ مبداء فیاض نے ذوق سلیم عطا کیا۔ فارسی کے ساتھ مناسبت ازلی و سرمدی تھی۔ ذوق خدا داد اور تربیت استاد نے کلام کو سدا بہار کر دیا۔ پچاس سال تک مجنوں گزاری

رہے۔ تصوف اور منطقی مسائل کو عجیب سوز و ساز سے ادا کیا ہے۔
 فارسی میں آسمان کے تارے توڑ کر لاتے ہیں۔ انہی سے اردو نظم میں
 بھی قلم لگائے ہیں۔ نثر میں بھی دریا بہائے ہیں۔“

پروفیسر یوسف زاہد غالب کے شاعرانہ لب و لہجہ کی کامیابی سے متعلق یوں رقمطراز ہیں:-
 ”ان (غالب) کی شخصیت اور مزاج کے بعض انفرادی اور شخصی پہلو بھی
 ہیں جنہوں نے ان کی شاعری کے لب و لہجہ کو متعین کرنے میں بہت کام
 کیا۔۔۔۔۔ غالب چونکہ فطری طور پر جدت پسند واقع ہوئے تھے اور
 کسی قسم کی تقلید رسم و رواج کی پرستش اور ظاہر وادری کو برداشت نہ کرتے
 تھے۔ اسی لئے انہوں نے تمام تقلیدی راستوں بے معنی پابند یوں اور نظام
 قسم کی ظاہر وادریوں کو رد کر دیا۔ اپنے لیے ذاتی غور و غوص اور شخصی فکر سے
 نئی راہیں تلاش کیں۔ ذاتی تجربات سے نئی اقدار کا کھوج لگایا جو رائج
 الوقت، زوال آلودہ اقدار سے بالکل مختلف تھیں۔ اسی بنا پر زندگی کے ہر
 شعبے میں ان کی مخالفت ہوئی۔ شعر و فن، علم و ادب اور لغت و نوہی میں بھی
 لوگوں کو سند نہ مانتے تھے۔ وہ تمام مخالفتوں کا اکیلے مقابلہ کرتے رہے اور
 کسی سے دبے نہیں۔ انہیں اپنے علم پر اتنا یقین تھا کہ بغیر غور و تحقیق اور
 عقل و دہان سے پرکھنے کے وہ کسی چیز کو تسلیم نہیں کرتے تھے“

(پروفیسر یوسف زاہد، ”غالب کا شاعرانہ لب و لہجہ“)

غالب کے ہاں یہاں وہاں ایسے اشعار ملتے ہیں جو ہمارے اپنے زمانے کے لگتے ہیں۔
انکی عظمت، قادر الکلامی اور اپنے زمانے سے پہلے پیدا ہونے کی خصوصیت نے ان سے
ایسے اشعار کہلوائے:-

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

دیوار بار منت مزدور سے ہے خم
اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے

کسی بھی دوسرے شاعر کی طرح غالب نے بھی اپنی عظمت کا ذکر اپنے کلام میں کیا ہے۔
تجنیۃ معنی کا ظلم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالب صریح خامہ نوائے سروش ہے

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیان اور

منصب شیفنگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولی انداز و ادا میرے بعد

”غالب کی عظمت اور زبان پر گرفت کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ رمزِ بلخ کا استعمال بھی بخوبی کرتے تھے۔ غالب کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت جو اس کے اور سترھویں صدی کے انگریز شاعر ڈون (Donne) کے یہاں مشترک ہے رمزِ بلخ (Conciet) کا استعمال ہے۔ یعنی ایسی دواشیاء کے درمیان مشابہت و مماثلت قائم اور ظاہر کی جائے جو بادی النظر میں ایک دوسرے سے بمراطل دور ہوں لیکن جن میں غور کرنے پر ایک گہری اندرونی وابستگی متعین کی جاسکے۔“

نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی

سفیدی دیدہ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر“

(اسلوب احمد انصاری) ”غالب کی شاعری کے چند بنیادی عناصر“

گو غالب نے اپنے بڑھاپے میں کم کم شعر کہے۔ مگر کہتے ہیں کہ آج وہ محض اپنے اسی عہد کے کلام کی بدولت زندہ اور جاوداں ہے۔ شیلے نے کیا خوب کہا ہے:-

”Our Sweetest Songs are those that tell of saddest thought, our

singerest Laughter with some pain is fraught"

غالب کو زمانے کی بے قدری کا شکوہ رہا۔ مگر جاتے جاتے بھی یقین تھا کہ ان کی شہرت اور عظمت دنیا پر ظاہر ہو کر رہے گی۔

شہرت شعرم بہ کتنی بعد من خواہد شدن

موازنہ

خوشحال و غالب کی ابتدائی تعلیم اور طبیعت کا موازنہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ان کو بچپن میں علم حاصل کرنے کے مواقع تو ملے مگر انہوں نے اپنی اپنی جودت طبع اور حالات کے مطابق اتنا کچھ حاصل نہ کیا جو انہیں حاصل کرنا چاہیے تھا گو کہ غالب کو علم حاصل کرنے کے مواقع نسبتاً زیادہ ملے۔ اگر خوشحال کو مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اور شاہ اویس صدیقی ملتانوی جیسے جید استاد نصیب ہوئے تو غالب کو ملا عبد الصمد کی صورت میں ایک نہایت عالم و فاضل استاد ملا۔ بہر حال ان دونوں کی شاعری اور نثر کا معیار انکی ابتدائی تعلیم اور بعد میں زندگی کے تجربات سے حاصل ہونے والی آگہی سے کئی اونچا ہے جس کی وجہ انکی خداوار صلاحیتوں اور الہام الہی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کیونکہ:-

”نشاۃ الثانیہ (Renaissance) کے شاعر بھی شاعری کو عطیہ دہی

سمجھتے تھے۔ پنسر (Spencer) کے بقول ”شاعری ایک عطیہ الہی

ہے جو مشقت اور مطالعے سے حاصل نہیں ہو سکتا ہاں ان دونوں سے

سنوارا جاتا ہے۔“ مغرب کے نئے نقادوں میں سے ہر برٹ ریڈ

(Herbertreed) نے بھی اپنی تنقیدی کتاب ورڈز ورثہ (Words

Worth) میں اسی قسم کے خیالات ظاہر کئے ہیں اور شاعری کو

الہامی کیفیت“ کہا ہے۔

(۱- اسماعیل حسن خان ”غالب کا نظریہ شعر“)

دونوں نے شاعری کے علاوہ نثر بھی لکھی یعنی خوشحال نے اپنی مادری زبان پشتو میں شاعری زیادہ کی (چالیس ہزار اشعار چھوڑے ہیں) جبکہ پشتو نثر میں انکی ایک ہی تصنیف (دستارنامہ) ملتی ہے۔ فارسی میں خوشحال نے پچیس غزلیں کہیں جو ۲۵۰ اشعار پر مشتمل ہیں۔ بقول ڈاکٹر سید مرتضیٰ جعفری ”اس قدر کم شعر کہہ کر بھی خان نے فارسی ادب میں اپنے لیے ایک ایسا مقام پیدا کیا جس کی ایرانی ناقدین تائید کرتے ہیں“ خوشحال نے بعض غزلیں ایسی بھی کہی ہیں جن میں فارسی اور پشتو زبان کے الفاظ شعر کے دوسرے مصرعے میں اکٹھے استعمال کئے ہیں۔ جس سے ایک نئی بات پیدا ہوتی ہے۔ یا جن میں ایک مصرع فارسی کا تو دوسرا پشتو کا ہے۔ غالب نے اردو میں تقریباً دو ہزار اشعار پر مشتمل دیوان چھوڑا ہے جسے وہ ”بے رنگ من است“ کہتے تھے۔ اردو ہی میں خطوط لکھے جو اردو ادب پر ایسے ثبت ہوئے کہ اظہر من الشمس ہو گئے ہیں۔

فارسی میں غالب نے زیادہ لکھا جس میں نظم (دس ہزار اشعار) اور نثر کی تحریریں شامل ہیں۔ اس موازنہ کا آخری نکتہ یہ عرض کرنا ہے کہ جہاں خوشحال نے غیر مادری زبان فارسی

کو ٹھکرا کر اپنی مادری زبان پشتو میں اپنا مافی الضمیر سمجھایا اور کامیاب رہا وہاں غالب نے فارسی میں جو کچھ لکھا اس پر بہت فخر کرتے تھے۔ لیکن انہیں شہرت دوام انھارہ سوا شعرا پر مشتمل اردو دیوان (جسے وہ اپنی فارسی شاعری سے کم تر سمجھتے تھے) اور اردو نثر (مکتوبات نگاری) سے ملی۔

خوشحال و غالب

مذہب و مسالک

جہاں تک خوشحال و غالب کے مذہب و مسالک کا سوال ہے تو دونوں خدا کی وحدانیت، رسول کی رسالت اور ختم نبوت پر ایمان رکھتے تھے۔ دونوں خلفائے راشدین و صحابہ کرام کے ساتھ ساتھ اہل بیت رسول سے نہایت وابستگی و عقیدت رکھتے تھے۔

خوشحال خان خٹک

خوشحال خان مذہبی عقیدہ میں بچے مسلمان تھے اور اہل سنت والجماعت میں خٹکی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ایک مذہبی قصیدہ میں اپنے مذہبی عقائد کا ذکر یوں کرتے ہیں:-

”میں پشت بہ پشت ایک محمدی مسلمان ہوتا آیا ہوں۔ چاروں
پارہان نبی (خلفائے راشدین) کو ماننا ہوں۔ اور اسکو بھی صحیح جانتا
ہوں کہ چار مذہب یعنی خٹکی، مانکی، شافعی اور حنبلی ہیں۔ ان میں سے
میں خٹکی مذہب کا دعویٰ رکھتا ہوں۔ اللہ نے میرے دل میں علماء کے
لئے بہت زیادہ عزت رکھی ہے مگر موجودہ دور کے شیوخ کے لیے کچھ
کم۔ نہ میں خراباقتی ہوں نہ قنار باز اور نہ زنا کار۔ نہ ہی میں قاضی یا

مفتی ہوں جن کی نظرس چند درہم پر رہتی ہیں۔“

خوشحال کے چند دوسرے اشعار سے بھی انکے مذہبی عقیدے پر روشنی پڑتی ہے:-

”میں نے محمدؐ کے عرفان سے اللہ کا عرفان پایا

محمدؐ پاک ہیں اور انکے سبحان (اللہ) بھی پاک ہیں۔“

”اگر اللہ کو پہچاننا چاہتے ہو

تو محمدؐ اور علیؑ کی پیروی کرو۔“

”جو لوگ ابو بکرؓ و عمرؓ کو بُرا بھلا کہتے ہیں

اگر وہ منہ سے کلمہ طیبہ کہتے بھی ہوں تب بھی کافر ہیں۔“

خوشحال خان کی نظر میں خلفائے اربعہ کی قدر و عزت اور احترام کرنا ہر مسلمان کے مذہبی

عقائد کا جزو لا یتک ہونا چاہئے۔ اور جو ایسا نہ کرے اسکی مسلمانی میں خلل ہے۔ رافضی اور

خارجی کے لئے فرمایا:- ”دونوں کے لئے یہ بہتر ہے کہ ایک کی آنکھیں بخ میں پروئی

جائیں اور دوسرے کا کلیجہ۔“

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔ خوشحال خان کو اہل بیت رسولؐ خصوصاً

حضرت علیؑ سے خاص رغبت تھی۔ سنی عقیدے کے چاروں آئمہ کے علاوہ وہ اثنا عشری

عقیدہ کے بارہ اماموں کو بھی ہدایت اور احترام کا مستحق جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سوات

کے سفر کے دوران حضرت اخوند درویشؒ کے خلیفہ خاص شیخ میاں نور نے خوشحال خان پر رافضی ہونے کا الزام لگایا تھا۔ مگر خوشحال خان نے اپنی کتاب سوات نامہ میں بجا تک دھل اس الزام کو جھٹلایا۔ اور اسکے جواب میں یہی کہا کہ میں سنی العقیدہ حنفی ہوں۔ حضرت محمدؐ کو آخری نبی جانتا ہوں۔ چہار یاران نبیؑ (خلیفہ راشدین) کو حق جانتا ہوں۔ اہل بیت رسولؐ سے حد و بیعت محبت رکھتا ہوں۔ حضرت علیؑ کے ساتھ خاص رغبت ہے۔ خوشحال کے مسلک کو اسکے اپنے ایک شعر میں یوں سو یا گیا ہے۔

”میں پاکیزہ سنی مذہب ہوں اور کچھ نہیں ہوں

جو مجھے کچھ اور سمجھتا ہو تو اس کے سر میں خاک“

غالب

ادھر مرزا غالب کے شیعہ یا سنی ہونے سے متعلق کافی چہ میگوئیاں ہوتی رہی ہیں۔ انہوں نے دو قصائد حضرت علیؑ کی تعریف میں لکھے۔ ان قصائد منقبت میں سے ہر ایک کا مطلع ملاحظہ ہو:-

سازیک ذرہ نہیں فیض چمن سے بیکار

سایہ لالہ بے داغ سویدائے بہار

د ہر جز جلوۂ یکنائی معشوق نہیں

ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود میں

سید قد رت نقوی اپنے مضمون ”غالب کون ہے؟“ میں غالب کے عقیدہ سے متعلق یوں رقمطراز ہیں:-

”اس کے علاوہ غزلیات میں تیرہ شعر جناب امیر کی شان میں ہیں۔ جن میں گیارہ شعر معروضی یا خطابی ہیں اور دو شعر اعتقادی حیثیت رکھتے ہیں“

امام ظاہر و باطن ‘ امیر صورت و معنی

علی ولی ‘ اسد اللہ ‘ جانشین نبی ہے

غالب ہے رتبہ ‘ فہم و تصور سے کچھ پرے

ہے عجز بندگی جو علی کو خدا کہوں

ایک جگہ مرزا غالب اپنے عقیدے کو امین الدین خان کے نام ایک خط میں کھل کر یوں بیان کرتے ہیں:-

”میں موجد خالص اور مومن کامل ہوں۔ زبان سے لا الہ الا اللہ کہتا

ہوں اور دل میں الا اللہ لا موسثر فی الوجود والا اللہ کبھے ہوئے ہوں۔

انبیاء سب واجب التعلیم اور اپنے اپنے وقت میں من فرض الطاعت

تھے۔ محمد پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمت اللعالمین ہیں۔

مقطع نبوت کا مطلق امامت اور امامت نہ اجتماعی بلکہ من اللہ ہے۔ اور
 امام من اللہ علی علیہ السلام ہے۔ ثم حسنؑ۔ ثم حسینؑ اسی طرح مہدی
 موعودؑ بریں زیر ستم ہم بریں بگذرم“ ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت
 وزندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے آپ کو عاصی سمجھتا ہوں۔
 اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلتا مقصود نہ ہوگا۔ بلکہ دوزخ
 کا ایجنہ بنوں گا اور دوزخ کی آفت کو تیز کروں گا۔ تاکہ مشرکین و
 منکرین نبوت مصطفویٰ و امامت مرتضویٰ اس میں جلیں“

(خطوط غالب صفحہ ۸)

دوسری طرف مولانا حالی کو انکے مذہبی عقیدے سے متعلق تحقیق کے سلسلے میں اولیت
 حاصل ہے۔ اور ”یادگار غالب“ میں ان کی تحریر کو حرف آخر مان لیا گیا ہے۔ لیکن سید
 قدرت نقوی کو حالی پر بھی اعتراض ہے کہ ان سے بھی بعض مقامات پر سہوا ہے۔ حالی کی
 بیان کردہ باتوں کا اعادہ مولانا مہر اور شیخ محمد اکرام نے اپنی اپنی تصانیف ”غالب“ اور
 ”آثار غالب“ میں کیا ہے۔ بعد میں مولانا نیاز فتحپوری بھی اس بحث میں شامل ہو گئے۔
 ان اور کچھ دوسرے اصحاب کے نظریات کے مطابق غالب کے مذہبی عقیدے کی تصویر
 کچھ یوں ابھرتی ہے:-

(۱) ”اگرچہ مرزا کا اصلی مذہب صلح کل تھا مگر زیادہ تر ان کا میلان

طبع تشیع کی طرف پایا جاتا تھا۔ اور جناب امیر کوہ رسول خدا کے بعد

تمام امت سے افضل جانتے تھے“

(حالی۔ یادگار غالب، ص ۹۵)

(۲) ”سید مندر سلطان نمبرہ محمود خاں نے نواب ضیاء الدین مرحوم سے کہا کہ مرزا صاحب شیعہ تھے ہم کو اجازت ہو کہ ہم اپنے طریقہ کے موافق ان کی تجویز و تکلیفیں کریں۔ مگر نواب صاحب نے نہیں مانا اور تمام مراسم اہل سنت کے موافق ادا کئے گئے۔ اس میں شک نہیں کہ نواب صاحب سے زیادہ ان کے اصلی مذہبی خیالات سے کوئی شخص واقف نہیں ہو سکتا تھا“

(حالی۔ یادگار غالب، ص ۱۲۳)

(۳) ”غالب کی تحریرات میں شیعیت کی جھلک نمایاں تھی اور بلاشبہ ان کا میلان طبع تشیع کی طرف تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شیعیت تفصیل تک محدود تھی“

(مولانا غلام رسول مہر ”غالب“ ص ۳۸۲)

(۴) ”غالب یوں چاہے رند بادہ خوار رہا ہو یا کچھ اور لیکن اپنے عقائد کے لحاظ سے یہی غالی شیعہ تھا“

(مولانا نیاز فتح پوری)

(۵) ”مرزا عقائد میں شیعہ تھے اور شیعہ بھی سخت قسم کے۔ حضرت

علیٰ کی ذات و صفات کے متعلق انہیں غلط تھا۔

(شیخ اکرام الحق، شعر العجم فی الہند، ص ۲۹۰)

(۶) ”عقیدے کی رو سے مرزا اشاعری تھے۔ اور جب شاعرانہ رنگ میں حضرت علیؑ سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے تو بہت کچھ کہہ جاتے۔ اس کے علاوہ ”وحدانیت خدا اور نبوت ختم الانبیاء“ کے بہ دل متحقد اور بڑ بان معترف تھے۔ لیکن ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی عقائد کی قربان کے بدن پر پوری طرح چھٹی نہ تھی۔“

(شیخ محمد اکرام آثار غالب، ص ۲۲۲)

(۷) ”پس مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ (غالب) خدا کی وحدانیت پر یقین کامل رکھتے اور نجات کے لیے نبوت پر ایمان کو لازم سمجھتے ہیں۔ نبوت کے بعد امامت مرتضوی کے قائل ہیں۔ اور اسی طرح بارہ اماموں پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ اور امامت من اللہ ہونے کے معتقد ہیں۔ اس سے ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ تفضیلی اشاعری شیعہ تھے۔“

(مالک رام ”ذکر غالب“، ص ۶۲۲)

(۸) ”ایک عرصہ ہوا جب یہ نای شاعر (غالب) زیور اسلام اتار کر لیو فری مین (Free Masson) سے آراستہ ہوا تھا۔ ہر چند اس کے احباب نے حال اس مذہب کو اختیار کرنے کا اور کیفیت فری

میں ہاؤس کی دھوکہ دیکر بھی دریافت کی پر اس نے ایک کلمہ بھی اپنی زبان سے نہ نکالا یہی کہے گیا کہ کچھ نہ پوچھو۔

(بال گو بند "ذخیرہ" آگرہ مارچ ۱۸۶۹ء)

ماخوذ از "آجکل" دہلی ۱۵ فروری ۱۹۳۷ء

(ذکر غالب و احوال غالب)

ان اقتباسات سے یہ نکلا کہ سب نے غالب کو شیعہ عقیدے کی طرف زیادہ جھکا ہوا پایا پر ساتھ میں یہ بھی کہہ دیا کہ وہ تفضیلی شیعہ تھے۔ اور حضرت علیؑ کے بارے میں ان کو غلو تھا۔ دوسری بات جو سامنے آئی وہ یہ ہے کہ غالب کا مذہب "صلح کل تھا" ان کے دوستوں میں شیعہ سنی اور ہندو سب پائے جاتے تھے۔ تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ غالب کی تدفین سنی عقیدے کے مطابق کی گئی۔ اور یہ جو آخری حیران کن بات بال گو بند نے غالب کی فری میسن بننے سے متعلق کی ہے اور ساتھ میں اس عمل کو زیور اسلام اتارنے سے تعبیر کیا ہے۔ بالکل بے بنیاد لگتی ہے۔ کیونکہ بقول سید قدرت نقوی فری میسن بننے کے لئے ترک مذہب لازمی شرط نہیں ہے۔

لیکن آخر میں میں اپنی تحقیق کے مطابق قارئین کی خدمت میں غالب کی دو ایسی ربا عیات پیش کرنا چاہتا ہوں جو "انتخاب اردو کلیات غالب" از شمس الرحمن فاروقی ساہتہ اکادمی نئی دہلی پہلا ایڈیشن ۱۹۹۳ء کے آخری صفحہ ۱۲ پر موجود ہیں۔ یہ ربا عیات پڑھنے کے بعد قارئین کرام غالب کے مذہبی عقیدے کے متعلق خود کوئی فیصلہ کریں۔ میں سمجھتا

ہوں کہ غالب کی صرف یہ دور باعیات جناب قدرت نقوی کے مضمون ”غالب کون ہے“ کا مؤثر جواب ہو سکتی ہیں:-

رباعیات

(۲۵۲)

جن لوگوں کو مجھ سے ہے عداوت گہری
کہتے ہیں وہ مجھ کو رافضی اور دہری
دہری کیوں کر ہو جو کہ ہو دے صوفی
شیعی کیوں کر ہو ماوراءالنہری

(نومبر ۱۸۵۰ء)

(۲۵۳)

یارانِ نبی سے رکھ تو لا باللہ
ہر ایک ہے کمال دیں میں یکتا باللہ
وہ دوست نبی کے اور تم انکے دشمن !
لا حول ولا قوۃ الا باللہ

(نومبر ۱۸۵۰ء)

خوشحال و غالب میں پرستی

شاعر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ سے نوش اور پاک باز۔ ایک سے نوش شاعر کے لئے رندانہ کلام لکھنا ایک معمول ہو سکتا ہے لیکن اگر ایک پاک باز شاعر صبحی اور لال پری کا ذکر اپنے اشعار میں کرے تو یہ ایک غیر معمولی واقعہ شمار کیا جائے گا۔ مگر ایسے شاعر کو داد و پزنی ہے کہ صرف اپنے مطالعہ (کسی قدر مشاہدہ) اور ذہانت و پرواز تخیل کے زور پر میخانے اور سے خواروں کا پورا پورا نقشہ ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے۔ یہی حادثہ خوشحال و غالب کے ساتھ بھی پیش آیا۔ جہاں غالب سے نوشی کر کے رندانہ کلام لکھتے تھے۔ وہاں خوشحال سے کا ایک قطرہ بھی لبوں پر رکھے بغیر رندانہ اور اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر سرمستانہ کلام چھوڑ گئے ہیں۔ تفصیل آگے آتی ہے۔

غالب کی سے پرستی

غالب کی پرورش انصیاں میں ہوئی۔ ان کی انصیاں خاصی قاریغ البال تھیں۔ اسلئے انکو ایک امیرانہ ماحول ملا۔ ان کی زندگی کا ابتدائی زمانہ رنگینیوں اور سرمستیوں میں گذرا۔ اس زمانے کے بارے میں غالب خود کہتے ہیں کہ میں ”لہو و لب اور آگے بڑھ کر فقس و

فجور اور عیش و عشرت میں منہمک ہو گیا۔ آگے چل کر زندگی بھر اس ماحول کا اثر غالب کی زندگی پر رہا۔

”یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ امارت اور ریاست کے ماحول میں اس صورت حال کو پیدا ہونا ہی چاہیے تھا۔ غالب کی قیمتی کو بھی اس میں دخل تھا۔ بہر حال اس زمانے کے نقوش غالب کی شخصیت پر بڑے گہرے ہیں۔ زندگی بھر ان کا اثر باقی رہا ہے۔ بے نگری، شراب نوشی، یار باشی، عیش پسندی اور خود پرستی کی خصوصیات ان کی شخصیت میں اسی ماحول نے پیدا کی ہیں“

(احوال و نقد غالب)

آگے چل کر شراب پینے کی عادت ان کی زندگی کے ساتھ ایک عادت کے طور پر سامنے آئی۔ اور آخر تک ساتھ رہی:-

”مرزا کو مدت سے رات کو سوتے وقت کسی قدر پینے کی عادت تھی۔ جو مقدار انہوں نے مقرر کر لی تھی اس سے زیادہ کبھی نہ پیتے تھے۔ جس بکس میں بوتلیں رہتی ہیں اس کی کنجی دار و نوادہ کے پاس رہتی تھی۔ اور اس کو سخت تاکید تھی کہ اگر رات کو سر خوشی کے عالم میں مجھ کو زیادہ پینے کا خیال پیدا ہو تو ہرگز میرا کہنا نہ ماننا اور کنجی مجھ کو نہ دینا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات کو کنجی طلب کرتے تھے اور نشے کی جھانچھ میں

داروغہ کو بہت بُرا بھلا کہتے تھے۔ مگر داروغہ نہایت خیر خواہ تھا ہرگز کبھی نہ دیتا تھا۔ اول تو وہ مقدار میں کم پیتے تھے دوسرے اس میں وہ دو تین حصے گلاب ملا لیتے تھے جس سے اس کی حدت اور تیزی کم ہو جاتی تھی۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں:-

آسودہ باد خاطر غالب کہ خوشی دوست
آستخفن بہ بادہ صافی گلاب را

(الطاف حسین حالی "اخلاق و عادات")

اپنے نسبی اور خاندانی ماحول کے باعث غالب میں انانیت کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ اس انانیت نے انہیں زندگی میں قدم قدم پر نقصان پہنچایا۔ اور وہ غم روزگار کے ہاتھوں ٹالاں رہنے لگے۔ انہوں نے اپنی عالی ہمتی سے ہر غم کا ڈٹ کر مقابلہ کیا مگر ساتھ کے ساتھ خدا سے اس امر کی شکایت اس انداز میں کرتے گویا قصور قدرت ہی کا ہے۔

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا

دل بھی یا رب کئی دیئے ہوتے

"غم پھر غم ہے۔ غالب نے اس لا علاج مرض (غم روزگار) کا کافی

مقابلہ کیا مگر جب دیکھا کہ مفر محال ہے تو غم ہستی سے بچنے کے لیے

مئے ناب کے دامن میں پناہ لی۔ ان کی زندگی میں گریز کی بس یہی

ایک مثال ہے۔ یہ شراب نوشی کی عادت آخروں تک باقی رہی۔ نہ جانے اس سے ان کی غرض نشاط تھی یا آتش سیال کو محض غم غلط کرنے کا سامان سمجھتے تھے مگر وہ اس مشروب کے بے طرح عادی ہو گئے تھے۔ اور اسے ضروریات زندگی میں سے سمجھتے تھے:-

جاں فزاء ہے باوہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں

(ذاکثر ناظر حسن زیدی۔ ”غالب اپنے اشعار کے آئینے میں“)
گو کہ غالب اپنی اس عادت اور فعل پر سخت نادم تھے اور اسے کبھی نہ چھپایا، لیکن شراب کے متعلق طرافت آمیز باتیں بڑا لطف اور مزالے کر کرتے تھے۔ دو ایک واقعات اس ضمن میں کافی مشہور ہیں۔ مولانا حالی کے مطابق ایک شخص نے ان کے سامنے شراب کی نہایت مذمت کی اور کہا کہ شراب خور کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ مرزا نے کہا ”بھائی جس کو شراب میسر ہے اس کو اور کیا چاہیے جس کے لئے دعا مانگے“ اپنے خطوط میں بھی غالب نے اپنی شراب نوشی کا حال لکھا ہے۔ میر مہدی کے نام ایک خط میں کیا زبردست نقشہ کھینچا ہے:-

”میر مہدی! صبح کا وقت ہے جاڑا خوب پڑ رہا ہے آنکھیں سانسے رکھی ہوئی ہے۔۔۔ آگ میں گرمی سہی مگر ہائے وہ آتش سیال کہاں کہ جب دو جرے پی لیے فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی۔ دل توانا ہو گیا۔ دماغ روشن ہو گیا۔ نفس ناطقہ کو تو وجد ہم پہنچایا“

ایک اور خط میں امین الدین خان کو لکھتے ہیں :-

”ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت و زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور

اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھے دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا

مقصود نہ ہوگا۔ بلکہ دوزخ کا ایندھن بنوں گا۔ اور دوزخ کی آجی کو

تیز کر دوں گا“

(خطوط غالب صفحہ ۸۰)

ڈاکٹر یوسف حسین خان کے مطابق غالب کی رندانہ شاعری میں شوخی ٹکٹ ٹکٹ کر بھری

ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ متانت اور سنجیدگی کو بھی قائم رکھا ہے اسی طرح شعر کی نزاکت اور

باریکی اور ادا جگر ہو جاتی ہے اور ذوق لطف اندوز ہوتا ہے:

قرض کی پیتے تھے سے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں

رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

داعظ نہ تم بیچ نہ کسی کو پلا سکو

کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

غالب کے صوفیانہ کلام کو دیکھ کر یہ سوال اٹھایا گیا کہ وہ رند ہوتے ہوئے صوفی نہیں ہو سکتے

شہناز ہاشمی نے اپنے مضمون ”کیا غالب کا کلام الہامی ہے؟“ میں اس نکتے پر سیر حاصل

بحث کی ہے اور غالب ہی کے رندانہ اشعار کی روشنی میں اس امر کا اظہار کیا ہے کہ غالب

صوفی شاعر نہیں ہو سکتا:-

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بغی نہیں ہے بادہ و سانر کہے بغیر

وہ چیز جس کے لیے ہو ہمیں بہشت عزیز
سوائے بادۂ گفلام و مُغک و مُو کیا ہے

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادہ پیائی

مرزا کے کلام میں شراب و شراب نوشی اور اسکے اثرات کا ذکر جگہ جگہ ملتا ہے۔ آئیے چند ایک
ایسے اشعار کا لطف اٹھائیں:-

پیوں شراب اگر تُم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سپو کیا ہے

سوج گل ڈھونڈ بہ خلوت کدۂ غنچۂ باغ
گم کرے کوششِ میخانہ میں مگر تو دستار

مے سے غرض نشاط ہے کس رویا کو
اگ گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو ' مدرسو ہو ' کوئی خانقاہ ہو

ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایکدن
ورنہ ہم چھینٹریں گے رکھ کر غدر مستی ایکدن

چار موج اُشتی ہے طوفان طرب سے ہر سو
موج گل ' موج شفق ' موج صبا موج شراب

زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوف حرم سے
آلودہ بہ مے جامہٴ احرام بہت ہے

گویا مرزا نے ہر زمان و مکان کے زاویہ نگاہ سے شراب کی بوتل کو گھما کر پیش کیا ہے۔ ایک جگہ بڑا اچھوتا خیال قلمبند کیا ہے۔ گویا قلم پر بھی شراب اثر انداز ہو سکتی ہے۔ آئیے اسی پر اس مضمون کا اختتام کرتے ہیں:-

مے کش مضمون کو حسن ربط خط کیا چاہیے
لغزش رفتار خامہٴ نئی تحریر ہے

خوشحال اور مے پرستی

خوشحال نے اپنے قبیلے کے سردار اور مغلیہ شہنشاہ جہانگیر کے ایک اہم عہدیدار کے ہاں آکھ کھولی تھی۔ انہیں بچپن میں ہر قسم کی سہولیات میسر تھیں۔ پشتون کلچر اور اپنے گھرانے کے مذہبی ماحول کی بدولت وہ لہو و لعب شراب نوشی اور دوسری معاشرتی خرابیوں سے بچے رہے۔ ہاں اس دور کے خواتین کی طرح خوشحال کو بھی بچپن سے شکار کا شوق تھا جو آخر تک انکے ساتھ رہا۔

خوشحال خان کے اخلاق و عادات پر خوشحالیات کے ماہر میاں سید رسول رمانے مربوط تبصرہ کیا ہے:-

”خوشحال خان اونچے اخلاق کے پشتون سردار تھے۔۔۔ اس وقت کے پشتون خواتین کی طرح شکار کے دلدادہ تھے۔ باز کے ذریعے شکار کے لیے خاص رغبت رکھتے تھے۔ گھوڑے باز اور شکاری کتے انکو بہت پسند تھے۔۔۔ خوشحال خان پیدائشی شاعر، عاشق، مزاج اور حسن پرست تھے لیکن عیاش اور لواطت پرست نہیں تھے خود فرماتے ہیں:-

نہ خرابائی، نہ قمار باز، نہ زنا کاریم
 نہ قاضی، مفتی، چچی، نہ نظر پہ خو در مدہ
 ترجمہ:- میں نہ تو خراباقتی ہوں، نہ قمار باز ہوں اور نہ زنا کار ہوں اور
 نہ ہی قاضی اور مفتی ہوں۔ جنگی نظریں چند درہموں پر لگی رہتی ہیں۔“

(میاں سید رسول رسا، مقدمہ دارمغان خوشحال)

اس صورت حال میں یہ دیکھنا ہوگا کہ خوشحال نے مے نوشی کئے بغیر جو اعلیٰ درجے کی رندانہ
 شاعری کی ہے کیسے ممکن ہوئی۔ غور کرنے پر اس کی دو تو جہات نظر آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ
 انہوں نے فارسی ادب اور خاص طور پر فارسی شعراء و شاعری کا گہرا مطالعہ کیا تھا جس کی
 وجہ سے نہ صرف یہ کہ پشتو شاعری پر فارسی شاعری کا رنگ چڑھا بلکہ فارسی شاعری سے مے
 اور مے کشی کے رنگارنگ خیالات بھی خوشحال کے مشام جان ہو گئے جو بعد میں اگلے اپنے
 کلام کو متاثر کئے بغیر نہ رہ سکے۔

چپی نہ مٹی نہ معشوقہ نہ گشت د گلو

دغہ عمر دے د غم او غرامت

ترجمہ:- جب نہ شراب، نہ معشوقہ ہو اور نہ ہی پھولوں کی سیر ہو۔ تو یہی غم اور تاوان کی عمر
 ہے۔

د گلو تو پہ موسم گنہی خوار ہغہ دے

چپی نہ پیالہ پہ لاس نہ ٹپی نگار شتہ

ترجمہ:- موسم گل میں خوار وہی شخص ہے جس کے ہاتھ میں نہ تو پیالہ ہے اور نہ ہی اسکا معشوق موجود ہے۔

خوشحال کی رندانہ شاعری کی دوسری وجہ انکی مجازی اور صوفیانہ شاعری میں پست نظر آتی ہے۔ اگر انکے رندانہ اشعار میں سے چند ایک کو اس زاویہ نگاہ سے پڑھا جائے تو یہ بڑی حد تک انکی مجازی شاعری کا حصہ معلوم دیں گے:-

ساقی راشہ د کھپ د کھپ پیالہ را کرہ

چہی د میو پہ مستی کنہی شم سرشار

ترجمہ:- اے ساقی مجھے شراب سے بھرے ہوئے پیالے دے۔ تاکہ میں کی مستی میں سرشار ہو جاؤں۔

ایک اور شعر کا ترجمہ یوں ہے:-

ترجمہ:- اصلی معنوں میں میں خود شراب ہوں اور خود ہی ساقی۔

ہیں کوئی شراب کے طلبگار جنہیں میں مدہوش کر دوں۔

بہر حال! ہم خوشحال کی رندانہ شاعری کو ناہری آنکھ سے دیکھیں یا مجازی زاویہ نگاہ سے پرکھیں۔ ان میں خوشحال ایک ایسے رند کی صورت میں بھی ابھرتا ہے جو اعلانیہ سے نوشی کرتا پھرتا ہے اور شراب نہ پینے پر واعظ، محتسب، ملا اور عابد کو خوب خوب لٹاڑتا ہے۔

مست یم مے پرست یم رندی کرمہ کرمہ کرم

واورہ محتسبہ بسادہ خورمہ خورمہ خورم

ترجمہ:- میں مست ہوں سے پرست ہوں شراب نوشی کرتا ہوں کرتا ہوں کرتا ہوں
اے نقشب کن رکھ کہ میں شراب پیتا ہوں پیتا ہوں پیتا ہوں۔

لہ ازلہ نہی رند رند زاهد زاهد کہو

زہ بہ دکھی پیالی اخلم تہ تسبیح کپہ

ترجمہ:- خالق نے ازل سے رند کورند اور زاهد کوزاهد بنایا ہے۔

اسلئے میں تو شراب سے بھرے جام پیتا ہوں اور تسبیح پھیر۔

شیخ دی مونخ روژہ کا زہ بہ دکھی پیالی اخلم

ہر سہرے پیدا دے خپل خپل کارلہ کنہ

ترجمہ:- شیخ نماز اور روزے میں مشغول رہے میں تو شراب کے بھرے جام اٹھایونگا۔

کیونکہ ہر شخص اپنے اپنے کام لے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

خوشحال کی رندانہ شاعری میں کہیں کہیں طنز و مزاح کی چاشنی بھی ملتی ہے:

زہ خو شرابی یم شیخہ خٹہ واسرہ جنگ کپہ

برخی لزلہ دی کاش کہ ماد خان پہ رنگ کپہ

ترجمہ:- اے شیخ تو مجھ شرابی کے ساتھ کیوں لڑتا جھگڑتا رہتا ہے۔ یہ سب تو قدرت کا نظام

ہے جو ازل سے چلا آ رہا ہے۔ اے کاش کہ تو مجھے اپنے جیسا بنالے۔

د ساقی د میو ہسی شان اثر و

پہ خمار کنہی می دستار د سرہ خپور شو

ترجمہ:- ساقی کی شراب کا کچھ ایسا اثر تھا۔ کہ خمار کی وجہ سے میرے سر سے دستار گر کر بجھر گئی۔

ذکر فکر مونخ روژہ طاعت ولرہ بویہ
شیخ، ملا، زاہد، عابد، صوفی پہ میو خٹہ زدہ
ترجمہ:- ذکر، فکر، نماز، روزہ اور اطاعت ہی ان کا کام ہے۔ شیخ، ملا، زاہد، عابد اور صوفی کو شراب سے کیا واسطہ۔

محاسب چہ پہ احدا وود مستانو
دندانو سرہ گنہناست بادہ خورشو
ترجمہ:- جتنے پہ، تلوں کا دشمن تھا۔ وہ دندانوں کی محبت میں رہ کرے خوار بن گیا۔
کو مو شونلو چہ درود او تسبیحات وے
راشہ او گورہ دیود مینا شو
ترجمہ:- جو لب درود و تسبیحات میں مصروف رہتے تھے آؤ دیکھو کہ وہ سے دینا کے ہو کر رہ گئے ہیں۔

جیسا کہ کہہ آئے ہیں خوشحال بابا کی رندانہ شاعری پر فارسی رندانہ شاعری کا اثر ظاہر و باہر ہے۔ ان کے بعض اشعار کو ہم عمر خیام اور حافظ شیرازی کے اشعار کے سامنے بخوبی رکھ سکتے ہیں۔ ایسے ہی چند ایک اشعار کے ترجمے ملاحظہ کریں:-
ترجمہ:- بلبلوں کی آواز میں یہی خبر ہے کہ بے نوشی کرو۔

یہ پھول ہمیشہ نہیں رہیں گے۔

ترجمہ:- اگر دیکھو تو یہ بھی قلم ہے کہ بہار

مے کے بغیر گزر جائے

ترجمہ:- بہار کے موسم میں کیسے مے سے توبہ کر لوں

جبکہ مغنی کا سر ودفونشا فوش میں ہے

عمر خیام کی ایک رباعی کا انگریزی ترجمہ یوں کیا گیا ہے:-

"With a Loaf of Bread Beneath the Bough, A Flash of Wine, A
Book of verse and thou."

خوشحال کا ایک شعر ہے:-

مے شتہ ، چنگ و نئے شتہ د خپل یار سرہ خوش حالہ

خپل بیاض پہ لاس کنبی خاکلزار لہر کنہ

ترجمہ:- شراب ہے ، رباب ہے ، بانسری ہے۔ اے خوشحال! ایسے میں تو اپنے محبوب کو ساتھ

لے آئی بیاض کو بغل میں دہائے چمن کا رخ کر۔

خوشحال کے اسی شعر کا سٹراپولن ہاول نے انگریزی میں یوں ترجمہ کیا ہے:-

"Garden Season, Moment Wine, Music verses all Combine,
wherefore tarry Mistress mine"

خوشحال و غالب کا بڑھاپا

خوشحال کا بڑھاپا

جیسا کہ معلوم ہے۔ خوشحال خان نے ۷۶ برس کی عمر پائی لیکن انکی آخری عمر غموں اور مصیبتوں کی ایک طویل داستان ہے۔ گوکہ بچپن اور جوانی میں وہ حوادث کے شکار ہوتے رہے۔ ۱۳ برس کی عمر میں اپنے باپ کے ہمراہ یوسٹریوں کے خلاف ایک معرکہ میں زخمی ہوئے اس سے پہلے صغیر سنی میں ایک دفعہ مکان کا چھپران پر گرا جسکے نتیجے میں وہ زخمی ہوئے۔ اور چند دن بے ہوش بھی رہے۔ کہتے ہیں کہ ۱۸ سال کی عمر میں عین اپنی شادی کے دن انہیں سخت بخار نے آگھیرا۔ جو بارہویں دن جا کر لوٹا۔ یہی نہیں ۵۱ برس کی عمر میں اورنگزیب عالمگیر کے مغل صوبیدار نے انہیں دھوکہ سے گرفتار کیا اور پابہ سلاسل پشاور سے دہلی روانہ کیا۔ جہاں سے انہیں قلعہ رحمتکو رہیجا گیا اور تقریباً ڈھائی سال قید رکھا گیا۔ قید کے بعد دہلی اور آگرہ میں ڈھائی سال تک نظر بند رکھا گیا۔ قید اور نظر بندی کے بعد سرائے اکوڑہ واپسی ہوئی تو معلوم ہوا ان کا پورا خاندان بکھر چکا ہے۔ اور یوسٹریوں کی پناہ میں ہے اسکے بعد دکن سے لٹکر کابل تک ایک زبردست قحط اور وباء نے سخت تباہی مچادی جس میں خوشحال خان کی بیوی بیٹے اور ان کے علاوہ بہت سے عزیز و اقارب بھی انتقال کر گئے۔

علاوہ ازیں انہیں اپنے جوان سال بیٹے نظام کی موت کا صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا۔ اسکے بعد مغللوں کی ایماء پر دولت اور منصب کی خاطر خوشحال خان کی اپنی اولاد اسکے خلاف ہو گئی حتیٰ کہ انہیں اپنا علاقہ چھوڑ کر افریقہ یوں کے پاس پناہ لینی پڑی۔ اس وقت وہ اپنی زندگی کے آخری حصے میں تھے۔ ان حالات کو مشہور مؤرخ جادو ناتھ سرشار نے اپنی تاریخ میں یوں سمیٹا ہے:-

”ایک فرد واحد جس کی اتنی بڑی سلطنت (مغلیہ) جان کے درپے ہو۔ اس کا قبیلہ بھی ساتھ چھوڑ دے اپنے بیٹے بھی علی مخالفت پر اتر آئیں۔ گھریار سے محروم ہونا پڑے عمر اس کی چھتر (۶۷) سال ہو۔ پھر بھی اس کی ہمت نہ ٹوٹے تو وہ خوشحال خان تنگ ہوگا“

آخری عمر میں خوشحال خان کا شغل قلم اور کتاب پر موقوف تھا۔ لیکن نظر کی کمزوری کی وجہ سے یہ شغل بھی محال ہوا۔ جیسے کہ کہا ہے:-

”میری یاری قلم اور کتاب سے ہے مگر اب یہ مشغلہ بھی نظر کی کمزوری کی وجہ سے ممکن نہیں رہا۔“

میاں سید رسول رسا اپنی معرکہ الار کتاب ار مغان خوشحال میں خوشحال خان کے بڑھاپے اور بڑے سخی کا نقشہ خود خوشحال خان کی زبانی یوں کھینچتے ہیں:-

”اگر خوشحال خان بوڑھا ہو گیا ہے تو اسے یہ توقف مگد حواس میں کیا عیب ہے۔ کیونکہ منگ و غنم اور اگر حق جتنے پرانے ہوں ان کی خوشبو

تیز تر ہوتی جاتی ہے۔ گوہر کے پرانا ہونے پر اسے اونٹی نہیں سمجھا جاتا۔ سونا کسی بھی بازار میں لے جایا جائے اس کی قدر کم نہیں ہوتی۔“
آئیے اس نابغہ عصر کے بڑھاپے اور دکھوں کا اندازہ انکے مزید اشعار کی روشنی میں کریں:-

ترجمہ:- خدا جانے یہ آسمان کی کون سی آفت ہے جس نے میرے گھر میں جنم لیا ہے۔ آج روئے زمین پر اتنا پریشان اور کوئی نہ ہوگا جتنا میں ہوں۔ اگر بیچار ہوں تو عزت و ناموس کو خطرہ درپیش ہے انھوں تو طوفان اٹھاتا ہے۔“

ترجمہ:- ”یا اپنی اولاد سے شاہجہان ٹالاں تھا یا پھر خوشحال فریاد کر رہا ہے۔ میری داڑھی سیاہ تھی تو میں اس حقیقت سے بے خبر تھا۔ اب جبکہ سفید ہو گئی ہے تو معلوم ہوا کہ اگر سمندر کا صدف سُچا نہ ہو تو اس سے اچھا گوہر نہیں نکلتا۔“

ترجمہ:- بڑھاپا آ گیا۔ جو میں کمزور اور ناتواں ہو گیا ہوں۔ یا مجھے کوئی بیماری ہو گئی ہے کیونکہ میں جو کچھ کرنا چاہتا ہوں وہ (پورا) نہیں ہوتا۔ ورنہ وہی ملک ہے اور وہی لوگ۔“

بڑھاپا خوشحال کی حسن پرستی میں کچھ کمی نہ لاسکا:-

ترجمہ:- یہ جو بے وقت مجھ پر سفید داڑھی کی بلا نازل ہوئی ہے۔ تو

اس نے خوشحال سے خوب صورت حسیناؤں کے دل پھیر دیئے ہیں۔“
 ترجمہ:- یہ تم جو سفید داڑھی لگائے ہوئے اس سے بوسہ مانگ رہے
 ہو۔ تو پاس کھڑے ہوئے تو جوانوں کی ہنسی اڑا رہے ہو۔ اب جو تم
 بوڑھے ہو گئے تو جوانوں کی ہی خواہش بھی مت کر۔ اب تم سے جوانی
 کی ساری باتیں چلی گئی ہیں رات دن بھی اگر زار و قطار اس کے لیے
 روتے رہو تب بھی زندگی کا گیا ہوا وقت پھر (لوٹ کر) نہیں آئے گا۔“

ترجمہ:- عشق جوان کی نسبت بوڑھے کو جلدی زبون کرتا ہے۔ کیونکہ
 بچی لکڑی آگ سے خوب سوختہ ہوتی ہے۔“

ترجمہ:- اگرچہ خوشحال کی عمر ستر سال سے تجاوز کر گئی ہے۔ مگر ہنوز
 اس کے دل میں حسینوں سے آشنائی کرنے کا جذبہ زندہ ہے۔“

ترجمہ:- کاش کہ سدا تیس سال کی عمر ہوتی۔ کاش کہ ہم گل لالہ کی
 طرح تازہ رہتے۔ روز روز حسین عورتوں کے حسن سے لطف اندوز
 ہوتے۔ اور خدا را ہاتھ میں پیالہ ہوتا۔“

خوشحال پر بڑھاپا آیا تو اپنی جوانی کو ایک خواب پر معمول کیا:-

ترجمہ:- جوانی میں تو سوتا رہا۔ اب بڑھاپے میں خوشحال کی آنکھیں کھلی ہیں۔“

ترجمہ:- اے خوشحال! جوانی کی ساعت ایک خواب کی مانند تھی۔

جسے میں نے دیکھا اور وہ گزر گئی۔“

ترجمہ:- ہائے جوانی تو تو ہوا کے کندھوں پر بیٹھ کر چلی گئی۔ تیری کامرانی ایک رات کا خواب تھی۔ میں بیدار ہوا تو جیڑی سے واسطہ پڑا ہے۔ نہ تو اب لکوار کی تیزی ہے اور نہ غانی“

بڑھاپے نے خوشحال کی جس مزاح کو اور چیز کر دیا:-

ترجمہ:- جوانی چلی گئی۔ بڑھاپا آ گیا۔ اب میں باغ کا ایک تنکا پھول ہوں۔ اگرچہ میرے منہ میں دانت نہیں تب بھی بغیر دانتوں کا مست ہاتھی ہوں“

ترجمہ:- لو اب میں عمر کے اس حصہ میں پہنچ چکا ہوں جسے تم دیکھ رہے ہو۔ سفید داڑھی میری جوانی تھیں چکی ہے۔ ایک شکار دوسرے کتاب اور تیسرے حسینوں کی یاد کے سوا باقی تمام چاتھیں ختم ہو چکی ہیں“

ترجمہ:- بوڑھا چاہے اپنی سفید داڑھی پر کتنا ہی کالا خضاب لگائے اور جوان عورت کے سامنے اپنے آپ کو جوان ظاہر کرے مگر جوان عورت کا دل ایسے شخص سے پک چکا ہوتا ہے۔ چاہے وہ شخص اپنی جوان عورت کو کتنا ہی ناز و نعم میں رکھے ہاں مگر خوشحال کا ذاتی تجربہ یہ کہتا ہے کہ جوان شکر لب عورت کا بوسہ بوڑھے کو جوان کر دیتا ہے“

ترجمہ:- ”اے خوشحال تجھ پر بڑھاپا چھا گیا ہے۔ لیکن تیرے دل

میں ابھی تک چند خیالات باقی ہیں۔ شک کا خیال، جنگ کا خیال،
حسینوں کا خیال اور غلط و خال کا خیال“

ترجمہ:- ستر سال سے گذر چکا ہوں۔ کج چشم ایک کو دود دیکھتا ہے میں
ایک کو سات دیکھتا ہوں۔ اسی (۸۰) سال تک اگر پہنچ جاؤں۔ تو
صاف نظر آتا ہے کہ ایک کے ہیں دکھائی دیں گے“

ترجمہ:- ”اگر بات ڈاڑھی اور دانتوں تک ہے۔ تو پھر تو یہ پھول جیسی
نازک اندام حسینائیں مجھ سے رہ گئیں۔ البتہ بڑھاپے میں خوبہ خضر
بن کر اور بھی حسین صورتیں دیکھنے کا موقع ملے گا۔

ترجمہ:- ”میری ڈاڑھی اور دانت صاف تیار ہے ہیں کہ میری جوانی
کا دور گذر گیا ہے۔ جب میں کسی کو دیکھوں یا ہنسوں تو وہ مجھے دادا
کا کا اور بابا کہہ کر پکارتا ہے“

یوں بڑھاپے نے قبیلے کے سردار، تلوار، کے وطن، شکار اور کتاب کے رسیا شاعر بے بدل
خوشحال خان کو کمزور کرنے کی کوشش کی مگر حالات گواہ ہیں کہ اس مردِ آہن نے پھر بھی
بہمت کے ہتھیار نہ ڈالے اور اپنے گھریار سے دور افریدی قبیلے کی پناہ میں آخر دم تک اپنے
اصولوں پر قائم رہے۔

غالب کا بڑھاپا

غالب نے ۷۲ برس کی عمر پائی۔ بچپن امیرانہ ماحول اور تازہ و نعم میں گذرا۔ ۱۳ برس کی عمر میں شادی ہوئی۔ سن شعور کو پہنچتے ہی مالی مشکلات سے دوچار ہوئے جو ہمیشہ غالب کے ساتھ رہیں۔ پنشن بند ہوئی۔ ملازمت حاصل کرنے میں ناکامی ہوئی۔ اسی دوران ایک اور بلائے ناگہانی سے واسطہ پڑا یعنی قمار بازی کے الزام میں گرفتار ہوئے۔ جب بہت ہی مجبور ہوئے تو قلعہ شاہی سے متعلق ہو گئے۔ اور یوں وہاں کی تنخواہ اور دربار رامپور کے وظیفے پر گزارا چلتا رہا۔ مقصد یہ ہے کہ غالب تقریباً تمام عمر غم دوران کے ہاتھوں تکالیف اٹھاتے رہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ غالب کے سات بچے پیدا ہوئے۔ لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی۔ مگر چندہ مہینے سے زیادہ کوئی نہیں جیا۔ ساٹھ برس کی عمر میں غالب کو جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کے ہنگاموں نے اپنے ہی گھر میں مقید ہونے پر مجبور کیا۔ اسی دوران ان کے بھائی مرزا یوسف کا انتقال نہایت نامساعد حالات میں ہوا۔ جنگ آزادی کے ان حالات کا نقشہ غالب نے اپنے کلام میں یوں کھینچا ہے:-

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے

زہرہ ہوتا ہے آپ انساں کا

چوک جس کو کہیں وہ مقلد ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک
آوی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا
وہی رونا تن و دل و جاں کا

مختلف ادباء نے اپنے اپنے مخصوص حیرائے میں غالب کے بڑھاپے کے ذکر کو یوں سمیٹا ہے:-

”غالب پر بڑھاپا کیا آیا۔ اپنے ہمراہ دکھ اور تکالیف کا ایک ایسا انبوہ
سمیٹ کر لایا جس نے غالب کو وقت سے پہلے ہی زندہ درگور کر دیا۔
ایام ہجری میں عذر کی صعوبتیں، عزیز واقارب کا قتل، جوان سال (بیتجہ)
(عارف کی موت، پنشن کا بند ہونا، جاگیر کی چابی، ادبی محاسن،
آخر کہاں تک گنویا جائے۔ مصیبتوں اور تکلیفوں کا ایک آسمان سر پر
ٹوٹ پڑا۔ انہی سے نبرد آزما ہوتے ہوئے غالب نذر اجل ہو گیا“

(شریف رزمی، غالب اور قنوطیہ)

”اسی طرح دہلی اور بعض دوسرے مقامات کے حالات ان کے
خطوں میں موجود ہیں۔ نواب غلام بابا خان نے جشن کے سلسلے میں

سورت آنے کی دعوت دی جواب میں لکھتے ہیں ”پاؤں سے اپاہج“
کانوں سے بہرا، ضعف دماغ، ضعف دل، ضعف معدہ، ان سب
ضعفوں پر ضعف طالع، کیونکر قصد سفر کروں؟“

(مولانا غلام رسول مہر ”خطوط غالب کی اہمیت“)

سفید بالوں کے نکلنے پر پیری کا تصور یوں دلایا ہے۔

”----- جب ڈاڑھی مونچھ میں سفید بال آ گئے۔۔۔۔۔ اس
سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسی بھی
چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی“

(ڈاکٹر سید عبداللہ ”غالب کی اردو سنٹر“)

دہلی کی تباہی کے بعد آخر عمر میں غالب مکتوب نگاری کی طرف رجوع ہوئے۔ اور مراسلہ کو
مکالمہ بنا دیا۔ طنز و مزاح ان کے ہر خط کی جان ہے۔ وہ برابر اپنے دوستوں، عزیزوں اور
ملنے والوں کو خطوط لکھتے اور ان کے خطوں کے جوابات دے کر بڑھاپے کو بہلاتے رہے۔
اپنے ایک عزیز شاگرد فشی ہر گوپال قفّہ کو خط میں لکھتے ہیں:-

”میں اس تہائی میں صرف خطوں کے سہارے جیتا ہوں۔ یعنی جس کا
خط آیا میں نے جانا وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن
ایسا نہیں ہوتا جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہیں آ رہتے ہوں۔
بلکہ ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو دو بار خط کا اہرکارہ خط لاتا ہے۔ ایک دو

صبح کو اور ایک دو شام کو۔ میری دل لگی ہو جاتی ہے۔ دن ان کے
پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے۔“

میرسر فر از حسین کے نام ایک خط میں اپنے بڑے چاہے کا سرسری ذکر یوں کیا ہے:-
”تمہارے دستخطی خط آئے میرے ساتھ وہ کیا جو بوائے پراہن نے
یعقوب کے ساتھ کیا۔ یہاں یہ ہم تم بوڑھے ہیں یا جوان ہیں تو ان
ہیں یا ناتواں ہیں بڑے بیش قیمت ہیں یعنی بہر حال قیمتی ہیں۔
کوئی جلائے نہا کہتا ہے:

یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ

یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ“

وہ خط میں اپنے مصائب کا ذکر بھی بڑے مزاح انداز میں کرتے:-

”آپ اپنا تماشا کی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہونا ہوں یعنی
میں نے اپنے کو غیر تصور کیا ہے جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ لو
غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور
قاری دان ہوں آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب
قرضداروں کو جواب دے“

دہلی کی بربادی کا حال لکھتے لکھتے مرزا غالب نے ایک خط میں اپنی آخری عمر کے ناسازگار
حالات کا احساس بھی دلایا ہے:

”بھائی کیا پوچھتے ہو؟ کیا نکلوں؟ دلی کی ہستی منحصر کنی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ چاندنی چوک ہر روز مجمع بازار مسجد جامع کا ہر ہفتے میر جمنائیل کی ہر سال میلہ بھول والوں کا یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا“

اپنے بڑھاپے اور ضعف سے متعلق غالب نے متعدد اشعار کہے ہیں۔ اس قبیل کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

مضحل ہو گئے قوی غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

اے پرتو خورشید جہاناب ادھر بھی
سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

ہو فشار ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

مر دیا ضعف نے عاجز غالب
تنگ بڑی ہے جراتی میری

ضعف سے نقش چنے مور ہے طوق گردن
ترے کوچہ سے کہاں طاقِ رم ہے ہم کو

رو میں ہے رخسارِ عمر کہاں دیکھیے تھے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگِ اختلاط کا
ہے دل پہ بارِ نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

مجتنبِ بخشِ عداوتِ اغیار اک طرف
یاں دل میں ضعف سے ہوں یار بھی نہیں

ستر برس کی عمر میں یہ داغِ جاں گداز
جس نے جلا کے راکھ مجھے کر دیا تمام

یاد تھیں ہم کو بھی رنگِ رنگِ بزمِ آرایاں
لیکن اب نقش و نگار طاقِ نسیاں ہو گئیں

شب وصال میں سوس گیا ہے بن تکیہ
ہوا ہے موجب آرام جان و تن تکیہ

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگ ناگہانی اور ہے

قصیدے کے چند اشعار

اور پھر اب کہ ضعف بھری ہے
ہو گیا ہوں نزار و زار و حزیں
بھری و نیستی خدا کی پناہ
دست خالی و خاطر غمگین

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھئے بس اب کہ لذت خواب سحرگئی
مارا زمانہ نے اسد اللہ خاں جسہیں
وہ دلو لے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

قطعه

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالب
دل رک کر بند ہو گیا ہے غالب
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سوتا سو گند ہو گیا ہے غالب

ہم نے دیکھا کہ غالب کو بڑھاپے اور عسرت نے کس کس طرح سے عاجز کئے رکھا۔ منجملہ تمام مصائب کے آخری عمر میں مرزا کی نظر اس قدر کمزور ہوئی کہ مطالعہ ترک کر دیا انگوٹیاں کا مرض بھی اس درجہ ہوا کہ انہیں اپنے اشعار تک یاد نہ رہے۔ کہتے ہیں ایسی حالت میں انکو اپنا ایک شعر اور کسی دوسرے شعر کا ایک مصرعہ ہی یاد رہا۔ جسے وہ اکثر گنگناتے رہتے تھے۔ شعر یہ ہے:-

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

موازنہ

خوشحال اور غالب پر بڑھاپا کن کن حالات میں آیا اور ان دونوں نے زندگی کے اس مرحلہ کو کیسے گذارا۔ اوپر کی سطور میں ہمیں ان سوالوں کے جواب مل چکے ہیں۔ اسی لیے ان

دونوں شخصیات کے بڑھاپے کا موازنہ کرتے ہوئے ہم صاف طور پر محسوس کر سکتے ہیں کہ ناز و نعم میں پلنے والے ان دونوں انسانوں نے بڑھاپے کے دوران اپنے آپ کو نامساعد حالات میں پایا۔ جسمانی کمزوری اور ضعف سے دونوں کو واسطہ پڑا۔ دونوں نے ستر سال سے زیادہ کی عمر پائی۔ اور دونوں میں اپنے اپنے حالات کے مطابق ایک نامہوار اور تکلیف دہ زندگی گزارنے کا سلیقہ اور ہمت موجود رہے۔ خوشحال کے جواں سال بیٹے نظام کی موت ہو یا غالب کے چہیتے بھتیجے عارف کی بے وقت موت۔ قحط کے دوران خوشحال کے عزیز واقارب کی اموات ہوں یا جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کی حشر سامانیوں کے درمیان غالب کے بھائی مرزا یوسف کی انہماکیوں کی موت۔ آخری عمر میں خوشحال کی نظر کی کمزوری ہو یا غالب کو لاحق نسیاں کا مرض ڈائزیسیوں کے سفید ہونے سے لنگر دانوں کے گرنے تک ان دونوں شخصیات کے حالات میں ہمیں ایک قسم کی موافقت نظر آتی ہے۔

ہاں البتہ دو باتیں ایسی بھی ہیں جن میں ان دونوں کے حالات کا اختلاف صاف دکھائی دیتا ہے۔ جہاں غالب کو خدا نے اولاد کے فتنے اور نافرمانی سے بچائے رکھا وہاں خوشحال کی اولاد نے اُسکی آخری عمر میں اسے لا انتہا تکالیف اور مصائب سے دوچار رکھا۔ دوسرا اختلاف ان دونوں شخصیتوں کے مغلیہ دربار کے ساتھ وفاداری سے متعلق ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں غالب مغلیہ دربار سے منسلک ہو کر شاہی تختہ اوپر آ کر تک انحصار کرتے رہے وہاں خوشحال نے مغلیہ دربار کی عطا کی ہوئی سرداری کو لات مار کر آخر دم تک مغلوں کے خلاف علم بغاوت بلند کئے رکھا۔

باب دوم

فن

خوشحال وغالب کا نظریہ شعر

اگر کوئی مجھ سے شعر کی تعریف پوچھے تو میں میاں سید رسول رسا کی کتاب ارمغان خوشحال کے صفحہ ۱۶۰ پر شعر کی دی گئی یہ تعریف بیان کر دوں:

”شعر کی صحیح تعریف یہی ہے کہ اگر ایک انسان اپنے احساسات

جذبات و عواطف کا اظہار اس طور کرے کہ اسکو سننے یا پڑھنے والے

کے احساسات بھی ویسے ہی ابھریں جیسا کہ شاعر کے احساسات

شاعرانہ مشاہدے یا تجربے کے وقت ابھرے تھے۔ تو ایسے کلام کو

شعر کہیں گے چاہے اس میں وزن اور قافیہ ہو یا نہ ہو“

غالب نے شعر و سخن کی تعریف یوں کی تھی:

”سخن ایک معشوقہ پری چمک رہا ہے۔ تقطیع شعر اس کا لباس اور مضامین

اس کا زیور ہیں“

لیکن غالب سے پہلے اور خوشحال کے بعد خوشحال ہی کے پڑپوتے اور پشتو زبان کے

صاحب دیوان شاعر کاظم خان شیدا جورا پور میں رہائش رکھتے تھے۔ اپنے اشعار میں شعر و

سخن کی تعریف یوں کرتے ہیں:

مضمون دشعر لکھ پیکر دی
 نہاںستہ الفاظ نہی رخت و زیور دی
 ور لہ ضرور دی دا دواہرہ خیزہ
 پیکر کہ ہر خو دلربا خیزہ

ترجمہ:- مضمون شعر کا پیکر ہے اور خوبصورت الفاظ اسکے لباس اور زیور ہیں۔ یہ دونوں چیزیں پیکر کے لیے ضروری ہیں چاہے پیکر کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو۔

”جیسا کہ معلوم ہے شاعری مضمون اور اسلوب بیان کا مجموعہ ہے۔ انہی کی کمی بیشی اور پستی و بلندی سے شعر اور شاعر کا درجہ متعین ہوتا ہے کوئی جذبہ تجرید یا واقعہ جس قدر صحیح اور سچا ہو اتنا ہی مضمون اچھا اور خوب ہوگا۔ لیکن اس کو بیان کرنے کے لیے اس کی نوعیت اور شدت کے اعتبار سے سادگی یا رنگینی زور اور قوت، تخیل کی مدد، تشبیہات و استعارات وغیرہ کی ضرورت ہوگی۔ اسی لئے اسلوب بیان شاعری میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ الفاظ کا انتخاب ان میں حسین ترتیب اور ان کا برہم استعمال نہ ہو تو مضمون اپنے درجے سے گر جاتا ہے۔ لیکن نہ تو سب شاعر ایک درجے کے ہوتے ہیں اور نہ ہر شاعر کے تمام اشعار ایک جیسے ہوتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ مذکورہ شرائط اور خصوصیات میں کمی بیشی یا پستی و بلندی ہوتی رہتی ہے (۱)۔“

کلیم الدین احمد کے مطابق :-

”شاعر دو طرح کے ہوتے ہیں کچھ شاعر تو نئی راہیں نکالتے ہیں۔ پرانے رستوں پر چلنا وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں پرانی روش سے ان کا جی گھبراتا ہے اور وہ نئی روش ایجاد کرتے ہیں کچھ شاعر ایسے بھی ہوتے ہیں جو کسی نئی راہ کی ضرورت نہیں سمجھتے جو جانے ہوئے راستہ پر چلتے ہیں اسی میں کشادگی پیدا کرتے ہیں یا اپنی چال میں کچھ نئی شان اور بانگین پیدا کرتے ہیں۔ غالب اسی قسم کے شاعر تھے“

(کلیم الدین احمد۔ ”غالب کا آرٹ“)

خوشحال اس لحاظ سے نئی راہیں نکالنے والے شاعر تھے۔ انہوں نے پشتو کی پرانی شاعری کو چھوڑ کر نئی پشتو شاعری کی بنیاد رکھی۔ جب یہ صورتحال ہو تو ظاہر ہے خوشحال اور غالب کا نظریہ شعر بھی ایک دوسرے سے چندے مختلف ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں غالب کے نظریہ شعر کا ذکر کرتے ہوئے انکے شعر کے محاسن یعنی روایت، الہام، معنویت اور ندرت خیال وغیرہ کے گرد گھوم کر جائزہ لیا جاتا ہے۔ وہاں خوشحال کے ہاں بنیادی طور پر شعر کو ایک ہنر کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل آگے آتی ہے۔

غالب کا نظریہ شعر

غالب کا نظریہ شعر و شاعری جانتے ہوئے شعراء و ادباء نے اکثر الہامی اور وجدانی کیفیت

کا ذکر کیا ہے۔ خود غالب بھی الہام کو مانتے تھے۔ ان کا یہ مشہور شعر اسی احساس کی ترجمانی کرتا ہے:-

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں

غالب صبرِ خامہ نوائے سروش ہے

دوسری بات جو غالب کے ہاں انکے نظریہ شعر کے سلسلے میں دیکھی گئی ہے وہ انکار روایت سے کٹتے ہوئے بھی اس کا بہر حال احترام لازم رکھنا ہے۔ وہ قافیہ پیکر کے قائل نہیں تھے۔ اپنے دوست ہر گوپال تفتہ کو ایک خط میں یوں لکھا ہے:-

”لغت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اس کے قوانین پیش رکھ

لئے ہوں۔ صرف بحر اور ردیف قافیہ دیکھ لیا اور اس زمین میں غزل

قصیدہ لکھنے لگا۔۔۔ بھائی شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیکر نہیں۔“

ایک اور بات جو غالب کے نظریہ شعر سے متعلق کہی جاتی ہے۔ وہ معنی آفرینی اور معنویت کے تناظر میں کہی جاتی ہے کہ جب تک غالب نے ظہوری اور بیدل کا راستہ اختیار کئے رکھا معنی آفرینی اور بال کی کمال نکالنے کو شاعری خیال کرتے تھے۔ جب یہ رنگ اٹل دلی کو پسند نہ آیا تو مجبوراً انکو اپنی روش بدل کر معنویت کو اپنی شاعری میں جگہ دینی پڑی ساتھ میں وہ میر کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کے اشعار میں جذبہ اور احساس کی شدت نے جگہ بنائی۔

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول نابھ

آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

چوتھی بات جو غالب کے ہاں پائی جاتی ہے وہ رمز و کنایہ کا استعمال ہے۔ اس سے انکے اشعار میں اچھوتا پن پیدا ہوا۔ غالب نے علامتوں کا استعمال کر کے اس اچھوتے پن کو اور زیادہ سنوارا۔ اور اپنے کلام کو ”گنجینہ معنی کا طلسم“ گردانا۔

غالب الفاظ اور انکے استعمال کے اسلوب کو بھی شعر کی خوبی و جفا کے لئے ضروری سمجھتے تھے مگر انکے شعر میں ندرت خیال کو الفاظ سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ ساتھ کے ساتھ وہ شعر کی ظاہری ہیئت سے بھی غافل نہ تھے۔ اسماعیل حسن خان کے مطابق انہیں اپنے انداز بیان پر فخر تھا:-

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیان اور

موضوعات میں تنوع غالب کی شاعری کی جان ہے۔ گو اس تنوع سے انکی شاعری میں وسعت تو آتی ہے مگر میر جیسی گہرائی نہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی کے نزدیک غالب کا نظریہ شعر ان عناصر سے بنتا ہے:

۲۔ معنی و بیان

۱۔ روایت

۴۔ غم زمانہ (زمانے کی ناقدری کا غم)

۳۔ الہام

۶۔ جذبے کی صداقت

۵۔ اثر پذیری

ے۔ لفظوں کی تراش خراش

(ڈاکٹر وحید قریشی "غالب کا نظریہ شعر")

غالب کے شعر کی ایک اور خصوصیت کی طرف کلیم الدین احمد نے یوں اشارہ کیا ہے:

"غالب کو شش کرتے ہیں کہ ایک شعر میں مختلف خیالات، جذبات یا ایک خیال، ایک ہی جذبہ کے مختلف پہلوؤں کو سمیٹ لائیں۔ اس ارادے میں جامعیت کے ساتھ تو کامیابی ممکن نہیں لیکن وہ ایک ترکیب استعمال کرتے ہیں جس سے مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ چند خیالات تو پوری طرح ایک شعر میں نظم نہیں ہو سکتے لیکن غالب ایک بات کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ دوسری باتوں کو طرف توجہ جا پڑتی ہے اور شعر پڑھ کر ذہن ان باتوں کی جستجو میں لگ جاتا ہے۔ گویا محشرستان کا دروازہ کھل جاتا ہے اور غالب کا شعر اس دروازہ کی کلید ہے۔"

(کلیم الدین احمد "غالب کا آرٹ")

غالب کے نزدیک اچھے اشعار میں کون سی خوبیاں ہوں۔ اسطیعیل حسن خان نے انہیں یوں سمیٹا ہے:

"مختصر یہ کہ غالب کے نزدیک اچھے اشعار میں لفظاً سلاست و متانت الفاظ، پاکیزگی و صفائی، ندرت و دل پرندی، بندش اور حسن

ہیاں، اور معنائی بلندی خیال، نزاکت معنی، عمدگی مضمون، جذبہ و فکر کا
 استخراج، تاثر، تازگی و طرنگی فکر، اور رمزی و ایمانی کیفیت ہونا چاہئے
 اسی کا نام ”شیواییائی“ ہے اور یہی خصوصیات کلام کا جوہر اور شاعری
 کی عظمت کی ضامن ہیں۔“

(اسماعیل حسن خان ”غالب کا نظریہ شعر“)

یہ تو ہوا غالب کا نظریہ شعر اب ہم خوشحال کی طرف چلتے ہیں جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے
 خوشحال کے ہاں شعر کو ایک ہنر سمجھ کر برتا گیا ہے۔ خوشحال نے شاعری میں نئی راہیں نکالی
 ہیں۔

خوشحال کا نظریہ شعر

خوشحال کے ہاں شعر و شاعری پر نثر اور نظم دونوں میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ ان کی نثری
 کتاب دستار نامہ میں ایک سردار یا بادشاہ کو صاحب دستار ہونے کے لیے میں خصائل اور
 میں ہنروں کا مالک ہونا چاہیے۔ جب ہم ان میں ہنروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو چوتھا ہنر
 شعر یا شاعری کا ہے۔ جس میں سردار یا بادشاہ کو طاق ہونا چاہیے۔ خوشحال نے اس چوتھے
 ہنر کے باب میں میں بڑے بڑے نکات گنوائے ہیں آئیے دیکھیں:-

۱۔ شعر کو نظم کرنے کا ہنر کس کمال میں شامل ہے۔

۲۔ شعر وہی کہہ سکتا ہے جس کو اللہ نے اسکا شعور دیا ہو۔

۳۔ شعر کہتے وقت شاعر کے اندر خدا خود دخول کئے ہوئے ہوتا ہے۔

۴۔ فنون اور صنعتیں محنت سے حاصل ہوتی ہیں اگر کوئی انسان چاہے کتنا ہی علم حاصل کر لے یا اے صنائع و بدائع پر عبور ہو۔ وہ شعر نہیں کہہ سکے گا جب تک اسکی جہلت میں شعر نظم کرنا موجود نہ ہو۔

۵۔ دوسری طرف اگر اسکی طبیعت میں شعر کہنے کی اہلیت ہے تو چاہیے کہ وہ صنائع و بدائع بھی سب کے سب سیکھ ڈالے۔ علم بیان اور علم معانی بھی ضروری ہیں۔

۶۔ ان خوبصورتیوں کے علاوہ شعر میں درد اور محبت کا استعمال ہونا چاہیے۔

۷۔ دراصل لغت میں شعر کلام موزوں کو کہتے ہیں۔ شعر کے دونوں مصرعے قول میں برابر حروف میں پورے ہوں۔ عروض اور قافیے کا خیال رکھا جائے۔

۸۔ اگر غزل لکھو تو اس میں مستوق کے خط و خال، گل و گلزار، درد و فراق اور سوز و گداز کا ذکر ہو۔

۹۔ شعر کے ہنر کی ابتداء حکیم افلاطون سے ہوئی۔

۱۰۔ اس (شعر) خانہ بردار سبز گداز کی کیا تعریف کروں۔ یہ ایک بھڑکتی ہوئی آگ ہے جو اپنے سامنے آنے والی ہر چیز کو بحسم کر دیتی ہے۔ ایک ایسا مہمان ہے جو سب کچھ جڑ پ کر جاتا ہے۔

۱۱۔ شعر کو بھنا دشوار ہے تو اسکا کہنا مشکل۔

۱۲۔ شعر کہنا ہر ایک کے بس کا کام نہیں۔

۱۳۔ شعر وہ شخص کہے جو خند ان ہو۔

۱۴۔ ایک لفظ کی آراستگی کی خاطر انسان کی فیند حرام ہو جاتی ہے۔

۱۵۔ خدا اس کے بحر میں کسی کو گرفتار نہ کرے۔

۱۶۔ شعر کی خوبی جھوٹ میں ہے۔ اس میں جتنا جھوٹ بھرو گے اتنی ہی اس کی خوبی بڑھے گی۔

۱۷۔ عجیب بات یہ ہے کہ شعر میں جھوٹ کو سچ سمجھ کر اسکی تحسین کی جاتی ہے۔ شعر کی آرائش و زیبائش سب جھوٹ پر مبنی ہے اور ایسا کرنا بھی ایک ہنر ہے جو ہر ایک کے اختیار میں نہیں۔

۱۸۔ شعر ایک تیز آندھی کے مثل ہے۔ صرف بڑے درخت ہی اسکے سامنے ٹھہرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

۱۹۔ شعر کا عیب نکالنے والے جاسوس بہت ہیں۔ جو تمہارے اچھے سے اچھے شعر کو بھی فہمی میں اڑا دیتے ہیں۔

۲۰۔ شعروہی اچھا ہے جسے دانا کہے۔ وہ شعر نہیں جسے کوئی تک بند یا قافیہ بند نہ کہے۔

خوشحال نے شعر کے مطلق نثر میں جو کچھ کہا وہ اب ہمارے سامنے۔۔۔ انہوں نے نظم میں بھی شعر و شاعری کے متعلق اپنے نظریات و خیالات کا اظہار جا بجا کر چند ایک ایسے اشعار کا ترجمہ پیش خدمت ہے۔

”شعر کا اچھا استعمال سے دانائی اور علم و حکمت کو فروغ ملتا ہے“

”ہر بحر میں شمار کے حرف ہوتے ہیں۔ عروض میں وہ وہ کارستانی کی جاتی ہے کہ باتوں کی بے مثل دلہن سامنے لا بٹھاتے ہیں“

”دلہروں کی آنکھوں، ابروؤں، زلفوں اور خال کی تعریف میں غزلیں لکھی جاتی ہیں“

”اے خوشحال یہ تلمیں معافی کہاں سے پھولوں کی شکل میں میری بیاض پر اتر رہے ہیں“

”جب کسی شاعر کو نماز کے دوران شعر کی فکر لگ جاتی ہے تو وہ اعموذ کے ذال کو دال سے بدل ڈالتا ہے“

”دنیا میں شاعری سے زیادہ بری چیز کوئی نہیں۔ خدا کسی کو اس جنجال میں نہ ڈالے“

”شاعر کا دل ایک تو لوگوں سے جدا ہو جاتا ہے اور دوسرے فکر شعر میں مصروف رہتا ہے“

”کبھی کبھی تو شاعر کا چہرہ اتنا فکر مند نظر آتا ہے کہ لوگوں کو اسکے پاگل ہونے کا احتمال ہو جاتا ہے۔“

”رات کو دوسرے لوگ تو غیند کے مزے لے رہے ہوتے ہیں مگر شاعر اپنے پلنگ پر لیٹے ہونے کے باوجود غیند سے کوسوں دور رہتا ہے“

خوشحال نے نثر اور نظم میں شعر کے متعلق جو کچھ کہا۔ اس سے معلوم ہوا کہ شعر کہنا

ایک شے ہے۔ اور صرف وہی شخص یہ ہنر حاصل کر سکتا ہے۔ جسے اللہ نے اس کا شعور دیا ہو۔

ایک نہایت حکیمانہ بات جو خوشحال نے اس سلسلے میں کی ہے۔ وہ یہ کہ شعر کے ہنر کی ابتداء

حکیم افلاطون سے ہوئی۔ ان کے اس کہنے کو لفظ نہیں لینا چاہیئے۔ اس بات کی توضیح میں

خوشحال نے اپنے کلام میں ایک جگہ کہا ہے کہ ”شعر گوئی قاسق اور بد عمل شخص کا کام نہیں ہے۔ اور نہ ہی یہ ہر صاحبِ دل و چشم کے بس کا رنگ ہے۔ شعر گوئی سالک اور مالک کا کام ہے یہ عاشق اور درویش کا کام ہے۔ اولیاء اور ابدالوں کا کام ہے۔ اس شاعر کی زبان پر چھالے نکل آئیں جو دنیا کے مال کی خاطر اشعار کہتا ہے۔“

خوشحال کا نظریہ شعر اسکی ایک غزل میں بکمال خوبی بیان کر دیا گیا ہے:

”جیسے تیر کے لیے ایک تیر انداز کی ضرورت ہوتی ہے

ایسے ہی شعر کے لیے ایک سحر کار درکار ہوتا ہے

دل کے ہاتھ میں ہمیشہ ”اوزان“ کی میزان ہوتی ہے

جس میں ایک حرف کی کمی بیشی بھی غماز بن جاتی ہے

کالے گھوڑے پر حقیقت کی ایسی دلہن کو سوار کرتے ہیں

جس نے اپنے گورے چہرے پر مجاز کا گھونگٹ ڈال رکھا ہے

سو چلوئے سوانداز اور سو غمزے

نگاہوں میں آنکھوں کی ادائیں جھلکتی ہوئی

صنعت کے کئی قسم کے زیور پہنے ہوئے

تغییبہ کے چند نچوڑے سے آراستہ

تجنیس کی پاگل چڑیاں پاؤں میں پہنے ہوئے

ترسیح کا لہبا چوڑا ہار گلے میں ڈالے

مضامین کی نزاکت کے غزے لئے ہوئے
 سر سے پاؤں تک تمام جسم سڈول
 اگر لظم میں کوئے اور گدھ کا ذکر کرو گے
 تو وہ بھی یوں جیسے باز دلوں کے شکار کی تاک میں پھرتا ہو۔
 جب ایک بات کر چکے تو ہوشیار وہ ہے
 جو اختصار سے کام لے
 جب خوشحال نے پشتو میں شعر کہنا شروع کیا
 تو پشتو زبان میں بڑی بڑی خوبیاں پیدا کر دیں۔“

خوشحال وغالب کی غزل

پشتو شاعری نے ۱۳۹ھ میں امیر کرد کی لکھی ہوئی ایک نظم سے اپنا سفر شروع کیا اس نظم کو اگر خالص پشتو نظم کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ اس میں عربی اور فارسی کا کوئی لفظ نہیں ملا۔ پشتو زبان کا دوسرا قابل ذکر شاعر اکبر زمیندار دی آٹھویں صدی ہجری میں گذرا ہے۔ گوکہ اس سے پہلے بھی امیر کرد کے بعد دوسرے پشتون شعراء کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن جب ہم پشتو شاعری میں مختلف سنگ ہائے میل کی بات کرتے ہیں۔ تو پشتو کا تحریری اور ادبی دور امیر کرد کی نظم سے شروع ہوا اور پشتو غزل کی ابتداء آٹھویں صدی ہجری میں اکبر زمیندار دی کے کلام سے ہوئی۔ پروفیسر شاہ جہان خان مصنف ”خوشحال خان خٹک بابائے پشتو شاعری“ اکبر زمیندار دی کی پہلی غزل کو سادہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق اکبر زمیندار دی کے اس کلام میں پر شکوہ الفاظ ’پرداز تخیل‘ تھپیہ اور استعارے بہت کم ہیں۔ اس کا عروضی رنگ ’گھرے خیالات اور پشتو کے ملی خصوصیات کا حامل ہے۔ پشتو شاعری کا اگلا در در دسویں صدی ہجری میں آیا۔ جسکے دوران پشتو ادب میں فارسی اور عربی الفاظ کا نفوذ ہوا۔ اور فارسی شاعری کے اصناف مثلاً غزل

رباعی وغیرہ کا رواج عام ہوا۔ فارسی اور عربی بحور و قوافی کا بھی رواج بڑھا۔ پشتو شاعری کے اس دور میں صوفیانہ کلام کی بھی ابتداء ہوئی۔ بابزیر انصاری نے اپنی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے پشتو نثر میں ایک مذہبی رسالہ خیر البیان کے نام سے لکھا۔ ان تعلیمات کو مرزا انصاری، مختص، ارزانی، قادر داد، دولت اور میاں داد نے اپنے کلام کے ذریعے پھیلایا۔ ان سب کے کلام پر زیادہ غلبہ صوفیانہ افکار کا تھا لیکن عشقیہ شاعری بھی ملتی ہے۔ آخر کار زمانے نے پلٹ کھایا۔ پشتو ادب کی قسمت جاگی اور گیارہویں صدی ہجری میں روشن و تاباں تعلیمات و افکار کو پیش کرنے کے لیے ایک مردانا و بیانا خوشحال خان خٹک کی صورت میں نمودار ہوا (۱)۔

اوجھڑا اردو شاعری کی ابتداء جنوبی ہندوستان کے خطہ دکن و بجاپور سے ہوئی۔ دلی دکنی کو اردو کے پہلے شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ شمالی ہندوستان میں لکھنؤ، دلی اور کسی حد تک لاہور اردو شاعری کے مراکز مانے جاتے ہیں۔ ان مراکز میں اردو غزل اور دوسری اصناف سخن کا سلسلہ میر تقی میر، سودا، انشا، جبرأت، مصحفی، ناسخ، ذوق اور مومن سے ہوتا ہوا غالب تک پہنچا اور اسکے بعد داغ اور اقبال نے اردو شاعری کو آگے بڑھایا۔ اصغر حسرت، فانی، جگر، فیض اور موجودہ دور میں احمد ندیم قاسمی، احمد فراز اور دوسرے کئی نامی شعراء نے اردو غزل کی آبیاری کی۔

تاریخ اردو شاعری کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو شاعری خصوصاً غزل گوئی کا پہلا دور غالب سے فوراً پہلے ختم ہوا۔ دوسرا اور جدید دور غالب کے ساتھ شروع ہو گیا۔ لیکن ان ادوار کا ذکر کرتے ہوئے ہمیں اردو غزل کی ہیئت اور معنویت پر نظر رکھنی ہوگی۔

”غزل کی ہیئت ایک بندھی نگلی ہیئت ہے۔ اس میں ہمارے کسی فنکار نے کوئی ترمیم نہیں کی ہے نہ اس میں ترمیم کی گنجائش ہی ہے کیونکہ غزل ایک مخصوص ہیئت ہی کا نام بھی ہے لیکن جہاں تک غزل کی معنویت کا تعلق ہے یہ فارسی کی دین قطعاً نہیں ہے۔ اس میں ہمارا اپنا کلچر اور اپنی ثقافت ملتی ہے۔ یہ ہمارے مخصوص انداز نظر اور قومی عروج و زوال کی جملہ منزلوں کی نشاندہی کرتی ہے ہمارے تمدن کی شیرینی اور ہمارے عقیدہ و عمل کی تصویریں اردو غزل کے پردوں پر نقش ہیں۔“

(عطا محمد شغلہ ”غزل پر غالب کے احسانات“)

جب ہم غالب کے کلام کا تجزیہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ ان کے دور سے پہلے یعنی میرؔ سودا اور درد کے زمانے میں اردو غزل کی ہنت میں عشقیہ خیالات کی بھرمار ہوتی تھی۔ یہ دراصل فارسی غزل کی تقلید تھی۔ رہی ولی و کھنی کی بات تو اس کا کلام خالصتاً ہندوستانی تھا جس میں فارسی غزل کے اثرات نہیں ملتے۔

”غالب کی شاعری بقول اکرامؔ شروع سے آخر تک مک و اصلاح کی ایک مسلسل کوشش ہے ان کا فن نہ میرؔ کی طرح شخصی دائرے میں گردش کرتا ہے اور نہ مومنؔ کی طرح وہ اسالیب پر قدرت حاصل کر کے مطمئن ہوتے

ہیں۔ جاتی نے ان کے کلام کی چھ خوبیاں گنائی ہیں:

۱۔ جدت مضامین و طرقلی خیالات

۲۔ نادر تشبیہات، عام اور متہذل تشبیہوں سے گریز

۳۔ استعارے، کنائے اور تمثیل کا خوبصورت استعمال

۴۔ شوخی و ظرافت

۵۔ پہلو دار اشعار

۶۔ سیدھے سادھے خیالات اور معمولی اسالیب میں لفظی و معنوی تصرفات کر کے ان میں ندرت اور طرقلی پیدا کرنا۔“

(شجاع احمد زبیا، ”اردو غزل اور غالب“)

اب آئیے دیکھیں کہ خوشحال خان خٹک کے منہ پر شہود پر آنے کے بعد پشتو غزل پر کیا بیتی لیکن اس سے پہلے یہ بات اب صاف ہوتی ہوئی نظر آنے لگی ہے کہ اگر خوشحال پشتو شاعری کے پہلے ادوار کے آخری اور نئے دور کے پہلے سرے پر کھڑے ہیں۔ تو غالب اردو شاعری کے پرانے دور کے آخری اور نئے دور کے پہلے شاعر ہیں۔ اس طرح اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ قدرت نے ان دو بلند شخصیتوں کو اپنے اپنے ادب میں نمایاں کام کرنے کے لیے پیدا کیا تھا۔ اور آج یہ جو ہم پشتو اور اردو شاعری اور نثر کی جدید صورت دیکھ رہے ہیں۔ یہ ان ہی باکمال انسانوں کی بصیرت اور کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ پشتو زبان و ادب کی ترقی میں جو کاوشیں خوشحال خان خٹک نے کی ہیں۔ وہ ان

سے پہلے گزرے ہوئے تمام پشتو شعراء اور ادباء کی مشترکہ کاوشوں سے کئی گناہ زیادہ ہیں۔ اس حقیقت کی طرف خوشحال بابا نے خود یوں اشارہ کیا ہے۔ (۱)

”میں نے پشتو زبان کی نظم و نثر بلکہ تحریر کے ہر میدان میں بے پناہ کام کیا ہے لہذا اس زبان پر میرا براہِ حق بننا ہے۔ اس میں پہلے نہ کوئی کتاب تھی اور نہ کوئی رسم الخط یہ تو میں نے اس زبان میں کئی کتابیں تصنیف کر ڈالیں“

جناب پروفیسر شاہ جہان خان نے اپنی کتاب بابائے پشتو شاعری کے صفحہ ۲۷ پر جناب میر عبد الصمد کا یہ اقتباس تحریر کیا ہے (۲) :-

”خوشحال خان ایک متنوع شاعر تھا۔ اس سے پہلے پشتو شاعری میں غزل کے سوا دوسری اصناف بہت کم تھیں اور خود غزل کا دامن بھی بہت تنگ اور محدود تھا۔ اس نے غزل کا مقام بلند اور وسیع کرنے کے ساتھ ساتھ رباعی، قطعہ، مثنوی، مخمس، مسدس، الغرض فارسی شاعری کی تمام اصناف کو پشتو شاعری میں داخل کر کے اسے درجہ کمال تک پہنچایا۔ آگے چلکر لکھتے ہیں:

”خوشحال خان کی شاعری کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ محرک اور

(۱) بابائے پشتو شاعری، ص ۲۶

(۲) خوشحال و اقبال، ص ۸۶ تا ۸۸

محرک ہے اس میں قوت اور زور بیاں ہے جس سے جذبات میں بلندی، خیالات میں وسعت اور عزائم میں رفعت پیدا ہوتی ہے۔ پشتو شعراء میں اولیت خوشحال ہی کو حاصل ہے کہ اس نے حسن و عشق، وصال و فراق، اور گل بلبل کے تذکروں کے ساتھ ساتھ معاشرتی، تمدنی، اخلاقی و سیاسی حتیٰ کہ طب و صحت اور فلسفہ و حکمت پر بھی دل کھول کر طبع آزمائی کی۔

معلوم ہوا کہ خوشحال اس وقت پشتو زبان کے ادبی افق پر ظاہر ہوئے جب یہ ادب محدود تھا خوشحال نے اسے توسیع دی اور ادبی تنوع کے ذریعے اس میں ایک نئی زندگی پھونک ڈالی۔ پشتو زبان کے معروف ادیب جناب فضل حق شیدا کا خوشحال کی شاعری کے متعلق یہ خیال ہے:-

”خوشحال خان کی شاعری میں استعداد جامعیت اور تنوع ہے، اسنے موضوعات، اسالیب بیان اور اصنافِ سخن میں صرف ایک قادر الکلام ادیب ہی ان کے مختلف پہلوؤں کا صحیح جائزہ لے سکتا ہے۔ اس کے حسن اظہار، زور بیاں، علوِ تخیل، رنگینیوں اور باریکیوں سے وہی شخص لطف اندوز ہو سکتا ہے جو خود باریک بین اور صاحب ذوق سلیم ہو۔ خوشحال خان پشتو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے۔ وہ خیال و تصور کے عالم بالا سے حقیقی دنیا میں نیچے اتر آتا ہے۔ اس کے

تخلی حقائق کا مزا چکھتا ہے اور اپنے تاثرات سیدھے سادھے الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ اس کی شاعری میں جان ہے جوش اور دلولہ ہے زندگی ہے اور سب سے بڑھکر ایک حیات افروز پیغام ہے (۱)۔

آئیے اب غالب کی طرف چلتے ہیں۔ اور اردو غزل کے لیے انکی خدمات کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس ضمن میں ہمیں اپنی بات دوبارہ سے اردو غزل کی ہیئت سے شروع کرنی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حسن و عشق کا ایک محدود علاقہ تھا۔ جس کے اندر رہ کر تقریباً تمام تر مضامین کو غزل پر آرمایا جا چکا تھا۔ غالب سے پہلے غزل مخصوص موضوعات کے گرد گھومتی تھی۔ یعنی ہجر وصال، آہ و نالے، دقا، بے وفائی، امید، ناامیدی، کوچہ، یار، محبوب کے جسم کے مختلف پرکشش حصوں یعنی زلف، رخسار، لب، دندان، مژگان، بھونٹیں، خط اور دوسرے اس قسم کے خرد و خیال۔ نگشت، بلبل، صید و صیادان کے علاوہ تھے۔ ان سب کا تعلق غزل کی ہیئت سے ہے جہاں تک معنویت کا سوال ہے تو اس دور میں غزل کی معنویت پر کچھ زیادہ زور نہ دیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ غالب تک آتے آتے غزل اپنی معنویت کھو چکی تھی۔ اسکی صرف ساخت ہی رہ گئی تھی۔ مزید برآں ہیئت و ساخت سے متعلق مضامین کے بے دریغ استعمال کی وجہ سے غزل میں استعمال کے لیے کوئی نیا مضمون کہنے کے لیے نہیں رہ گیا تھا۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ غزل میں معنویت لانے کے ساتھ ساتھ عشق و حسن کے دائرے سے نکل کر

(۱) بابائے پشتو شاعری میں علامہ از خوشحال خان خٹک تصنیف دوست محمد کابل۔

معاشرے کو ورطیش و دوسرے مسائل کو بھی غزل کے موضوعات میں شامل کیا جاتا۔ یہی وہ وقت ہے جب غالب نے غزل کی نگہری بنانے کا بیڑہ اٹھایا۔ یہاں ہم جناب شجاع احمد زبیا کے خیالات، غالب اور اردو غزل سے متعلق پیش کرنا چاہیں گے کہ اس سے بہتر تبصرہ اس مضمون پر ہماری نظر سے آج تک نہیں گذرا۔

”حسن و عشق کے مجدد و دائرے میں رہ کر جدت مضامین و اسلوب کے جو جو ہر دکھائے جانے ممکن تھے وہ غالب کے وقت تک ظاہر ہو چکے تھے۔ اب ایک ہی صورت غزل کو زندہ رکھنے کی باقی تھی کہ اس کے موضوع کو وسعت بخشی جائے اسے حسن و عشق کے تنگ دائرے سے جس میں یہ اب تک قید تھی باہر نکالا جائے اور محبت کے علاوہ دیگر احساسات و جذبات انسانی کے لئے بھی اس میں گنجائش نکالی جائے۔ چنانچہ غالب نے اپنی زبردست انفرادیت پسندی کے ہتھیار سے مسلح ہو کر غزل کی مفروضہ چہار دیواری کو پاش پاش کر دیا۔ جس کی بت بنا کر پوجا کی جا رہی تھی۔ اس نے غزل کو کائنات و حیات کے بنیادی مسائل اور انسان کی فنی و جذباتی زندگی کی عکاسی کے لئے نہایت کامیابی کے ساتھ استعمال کیا۔ اگرچہ غالب اور وہ غزل کے ارتقائی الفاظ کا منطقی نتیجہ ہے مگر اس دور کے شاعروں میں قدرت نے فطرت کا یہ تاج اسی کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ چنانچہ اس نے غزل کے امکانات کا جائزہ لیا۔ شروع

شروع میں اپنی طبع معنی آفرینی کے کمال کو آزما یا مگر مظلوم ہوا کہ بیدار اور صائب کا رنگ اس سانچے پر نہیں کھپتا۔ چنانچہ اس نے غم عشق کو غم روزگار بنا دیا۔ جذبے میں فکر کی آمیزش کی اور غزل کو جواب تک دل کے پھسولے پھوڑنے یا تنفس طبع کے کام آتی تھی۔ ابدی اور ازلی حقیقتوں کا ترجمان بنایا۔

(شجاع احمد زبیا، "اردو غزل اور غالب")

چونکہ یہ بحث صرف خوشحال و غالب کی غزل گوئی سے متعلق ہے۔ اس لیے ان نابہ شعراء کی شاعری کے دوسرے اصناف پر بحث نہیں کی جا رہی۔ خلاصہ اس تمام بحث کا یہ کہ خوشحال و غالب اپنی اپنی زبان و ادب کے جن ادوار میں منظر پر آئے۔ وہ تقریباً ایک جیسے ہیں۔ جہاں غالب کو اپنی شاعری میں فارسی کی آمیزش کم کرنی پڑی وہاں خوشحال نے فارسی غزل کی ہیئت کا مطالعہ و مشاہدہ کر کے اسے پشتو غزل کی ہیئت میں آمیز کیا اور اسکے علاوہ پشتو غزل کو گھسے پٹے موضوعات کے چنگل سے نکال کر غم و دوراں کے موضوعات بھی آزمائے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہمارے ان ہردو شعراء نے حسن و عشق کو غزل کے لئے بالکل متروک کر دیا ہے۔ ان کے کلام میں غم جاناں کے علاوہ غم و دوراں کے موضوعات بکثرت پائے جاتے ہیں۔ مثلاً خوشحال کی غزلوں کے موضوعات میں حمد، شکایت، شاد خدا کی ستائی، قناعت، اپنے کلام کی تعریف، زاہد، شراب، سچائی، جھوٹ، شکر، حکمران کے ستم زدہ عوام، ریاست و حکومت، انسانیت، حیوانیت، اچھا عمل، نیک، غیرت، طنز، تنبیہ، فلسفہ، حکمت

تصوف سائنس، بدحایا، دولت، عبادت، ہمت، مظاہر قدرت، کار حکومت، بخت، امید و بیم، مذہب، تعلیم و تعلم، تقدیر، جنگ، ہندوستان میں قید کی یادیں، ہندی عورتیں، آفریدی حسینائیں، وطن کی یاد، مغلوں کی بھوا اتفاق، خوشحال سپاہی، جیونئی، اللہ بادشاہ، توبہ، عاجزی، دعا، فلک، فتنے، دستار کا مرتبہ، شہباز شیر، حج، نادان کی دوستی، دولت کی خوبیاں، شکار، نعت رسول مقبول، موت، مردانگی کے اصول، خوشحال کے اساتذہ، اطاعت، حقیقی، قلم، قضا و قدر، غم، اپنوں کی دشمنی، ہند ایک دوزخ ہے، اچھی عورت کی خوبیاں، اسحق کی دوستی، خود اعتصالی، زہر حیات، ہند کی تعریف، صحبت کا اثر اور سینکڑوں دوسرے موضوعات شامل ہیں۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ خوشحال بابا نے غم جانان کے موضوعات اپنی غزل میں برتے ہی نہیں مثال کے طور پر چند عشقی اور رومانی موضوعات یہ ہیں: عورت، جور و ستم، عاشق، معشوق، محبوب کی دید، رقیب و رقابت، پیچیدہ ارزائیں، گل لالہ اور رخسار، محبوب کی کالی آنکھوں کی قسم، بال سے باریک پتلی کمر کی قسم، قاصد، پیامبر، گل و بلبل، دُور غم، آگ اور پروانہ، خال کی خاطر بخارا بخشا، غلاب، مڑگاں، بے خودی، فرزا لگی، دیوانگی، خوبصورتی، حسن پرستی، کوچہ، یازناک میں تھنی، گورا چہرہ، گلزار میں پھول، مطرب، چنگ و نئے بہار، شکر لب، سیاہ خال اور وصال و جہراں۔ جہاں تک غزل کی ہیئت کا تعلق ہے تو خوشحال نے اس میں بھی تجربے کئے ہیں۔ مثلاً ایک پشتو غزل میں قافیہ ردیف کے طور پر اپنے دور کے اردو کے الفاظ استعمال کئے ہیں:-

گلہ گلہ نہی لہ حالہ خبر اخلہ

بیچارہ خوشحال خیل زرہ در پس ہاربا

ترجمہ:- کبھی کبھی اسکی حالت کی خبر لیتے رہو کہ بیچارہ خوشحال اپنا دل تیرے ہاتھوں ہار چکا ہے۔

دوسری خاص تہذیبی جو خوشحال کی دو ایک غزلوں میں ملتی ہے وہ عاشق اور معشوق کا آپس میں سوال و جواب کے ذریعے اپنے اپنے دلوں کا حال کہنا اور گلے شکوے کرنا ہے۔ تیسری خوبی جو خوشحال کی بعض غزلوں میں دیکھی گئی ہے اسے ”قسمیہ شاعری“ کا نام دیا جاسکتا ہے۔ تفصیل آگے آرہی ہے۔ لیکن سب سے پہلے کلیات خوشحال سے ایک نمائندہ غزل نذر قارئین ہے۔ اس غزل کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے صنفِ دوزن اور قافیہ ردیف کی تکرار نے غزل کی لکھ دو آتھ بٹا دیا ہے:

زہ ہم چیرے فرزانه وم ، فرزانه یم لاتراوس
تل بی خودہ دیوانہ وم ، دیوانہ یم لاتراوس
جدائی نشہ وصال دے غمی بعد ہم خیال دے
لہ ہفہ چہ ہمخانہ وم ، ہمخانہ یم لاتراوس
چہ راغلی بہ جہان یم خبر شوے بہ خیل ثخان یم
درازو نو خزانہ وم ، خزانہ یم لاتراوس

چہی د مخ پلؤ تہی واشویو مشال وہ چہی نماشو
 ہغہ دم پری پروانہ وم ' پروانہ یم لا تراوس
 ہغہ شان لہ خیلہ یارہ بی وکیلہ بی ربارہ
 زہ خوشحال چہی بیگانہ وم ' بیگانہ یم لا تراوس
 ترجمہ:- میں بھی کبھی فرزند تھا تو ابھی تک فرزند ہوں

ہمیشہ سے بے خود پروانہ تھا تو ابھی تک بے خود پروانہ ہوں
 یہ جدائی نہیں وصال ہے اس سے دوری بس ایک خیال ہے
 میں جیسا اس سے ہم خانہ تھا تو ابھی تک ہم خانہ ہوں
 جب سے اس دنیا میں آیا ہوں اور اپنے آپ سے باخبر ہوا ہوں
 میں جیسا رازوں کا خزانہ تھا تو ابھی تک وہی خزانہ ہوں
 جب اسکے چہرے کا گھوٹ کھلا تو اک مشعل تھی جو نظر آئی
 میں اسی دم اس کا پروانہ بن گیا تھا تو ابھی تک وہی پروانہ ہوں
 اپنے دوست سے بغیر وکیل اور بغیر قاصد کے
 میں خوشحال جیسے پہلے بیگانہ تھا ابھی تک بیگانہ ہوں

اب ہم ان تجربات کا ذکر کریں گے جو خوشحال نے غزل کی بہت کے سلسلے میں کئے۔ ایک
 ایسی غزل کے چند اشعار پیش خدمت ہیں جس میں عاشق اور محبوبہ کے درمیان سوال
 جواب کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے:

وے مہی کہ تھہ درشم ستا تر خایہ خولہ بہ را کر
وے نہی سکے ہزار سرہ لہری چہی دا وینا کر
وے مہی چہی کوم توکی بہ تا وتہ نزدی شم
وے نہی چہی کہ سر لہ تنہ بہی تیغہ جدا کر
وے مہی چہی ہر گورہ کبریا شوی خدائے دی وینی
وے نہی چہی کہ کبر کرم ستا خہ دی چہی غوغا کر
وے مہی چہی د سپینہی زیبا خولہ عاشق دی زہ یم
وے نہی چہی خدائے خہ دا عاشقی ہم ویریا کر
وے مہی چہی لہ نتہی دی چارگل پہ پوزہ زیب کا
وے نہی دا خبری کرہ ہالہ کہ چاپہ تا کر
وے مہی کہ زہ ستا پہ کوے کنہی ورم ستا رضا دہ
وے نہی کشکی خلاص لہ درد سرہ سپہی زما کر
وے مہی چہی پہ خورنگہ خوشحال پہ تا مین دے
وے نہی د ختک سہری د مینہی خہ وینا کر

ترجمہ:- میں نے کہا ”میں تمہارے پاس آ جاؤں مجھے بوسہ دوگی؟“

کہا ”کیا ایک ہزار سرہ رکھتے ہو جو ایسا کہہ رہے ہو؟“

میں نے کہا ”میں کس صورت تمہارے قریب آ سکوں گا؟“

کہا ”اگر بغیر تیغ کے اپنے سر کو اپنے تن سے جدا کر سکو تو“

میں نے کہا ”دیکھو تم مغرور ہو گئی ہو خدا تو دیکھنے والا ہے“
 کہا ”میں اگر غرور کرتی ہوں تو تمہیں کیا تم کیوں شور مچاتے ہو“
 میں نے کہا ”میں تمہارے اس گورے چہرے کا عاشق ہوں“
 کہا ”خدا نے عاشقی بھی کیا سہل کر دی ہے“
 میں نے کہا ”تمہاری ناک میں تھنی سے زیادہ لونگ بھتی ہے“
 کہا ”اپنی رائے اس وقت دو جب کوئی تم سے پوچھے“
 میں نے کہا ”اگر میں تمہارے کوچے میں مرجاؤں تو تمہاری مرضی ہے“
 کہا ”کاش تم میرے کتوں کو اس دوسرے نجات دلاؤ“
 میں نے کہا ”خوشحال ہر طرح سے تم پر فدا ہے“
 کہا ”ایک ٹکڑے آدمی کی محبت کی کیا تعریفیں کرتے ہو“

قسمیہ شاعری میں خوشحال نے اپنی غزلوں میں دنیا جہان کی چیزوں اور لوگوں اور مظاہر قدرت کی قسمیں کھا کر غزل کے آخر میں اپنی محبوبہ کو اپنے دل کی بات بتائی ہے۔ غزل کی دنیا میں یہ ایک منفرد ہیئت ہے کم از کم پشتو غزل میں اس سے پہلے قسمیہ شاعری کی مثال نہیں ملتی۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے خوشحال کی ایسی ایک غزل پیش خدمت ہے جو چھوٹی بحر میں ہونے کی وجہ سے اور زیادہ اثر انگیز ہو گئی ہے۔ یاد رہے کہ یہ آج سے کم و بیش ساڑھے تین سو سال پہلے کہی گئی ہے۔

د بناد منو پہ خندا گو	د غمژنو پہ ژړا گو
د بهار په بنو گلونو	د ببلو په نوا گو
چې مکحولې دی له نازه	په هغه سترگو شہلا گو
چې نرۍ تر وینستہ ده	په هغه باریکہ ملا گو
چې راځی دیار له لوریہ	په هغه باد صبا گو
چې پیغام راوړی د وصل	د هغه قاصد په پا گو
په دا هومره سوگندونه	صد هزار غلہ بیا بیا گو
چې تر ځان په تا مټین یم	زه خوشحال خټک په تا گو

(جاری دی)

راته مه وایه په تا گو	چې په تانه گو په چا گو
ته زما د سترگو تور نې	په دا تورو سترگو ستا گو
مخ د ورځ زلفې د شپه دی	په سبا گو په سبا گو
تمنا لرم ستا دېره	په دا خپله تمنا گو
تر خندا پورې د هېڅ دی	لال او دُر ستا په خندا گو

پار خو ستا یم د چا نه یم

زه خوشحال ستا په لقا گو

ترجمہ - خوشدلوں کی ہنسی کی قسم غمزدوں کے رونے کی قسم

بہار کے اچھے پھولوں کی قسم اور بلبلوں کے نعروں کی قسم
 جن میں بڑے ناز سے سر مل گیا ہے ان شہلا آ نکھوں کی قسم
 جو بال سے زیادہ باریک ہے اس پتلی کمر کی قسم
 جو محبوبہ کی طرف سے آئے اس باد صبا کی قسم
 جو وصل کا پیغام لائے اس قاصد کے پاؤں کی قسم
 اور ان اتنی قسموں کے بعد بھی صد ہزار بار قسم اور پھر قسم
 کہ میں اپنی جان سے زیادہ تم پہ عاشق ہوں مجھے خوشحال خشک کو خود تیری ہی قسم
 (جاری ہے)

(تو کہتی ہے) یہ مت کہہ کہ تری قسم اچھا تیری قسم نہیں تو پھر کس کی قسم
 تو میری آنکھوں کی کالی پتلی (نور) ہے تیری ان کالی آنکھوں کی قسم
 تیرا چہرہ دن اور رات ہیں اس صبح کی قسم اس شام کی قسم
 مجھے تیری بڑی تمنا ہے اپنی اس تمنا ہی کی قسم
 تیری ہنسی کے آگے لعل اور موتی بیچ ہیں تیری ہنسی کی قسم
 میں تیرا ہی دوست ہوں اور کسی کا نہیں
 مجھے خوشحال کو تیری ملاقات کی قسم

یوں خوشحال نے غزل کی بہت کے ساتھ ساتھ انکی معنویت کو بھی ملحوظ خاطر رکھا۔ نہ صرف
 یہ کہ انہوں نے غزل کو نئے مضامین سے روشناس کر کے جدید پشتو شاعری کی بنیاد رکھ دی

بلکہ اگلے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے غزل میں مضامین کے تنوع کے ذریعے اپنے مافی الضمیر کا اظہار بخوبی تمام کیا ہے ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ خوشحال نے فارسی زبان سے غزل کی روایات کو اس خوبی سے پشتو غزل میں سمویا کہ وہ فارسی غزل کی ہمسری کرنے لگی۔ خوشحال نے پشتو غزل کی ہیئت میں جو کامیاب تجربات کئے وہ اس پر مستزاد ہیں۔ اور یہ حیثیت مجموعی یہی پشتو غزل پر خوشحال کا احسان ہے۔

غالب کی غزل

اس مقام پر جب ہم غالب کی اردو غزل کو زندہ رکھنے کی کاوشوں کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی اردو غزل میں غم دور اس سے متعلق بے شمار مضامین شامل کر کے اسے معدوم ہونے سے بچایا:-

”غالب ہی کا فیضان ہے کہ غزل جو ہر نئے دور کے آغاز پر ظالم و بے درد نکلتے چینوں کے اعتراضات کا ہدف بنتی ہے گر کر سنبھالا لیتی ہے اور ہر بار مرنے سے بچ جاتی ہے۔ غالب نے اسے ایسی ڈگر پر ڈال دیا ہے کہ اگر اس نے زمانے کی ضروریات کے مطابق نئے نئے موضوعات کو قبول کرنے میں پس و پیش نہ کیا اور ہر عہد کے سانچے میں ذہنی چلی گئی تو یہ کبھی فنا نہیں ہو سکتی“

(شجاع احمد زبیا۔ ”اردو غزل اور غالب“)

ظاہر ہے غالب نے روایت سے ہٹ کر جو غزل کو غم دوراں کی ڈگر پر ڈالنے کی کوشش کی تو اس میں نئے موضوعات کو شامل کرنا پڑا۔ اردو غزل میں غالب نے جو بے شمار نئے موضوعات شامل کئے ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

تصوف، فلسفہ، مذہب، نفسیات، سائنس، موسمیات، کعبہ و جنت، جدیدیت، 'ضعفی'، موت، قیامت، مزاح، شوخی، آرزو خیالی، ہمت، وحشت، دھول و چپا، اہل کشف، پھیسے، زمزم و احرام، ستم ہائے روزگار، مسجد، عقل، گوہر اور بہت سے دوسرے۔ ان سب پر مستزاد غالب نے دو ایک غزلوں میں قانونی اصطلاحیں بھی استعمال کی ہیں۔ اور یہ انکے سفر کلکتہ کی بازگشت معلوم ہوتی ہیں۔

اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ بیعت، 'بحر'، مضمون، سادگی، پرکاری اور معنویت کے لحاظ سے دیوان غالب کی ایک نمائندہ غزل کی نشاندہی کروں تو میں غالب کی اس غزل پر صاف کہوں گا۔

غزل

یہ ہم جو بھر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
 کبھی صبا کو کبھی نامہ برد کو دیکھتے ہیں
 وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
 کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے دھم جگر کو دیکھتے ہیں
ترے جواہر طرف کلمہ کو کیا دیکھیں
ہم اوج طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

غالب کے تغزل کی تاثیر چھوٹی بحر کے استعمال سے دوچند ہوئی ہے۔ آپ ان کی چھوٹی بحر کی کوئی سی غزل اخلایس اسکے بحر میں ڈوبتے چلے جائیں گے۔ مثلاً ایسی چند غزلوں کے پہلے مصرعے یہ ہیں:-

درد منت کش دوانہ ہوا

یا

ہوس کو ہے نشاط کار کیا

یا

پھر مجھے دیدہ تر یا دآ یا

یا

ابن مریم ہوا کرے کوئی

یا

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

یا

چاہیئے اچھوں کو جتنا چاہیئے

غالب نے ان غزلوں میں نہایت سادگی اور پُر کاری سے کام لیتے ہوئے ان میں قاری الفاظ کا استعمال نہ ہونے کی حد تک کیا ہے۔ کمال کی بات یہ بھی ہے کہ ان غزلوں میں زبانِ زو عام اشعار خاصی تعداد میں ملتے ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ جہاں خوشحال نے پشتو میں ”قسمیہ“ غزل کی طرح ڈالی وہاں غالب نے اردو میں ”سوالیہ“ غزلیں چھوڑی ہیں ہم غالب کی اس کاوش کو تجربہ کی ذیل میں شمار کرتے ہوئے یہاں ان غزلوں کے چند اشعار پیش کرتے ہیں۔

دوست غنوارِی میں میری سہی فرمائیں گے کیا؟

زخم کے بھرنے تک ناخن نہ بڑھائیں گے کیا؟

گر کیا نا صبح نے ہم کو قید اچھائیوں سہی

یہ جنوں عشق کے انداز چھٹ جائیں کیا؟

خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں

ہیں گرفتار وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا؟

ہے اب اس معمورہ میں قلعہ غم اُلفت اسد

ہم نے یہ مانہ کہ ولی میں رہے کھائیں کیا؟

دوسری غزل کے چند اشعار:-

ہوں کو ہے نشاط کار کیا کیا
 نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا؟
 نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں
 شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا؟
 یہ قاتل وعدہ صبر آزما کیوں
 یہ کافر قتیہ طاقت رہا کیا؟
 بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
 عبارت کیا 'اشارت کیا' ادا کیا؟

دیوان غالب میں ایک ایسی غزل بھی وارد ہوئی ہے: کہ جس کے مقطع میں مطلع کی تکرار
 موجود ہے۔

مطلع:- پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موج شراب

دے دے کو دل دوست شناس موج شراب

مقطع:- ہوش اڑتے ہیں مرے جلوہ گل دیکھا سد

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موج شراب

غالب نے غزل میں سادگی، سلاست، پرکاری سے کام لیکر جو غزلیں کہی ہیں۔ ان میں ایک
 نمائندہ غزل پیش خدمت ہے:

درد منت کش دوانہ ہوا میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں تو ہی جب خنجر آزمانہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
ہے خبر گرم ان کے آنے کی آج ہی گھر میں پوریا نہ ہوا
کیا وہ ضرور کی خدائی تھی بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی 'دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گردوب گیا لبو نہ تھا کام گر رک گیا روانہ ہوا
ربزنی ہے کہ دلستانی ہے لے کے دل داستان روانہ ہوا

کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں

آج غالب غزل سرانہ ہوا

مولانا حالی غالب کے شاگرد ہونے کے ساتھ ساتھ انکے نقاد بھی تھے۔ غالب کی شاعری کے بارے میں انکی رائے پر یہ بحث ختم کرتے ہیں:

”میر و سودا اور ان کے متقدمین کے کلام میں ایک قسم کے خیالات اور مضامین دیکھتے دیکھتے جی اکٹھا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد مرزا کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں اور اس میں ہم کو ایک دوسرا عالم دکھائی دیتا ہے۔ اور جس طرح کہ ایک خشکی کا سیاح سمندر کے سفر میں ایک بالکل نئی اور نرالی کیفیت مشاہدہ کرتا ہے اسی طرح مرزا کے کلام میں

ایک اور سی سہاں نظر آتا ہے“

(مولانا حالی ”یادگار غالب“)

موازنہ

یوں خوشحال و غالب نے اپنی اپنی زبان میں غزل کو نہ صرف ایک نئی ڈگر پر ڈالا بلکہ اسے اتنی قوت بخشی کہ وہ رہتی دنیا تک اپنے پاؤں پر کھڑی رہ سکے۔ علاوہ ازیں ان دونوں نے اپنی اپنی غزل کو جدید طرز سے نوازا۔

بقول مولانا حالی: ”نئی طرز اس وقت تک ایجاد نہیں ہوتی جب تک ضرورتیں اہل فن کو مجبور نہ کریں“ اسی لئے نئی طرز جو بقول ڈاکٹر محمد حسن ”فارسی میں چار سو سال بعد ظہور میں آئی تھی رشتے میں ڈیڑھ سو سال کے اندر اندر پیدا ہو گئی اور مومن، شیفتہ، سالک، عارف، تسکین اور داغ نے اسے رواج دیا۔ فارسی کی اسی نئی طرز نے مرزا کے خیالات میں انوکھا پن، شوخی، طرافت، استعارے اور کنائے کا چونکا دینے والی حد تک دلکش استعمال اور انکے ذہنی اشعار کو جنم دیا۔ یہی کچھ غالب سے ہونے دو صدیاں پہلے خوشحال کے ساتھ بھی پیش آیا۔ اور یہی ہمارے ان دونوں نابغہ شعراء کا موازنہ ہے۔ اسی لئے عصر جدید کی پشتو اور اردو غزل خوشحال و غالب کی احسان مند ہیں۔

خوشحال و غالب کی قصیدہ گوئی

خوشحال اور غالب دونوں نے اپنے اپنے ماحول کے مطابق قصیدہ گوئی کی۔ خوشحال اور غالب کے قصائد اور انکو لکھنے کے ڈھنگ میں جو فرق پایا جاتا ہے۔ اس کے مطابق جہاں خوشحال نے دنیا جہان کے عنوانات پر قابل قدر تعداد میں قصیدے لکھے۔ اور اورنگزیب کے خلاف جہو بھی قصیدے ہی کے ذیل میں لکھے۔ وہاں غالب کے ہاں بقول خواجہ محمد ذکریا اردو کے سرف چار قصیدے ملتے ہیں۔ ان میں دو حضرت علی کی شان میں اور دو بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ہیں۔ مگر خواجہ محمد ذکریا کے اس دعوے کی تائید نہیں کی جاسکتی۔ میری اپنی تحقیق کے مطابق دیوان غالب (نسخہ طاہر) میں کم و بیش سات اردو قصائد کی موجودگی ذکر یا صاحب کے دعوے کی تردید کے لیے کافی ہے۔ (دیکھئے دیوان غالب نسخہ طاہر سنگ مل پبلیکیشنز لاہور ۱۹۹۸) غالب نے فارسی میں جو قصیدہ گوئی کی ہے وہ ہماری آج کی بحث کا عنوان نہیں ہے۔

خوشحال کے کلام میں یہ اشعار ملتے ہیں جن میں قصیدے کا ذکر بھی مل جاتا ہے:-

”میں نے ہر موضوع پر۔۔۔۔۔ قصیدے بھی لکھے اور حکمت و دہند و

نصائح سے بھرپور واقعات بھی قلم بند کئے۔ دلبروں کی شان میں

غزلیں بھی لکھیں اور آنکھوں اور آہروں کو زلفوں کا اسیر بھی کیا۔
 رہائی قطعہ اور مشوی میں ہیرے، لعل، موتی اور جواہر بھی جڑے۔
 اگر فارسی میں کوئی شخص مجھ سے بہتر ہے تو پشتو ادب میں میں بے
 مثال ہوں۔“

(جیل صدیقی ”جمہوریت کا علمبردار از خوشحال نامہ“)

خوشحال بابا نے لاتعداد عنوانات پر قصائد لکھے۔ آپ انکے قصائد پڑھتے جائیں
 تو ان میں دبا کا ذکر، بہار کی آمد، چند حکمت کی باتیں، پشتو شاعری پر بابا کے احسانات،
 شاعری کی لت، اور نگزیب اور اسکے امراء کی جھوٹا تاریخ نویسی یعنی دہلی کے پشتون اور مغل
 بادشاہوں اور شہر دہلی کی تاریخ، جن کی سیر، دن اور رات کا مکالمہ، قید کے حالات، بہار میں
 رومان، استاد کی نصیحتیں، دو بیٹوں کی بہادری کا بیان، ایک بیٹے کی جھوٹا حیا اور ذاتی نقصان،
 اپنے عقیدہ اور مسلک کا بیان، ہند سے نفرت اور جنگی حالات جیسے عنوانات پر قصائد ملیں
 گے۔ ایک قصیدہ ایسا بھی ملے گا جسے میں پراسرار قصیدہ کہنا پسند کرتا ہوں کہ یہ محبوب کی طرف
 سے محبوب کے نام لکھا گیا ہے۔ نہ جانے خوشحال نے یہ قصیدہ لکھنے کے لیے کیسے اپنا موز
 بنایا ہوگا۔

خوشحال نے جو چند تعریفی قصیدے لکھے وہ دہلی کے دو ایک خدا ترس پشتون
 بادشاہان یعنی بہلول لودھی اور شیر شاہ سوری وغیرہ کے متعلق ہیں۔ جو خوشحال کی پیدائش
 سے پہلے ہندوستان پر حکومت کر چکے تھے۔

خوشحال کے اورنگزیب بادشاہ کی قید و بند کے دوران اس کے خلاف ہجو نما قصیدے تاریخی تناظر میں لکھے گئے۔ اور خوشحال و اورنگزیب کی آپس کی پرغاش اور خوشحال پر اورنگزیب کے ظلم و ستم کی حقیقت کو آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے مرقوم کرنے کی ایک کوشش تھی۔ خوشحال کے ان تاریخی قصائد میں سے چند اقتباسات قارئین کی خدمت میں پیش ہیں۔ ایک قصیدے میں خوشحال بابا اپنے تعریف کرنے اور ہجو کہنے کا فلسفہ یوں بیان کرتے ہیں:-

”میں حسینوں کے ہوا اور کسی کا مداح نہیں۔ مجھے کسی اور کی تعریف میں ایک لفظ بھی نہیں کہنا۔

میں کیا خود خدائے تعالیٰ کو حسن پسند ہے۔ دلیل میں ذرا سورۃ یوسف غور سے پڑھو۔

نہ تو مجھے کسی سے کوئی لالچ ہے کہ میں اس کا مداح بن جاؤں نہ کسی سے خاہر داری ہے اور نہ مجھے دغا یا فریب سے کوئی علاقہ ہے۔

اگر تیرا اور عیب گوئی ہے آ جاؤں تو میں تمہیں بتاؤں کہ فردوسی بھی اس کام میں میرا ہمسر نہیں۔

فردوسی نے محمود کی جھوٹ میں زیادہ سے زیادہ دو چار شعر کہے ہوئے اور میرے پاس اورنگزیب کی خدمت کے اشعار سے بھرا بھرا پڑا ہے اور جب بادشاہ وقت دم کے لائق ہو گیا تو پھر ہر چھوٹا بڑا خدمت کے

قابل ہو گیا۔ میں نے کسی کی عیب گوئی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور

اس کا سارا وبال بھی اور نگزیب ہی کی گردن پر ہے۔“

ایک اور قصیدے میں شاہ جہان بادشاہ کی تعریف کرتے کرتے بادشاہ وقت اور نگزیب کو یوں نشانہ بنایا ہے:-

”میرے کام کی قدر بس شاہ جہان کے دل میں تھی (ورنہ)

اور نگزیب کا حال تو ظاہر ہی ہے۔ جس کے خیر خواہ اور بد خواہ دونوں

ایک سے ہیں۔ خود اسے نہ عدل کی تمیز ہے نہ اعتدال کی۔

جب سے اسکی بادشاہت کا دور شروع ہوا ہے بس اس کے عہد میں ہر

طرف خلل اور فساد مچا ہوا ہے۔ اسکے زمانے میں تمام ملک تہہ و بالا

ہو کے رہ گیا۔ گویا کہ دجال کا زمانہ آ گیا۔

جس نے اپنے باپ تک کو نہ چھوڑا اسے دوسروں پر ظلم کرنے میں کیا

تامل ہو سکتا ہے۔ جیسے وہ میرے زوال کے دیکھنے کا خواہشمند ہے

میں ابھی اسکے لئے ایسا زوال نہیں چاہتا۔“

اور نگزیب بادشاہ کے ظلم اور اسکے امراء کی نالائقی کو اپنے ایک قصیدے میں خوشحال نے

یوں بیان کیا ہے:-

”اور یہ تجھ پر ہی نہیں اگر زندہ رہا تو اور نگزیب بہت سوں کو پاہمال

کر ڈالے گا۔ اس نے بخت نصر کا ظلم شروع کر رکھا ہے۔ اور میں

دانیال کی طرح، اسکے ہاتھوں میں قید ہوں۔

جو کوئی بھی اسکے ہاتھ آ جائے، جاوے جاوے خوار کرتا ہے اور وہاں کی پرواہ نہیں کرتا جب اس نے اپنے باپ کو نہ بخشا تو اوروں پر زیادتی کرنا اسکے لئے کیا مشکل ہے۔ سچ پوچھو تو یہ کام بادشاہوں کے نہیں۔ یہ تو ایک رہزن اور ڈاکو کے کام ہیں۔

ایک ظلم میں دوسرے مکر میں کوئی دوسرا اس کا ہمسر نہیں۔ اگر ہے تو حجاج ہے یا یزید۔ ایسے بادشاہ کی نماز بھی، جس میں عدل اور میاں رومی نہ ہو۔ اسکے گلے کا ہار ہو جائیگی۔ نہ انصاف ہے نہ قیامت نہ عدل کا اجالا۔ بس اسکے دربار پہ ایک تاریکی چھائی ہوئی ہے اور اس میں وحشی درندے (رہتے) ہیں۔

اسکے امراء بھی سب اسی جیسے ہیں۔ سب ہر طرح سے اپنی من مانی کرتے ہیں۔ اگر ان کا حسب نسب دیکھو تو ان میں تھوڑے اصیل نکلیں گے اور زیادہ کم ذات۔“

اپنی شاعری اور بادشاہ وقت کی مدح سے متعلق خوشحال کا یہ مشہور شعر بھی اسی جذبے کے تحت لکھا گیا:-

”اگر میں نے اپنی شاعری چمکانی ہوتی تو اپنے بادشاہ کی ذمہ ساری تعریفیں لکھتا۔“

دوسری جگہ فرماتے ہیں:-

”اس شاعر کا منہ کالا ہو جو طمع اور لالچ کی وجہ سے ہر در اور ہر در بار
کے پاس کھڑا رہتا ہے“

خوشحال کے فن قصیدہ گوئی کا اندازہ لگانے کے لیے انکے مشہور قصیدے ”بہار کی آمد“ سے
یہ اقتباس ملاحظہ ہو:-

”پھر کہاں سے آگئی یہ بہار کہ تمام وطن کو گل و گلزار بنا دیا۔ ارغوان
(سرخ رنگ کے پھول) ضمیران (نازبو) سوسن (اودے اور نیلے
رنگ کے پھول) اور ریحان کھلے ہوئے ہیں۔ یاسمین (چمبیلی)
نسترن (سیوتی) نرگس اور انار کے پھول۔

بہار کے پھول ہر قسم کے پے شمار ہیں مگر لال، بھوکا لالہ ان میں بہت
نمایاں ہے۔ لڑکیاں ڈھیر سارے پھول اپنے گریبانوں میں لٹوم رہی
ہیں اور نوجوان اپنی گھڑیوں میں گلدستے لگا رہے ہیں۔

مطب سارا گئی بجانا شروع کر ہر ہر تار اور پردے سے نفی نکال
ساقی! آ اور بھر بھر کے پیالے دے کہ شراب کے نشے میں سرشار
ہو جاؤں“

خوشحال کا ایک قصیدہ اپنے اندر دن اور رات کا مکالمہ سمیٹے ہوئے ہے۔ قصیدہ گوئی میں یہ
بھی خوشحال کا ایک تجربہ ہی گردانا جائے گا۔ اس قصیدہ کے چند اشعار یوں ہیں:-
”یہ دن اور رات کی بحث ہے اے ہمدردا کان لگا کر سن اگر توے“

اسپر غور کیا تو اپنے دل کو مصیبت سے چھڑا لے گا۔

دن نے رات سے بحث چھیڑی پہلے تو (دونوں نے) ایک دوسرے کی تعریف کی پھر ان کی گفتگو پھیل کر ایک دوسرے کی مدح و ذم تک پہنچ گئی۔

رات نے دن سے کہا۔ اے دن میری فضیلت تجھ سے زیادہ ہے اسلئے کہ میں ازل سے تجھ سے آگے ہوں۔

سب متقی اور خدا دوست رات ہی کو عبادت کیا کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ بھی اپنی قوم سے الگ ہو کر رات کے وقت ہی کوہ طور پر گئے تھے۔

حضرت احمد مختلی (سلم) نے بھی رات کے وقت چاند کو اتارا تھا اور معراج کے لئے رات ہی کو تشریف لے گئے تھے۔

دن میں آسمان کی طرف دیکھو تو ایک نیلا گنبد دکھائی دیتا ہے۔ رات کو دیکھو تو جنت سے بھی زیادہ خوبصورت نظر آتا ہے۔

میں بیبیوں پر پردہ ڈالنے والی ہوں اور تو عیب فاش کرنے والا ہے مجھ سے لوگ راحت پاتے ہیں اور تو مصیبتوں اور غموں سے بھرا ہوا ہے۔

جب دن نے رات سے اپنی یہ ”تعریفیں“ سن لیں تو آہستہ سے کہا

لے اب مذمت ختم کر اور چپ ہو جا۔

جو با ایمان روزہ رکھتے ہیں وہ سب دن کے وقت ہی رکھتے ہیں اور عرقات میں بھی دن ہی کے وقت جمع ہوتے ہیں۔

قیامت میں لوگوں کا حشر نشر بھی دن ہی کے وقت ہوگا۔ اور انس و جن کی تخلیق بھی پہلے پہل دن کو ہی ہوئی تھی۔

مجھے دیکھ کر دنیا کی آنکھیں روشن اور تجھے دیکھ کے تاریک ہو جاتی ہیں۔ میرا بشرہ اسلام سے منسوب ہے اور تیرا کفر سے۔ میرا لباس عید کا ہے اور تیرا ماتم کا۔

مانا کہ تو بادشاہ کی مانند ہے اور چاند ستارے تیرا لشکر ہیں مگر جو نمی دن نکلتا ہے تیرا یہ سارا لشکر تس تس ہو جاتا ہے۔

سورج اگر بادلوں میں چھپا ہوا ہو تب بھی چاند سے زیادہ روشن ہوتا ہے اور یہ تو ساری دنیا جانتی ہے کہ سونا چاندی کے درہم سے اچھا ہوتا ہے۔

چمن کے پھولوں کی سیر یا شکار کے لیے رات بھی دن کی طرح موزون نہیں ہو سکتی۔

فرض نمازیں مجھ میں زیادہ اور تجھ میں کم۔ یہ کم اس لیے ہیں کہ تو خود (رہتے میں) مجھ سے کم ہے۔

غالب کی قصیدہ گوئی

غالب کے زمانہ میں قصیدہ گوئی کے فن پر فارسی قصیدہ گوئی کی چھاپ باقی تھی۔ ججو لکھنے کا فن قصیدے سے الگ سمجھا جاتا تھا۔ خواجہ محمد زکریا نے ان حالات پر یوں روشنی ڈالی ہے:

”فارسی اور اردو کے بڑے بڑے قصیدہ نگار مثلاً انوری، خاقانی، ظہیر

قاریانی، عرفی اور سودا وغیرہ نے قصیدوں میں سنگلاخ زمینیں اختیار

کیں اور علوم و فنون کی اصطلاحوں سے انہیں گراں بار کر دیا۔ خود

غالب کے ہمعصروں میں ذوق کے قصیدے بھی وقیع اور ثقیل ہیں۔

غالب نے قصیدہ گوئی کے اس انداز کو ترک کر دیا اور نہایت آسان

زمینیں منتخب کیں“

(خواجہ محمد زکریا ”غالب کے اردو قصیدے“)

خواجہ محمد زکریا کے مطابق غالب نے جو ابتدائی دو قصائد لکھے ان میں فارسی

تراکیب اور الفاظ کا وہی انداز ہے جو غالب کے پہلے دور کی غزلیات میں ہے۔ باقی دو

قصائد آسان اور سہل اور رواں دواں زبان میں لکھے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ

غالب کو اردو قصیدہ نگاری میں کوئی خاص مقام نہیں دیتے اور کہتے ہیں کہ ان کے قصیدے

فن قصیدہ گوئی پر پورے نہیں اترتے۔ لیکن خداؤں کا ایک گردہ ایسا بھی ہے جو اسی جدت

کی وجہ سے غالب کے قصائد کا مداح ہے۔ ان میں عبدالسلام ندوی اور سید عابد علی عابد ایسے نقاد بھی شامل ہیں۔ عبدالسلام ندوی شعر الہند جلد دوم میں لکھتے ہیں کہ غالب نے بعض قصائد لکھے جو اردو شاعری کا سرمایہ ناز ہیں۔ مثلاً

ہاں مدہ نوشیں ہم اس کا نام

یہ قصیدہ اگرچہ ایشیائی قصیدہ گوئی کے تمام رسمی محاسن سے خالی ہے لیکن اس کی سلاست، روانی، متانت، جزالت اور تھپیہ نے اردو قصیدہ گوئی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔

غالب کے قصائد کی خاص بات یہ ہے کہ ان کی تمہید میں زور تخیل سے نئے نئے مضامین پیدا کئے گئے ہیں۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ قصیدے کے پہلے شعر ہی سے مدوح اور اسکی مدح کے انداز کا اندازہ ہونے لگتا ہے۔ اور آگے چلکر گریز کا شعر آتے ہی پوری بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔

غالب نے اردو میں جتنے بھی قصائد لکھے وہ مدحیہ ہیں۔ ان میں یا تو حضرت علی کی یا بادشاہ وقت اور دوسرے راجاؤں مہاراجاؤں حتیٰ کہ پنجاب کے ایک گورنر مسٹر منگلوڈ کی تعریف کی گئی ہے۔ یہاں آ کر یہ سوال ضرور کھٹکتا ہے کہ غالب کو ان لوگوں کی مدح کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ پروفیسر فتح محمد ملک کا خیال ہے کہ:-

”شاعر (غالب) کے دل و دماغ پر مابعد الطبیعیاتی تصورات سمائے

ہوئے تھے۔ مگر عالم آب و باد و خاک کے خالص تا طبعی تقاضوں نے

تنگین حالات کو تنگین تر بنا دیا۔ تو پسپائی کی ہی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ تب حالات نے غالب کے اندر اس خوددار شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جس نے سخت تنگ دستی کے عالم میں بھی دلی کالج کی پروفیسری کو محض اس لیے ٹھکرا دیا تھا کہ اس کا استقبال مظاہرہ روایات کے مطابق نہ ہوا تھا۔“

آگے چلکر پروفیسر فتح محمد ملک کہتے ہیں:-

”یہ شخص (غالب) رزمگاہ حیات میں حالات کا مقابلہ کمال دلداری اور مردانگی سے کرتا رہا مگر تاکہ جب حالات نے اس پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ وضع داری اور خود داری کے سہارے زندگی کا ایک پل گزارنا بھی جوئے شیر لانا ہے۔ تو وہ اس معنی آتش نفس کو ڈھونڈنے لگا جس کی صدا اسے جلوہ برق فنا ہوا اب اس کا محبوب موت بن گئی۔ اور وہ مرنے کی آرزو میں مرنے لگا۔ لیکن جب اس کی آنکھیں اس طرف سے بھی کھل گئیں کہ موت تو آنے کی نہیں تو اپنی وضع داری کا گلا گھوٹ کر اس نے جو اکھیلنا شروع کر دیا۔ جب اس سے بھی اندیشہ ہائے دور دراز ختم ہوتے نظر نہ آئے تو

۔ بزم شہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا“

(پروفیسر فتح محمد ملک ”غالب۔۔۔ نزل سے قصیدے تک“)

غالب کی تعریف شاہ میں کی گئی قصیدہ گوئی اس کی سخت تنگ دستی اور معاشی مجبوری کا نتیجہ تھی ورنہ وہ بنیادی طور پر ایک وضعدار اور خود دار انسان تھا۔

غالب وظیفہ خواہر ہو دو شاہ کو دعا

وہ دن گئے جو کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

اس ضمن میں ڈاکٹر ابوالیث صدیقی بیدل اور غالب کا موازنہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

”عظمت آدم کا راز دونوں کے یہاں جدوجہد‘ عزم و استقلال“

حرکت و عمل میں پوشیدہ ہے۔ دونوں کی طبیعت مشکل پسند ہے۔

دونوں اپنی راہیں شارع عام سے الگ نکالتے ہیں۔ دونوں خود دار

اور غیرت مند ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ حالات اور واقعات نے

مرزا غالب کو زندگی میں عالی ظرفی‘ غیرت اور شکوہ کی بجائے جوان

کی فطرت میں دو بیت کیا گیا تھا بادشاہوں‘ شہزادوں‘ ولی عہدوں‘

نوابوں بلکہ معمولی انگریز عہدہ داروں کی مدح سرائی اور در یوزہ گری

پر مجبور کر دیا“

(ڈاکٹر ابوالیث صدیقی ”نقش ہائے رنگ رنگ“)

مگر یہاں یہ حقیقت بھی جاننے کے لائق ہے کہ غالب کو اپنے فارسی قصیدے پر ناز تھا۔

ایک خط میں لکھتے ہیں:-

”کیا کروں اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی

لکھنے والوں کی مجھے نہیں آتی کہ بالکل بھانٹوں کی طرح بکنا شروع
 کر دیں۔ میرے (فارسی) قصیدے دیکھو تھیب کے شعر بہت
 پاؤ گے اور مدح کے بہت کم۔ تثر میں بھی یہی حال ہے۔“

انکے فارسی قصیدوں میں مدح سرائی کے کم ہونے کا ثبوت یہ بھی ہے کہ فارسی کے چونسٹھ
 قصیدوں میں سے بارہ قصیدے 'حمد و نعت اور منقبت اہل بیت سے متعلق ہیں۔ گو کہ چند
 قصیدے دنیاوی ممدوحوں یعنی بہادر شاہ ظفر اور ملکہ وکٹوریہ کی مدح میں بھی لکھے ہیں۔ بہر
 حال غالب کو اس لئے بھی یاد رکھا جائے گا کہ فارسی قصیدے میں انہوں نے مدح سے
 زیادہ تھیب پر زور دیا۔

غالب کی قصیدہ گوئی کے کچھ بھی محرکات رہے ہوں۔ انہوں نے کمال کے
 قصیدے لکھے۔ حضرت علیؑ کی شان میں جو وہ قصائد لکھے۔ ان میں سے چیدہ چیدہ اشعار
 پیش ہیں:-

سازیک ذرہ نہیں فیض چمن سے بیکار
 سایہ لالہ بے داغ سویدائے بہار
 لعل سے کی ہے پئے زمزمہٴ مدحِ شاہ
 طوطی سبزہٴ کہسار نے پیدا منقار
 وہ شہنشاہ کہ جس کی پئے تعمیر سرا
 چشم جبریل ہوئی قالبِ خشت دیوار

تیری اولاد کے غم سے ہے بروئے گردوں
 سلک اختر میں نہ نو مژگ گوہر ہار
 ہم عبادت کو ترا نقش قدم مہر نماز
 ہم ریاضت کو ترے حوصلہ سے استلہار
 مدح میں تیری نہاں زمزمہ نعت نبی
 جام سے تیرے عیاں بادہ جوش اسرار

دوسرے قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
 ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود ہیں
 کس نے دیکھا نفس اہل وفا آتش خیز
 کس نے پایا اثرِ نالہ دلہائے حزیں
 کس قدر ہر ذہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ
 یک قلم خارجِ آداب وقار و حکمیں
 نقش لا حول لکھ اے غامۂ ہڈیاں تحریر
 یا علیٰ عرض کر اے فطرت و سواس قریں
 مظہر فیضِ خدا جان و دل ختمِ رسل
 قبلۂ آلِ نبی کعبۂ ایجاد و یقیں

آخر میں مدح شاہ میں لکھے گئے قصائد میں سے چند اشعار یوں ہیں:-

اے شہنشاہ فلک منظر بے مثل و نظیر
اے جہاندار کرم شیوہ و بے شبہ عدل
تیرا انداز سخن شاید زلف الہام
تیری رفتار قلم جنبش بال جبرل

غالب کے سب سے بے نظیر قصیدے کے چند اشعار کے بغیر یہ مضمون ادھورا رہ جائے گا:-

ہاں مہ نونیں ہم اس کا نام
جس کو تو کر رہا ہے جھک کے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دم صبح
یہی انداز اور یہی اندام
ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا
تیرا آغاز اور تیرا انجام
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا
ہیں مہ و مہر و زبرہ و بہرام
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن
نام شاہنشاہ بلند مقام

خوشحال و غالب اور سائنس

خوشحال اور سائنس

بادی النظر میں خوشحال و غالب کا سائنس کے ساتھ کچھ تعلق ہونا ایک عجیب امر لگتا ہے مگر ہے دلچسپ۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اس پر طبع آزمائی کرنے کی ٹھانی۔ اس کا نتیجہ آپکے سامنے ہے۔ خوشحال کا زمانہ سترھویں صدی کا حصہ تھا۔ تب بندوق کے سوا کوئی دوسری قابل ذکر سائنسی ایجاد کا پتہ نہیں چلتا۔ مگر غالب کا دور انیسویں صدی میں آتا ہے اور نسبتاً زیادہ جدید تھا۔ جب برطانیہ میں پٹری پر چلنے والا پہلا ریلوے انجن ۱۸۰۴ء میں ایجاد ہوا تو غالب کی عمر اس وقت سات برس کی تھی۔ اگلے زمانے میں بھاپ سے چلنے والے بحری جہاز بھی موجود تھے۔ ہاں اگر مرزا اپنی طبعی عمر سے اٹھائیس برس اور زندہ رہ لیتے تو انہیں فینس کے علاوہ موٹر کار میں بھی سفر کرنے کا موقع مل جاتا۔ کیونکہ یورپ میں موٹر کار کی ایجاد ۱۸۹۷ء میں ہوئی۔ جبکہ غالب کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا۔

یوں تو خوشحال و غالب دونوں نے جائے مولود سے باہر مختلف وجوہات کی بنا پر اسفار اختیار کئے لیکن ہر ایک کو سفر کے دوران اپنے اپنے زمان و مکان کے لحاظ سے مختلف مشکلات اور تجربات کا سامنا کرنا پڑا جن کے اثرات بھی دونوں پر مختلف مرتب ہوئے۔

خوشحال نے اپنی زندگی میں بدعاش، طبع، کامل، تارا گڑھ، دہلی، رتھنہ (خز و بچہ پور)، سوات، درہ آدم خیل اور تیراہ کے سفر کئے۔ ان اسفار کے نتیجے میں خوشحال کے کلام میں وسعت اور گہرائی و گیرائی پیدا ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ خوشحال ایک جنگجو سردار اور شاعر ہونے کے علاوہ بنیادی شدہ برد رکھنے والے ایک حکیم، ماہر فلکیات اور جغرافیہ دان بھی تھے۔ حکمت سے دلچسپی کے نتیجے میں لکھی جانے والی خوشحال کی کتاب ”طب نامہ“ ان کے زمانے کے لوگوں کے لیے خاصے کی چیز رہی ہوگی۔ اس کا مطالعہ آج بھی کئی لحاظ سے منفرد اور مفید ہے۔ اسے خوشحال کے زمانے کا لوکل فارما کو پیا کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ اور اس لحاظ سے ”طب نامہ“ کے مندرجات کو سائنسی بنیاد مل سکتی ہے۔

آئیے اب ذرا جغرافیہ دان خوشحال کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ پروفیسر محمد نواز طائر سابق ڈائریکٹر پشتوا کیڈمی پشاور یونیورسٹی کہتے ہیں:-

”چاہے کوئی مفکر، فلسفی، شاعر، ادیب، شاعر، سائنسدان یا مصور ہو، اس کے ذہن پر اپنے ماحول کا خاصہ اثر رہتا ہے۔ اور وہ اسی اثر کے سائے میں اپنے افکار، اشعار یا فن دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ایک نہایت اونچے پایے کے مفکر اور صاحب نظر انسان کے لئے اس کے محدود ماحول میں بھی پوری کائنات کے راز عیاں ہوتے ہیں۔“

آگے چل کر پروفیسر صاحب فرماتے ہیں:-

”ہمارے نامور شاعر خوشحال صہن خشک نے بھی اپنے بڑے اور

فراغ مکان (دنیا) کا بغور مشاہدہ کیا تھا۔ اور ایک اونچے درجہ کے
 ہیئت دان کی حیثیت سے اسکے جزئیات پر الگ الگ بحث کی ہے۔
 زمین کی گردش، اجرام فلکی، سیاروں کا بغور مطالعہ پرانے زمانہ کے لہل
 علم اور ماہرین کی عادت رہی ہے۔ خوشحال نے بھی ان علوم پر بہت
 کچھ لکھا ہے۔ موسموں، شب و روز کی طوالت یا کمی اور چاند اور سورج
 کی مختلف حالتوں پر اس نے بڑے اچھے طریقے سے اپنے کلام میں
 روشنی ڈالی ہے۔ یہاں تک کہ خوشحال بابا نے آسمانوں کے بارہ
 نُدُوج کے نام بھی پشتو میں تجویز کئے ہیں۔ خوشحال کے مطابق یہ بارہ
 نُدُوج بارہ مہینے ہیں۔ اور تین نُدُوج یا مہینوں میں ایک موسم ہوتا
 ہے۔ یوں پورے سال میں چار موسم ہوتے ہیں خوشحال کہتا ہے:

”خبرم کے موسم کے بعد بہار کے پھولوں کا موسم آتا ہے“

”بارہ برجوں پر سورج پورے بارہ مہینوں میں اپنا سفر پورا کرتا ہے“

”اگر سردیوں میں درخت کی شاخ تراشی کر لی جائے“

”تو بہار کے موسم میں اسکے پر و بال خوب نکلتے ہیں“

پھر علاقوں کی سطح سمندر سے کم یا زیادہ اونچائی کے اثرات اور آب و ہوا کے متعلق خوشحال
 نے یہ نقشہ کھینچا ہے:-

”باقی باغات تو نوروز (بہار) میں سرسبز ہوتے ہیں مگر کابل کا باغ

احاڑ (جون) میں سرسبز ہوتا ہے“

”سنبل کی آٹھ تاریخ (۱۳ اگست) کو شبنم ختم ہو جاتی ہے بدن پر پسینہ

خشک ہو جاتا ہے۔ اور دھان کی بالیاں نکل آتی ہیں“

”سرقند کی ناشپاتی کا پودا ہند کی زمین میں بونے سے جو پھل حاصل

ہوگا اگر اسے شہد میں بھی ڈبو کر کھاؤ۔ تو بے مزہ ہوگا۔ ہر پھل پر اپنی

ہی سرزمین کی آب و ہوا کا اثر ہوتا ہے“

(پروفیسر محمد طائر، جغرافیہ دان خوشحال)

اس ضمن میں خوشحال کے چند اشعار کا ترجمہ یوں ہے:-

”پھل پھلاری غلے پھول اور قسم قسم کی نعمتیں زمیں سے پیدا ہوتی

ہیں۔ اور خود زمین گارامٹی ہے“

اس جہان میں ہوا چاروں طرف گشت کرتی رہتی ہے۔ اس بات سے

بے خبر کہ وہ کیا تپ رہی ہے کیا طے کرتی ہے۔ اور کہاں چلتی ہے“

خوشحال کے کلام میں حکمت اور جغرافیہ سے متعلق یہی اشعار موجود نہیں بلکہ اس نے یہاں

وہاں ایسے خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔ جس سے اسکی سائنسی سوچ کا پتہ چلتا ہے۔ اس

قبیل کے چند اشعار ملاحظہ کریں:-

”انسان کو قدرت نے جس ڈھنگ سے بنایا ہے۔ اگر غور کرو تو ایک سرسبز راز ہے“

انسان کی بناوٹ میں خاص طور سے آنکھوں کی بناوٹ میں جو سائنسی اصول کاربند ہے

اس کے متعلق خوشحال کے تخیل کا نقشہ جناب محمد نواز سرحدی نے یوں کھینچا ہے:-

”عموماً شعراء اور ادیب سائنس کے خشک کٹیوٹوں کو اپنے کلام میں جگہ نہیں دیتے بلکہ ان کے ہاں ایسا کرنا رنگ میں بھنگ ڈالنے کے مترادف ہے۔ خصوصاً شاعری کے نازک تخیل میں سائنس کے خشک کچیے سمونا گویا کرنے کی بات ہی نہیں ہے۔ لیکن خوشحال خان کے تخیلات کے گلستان کا دروازہ ہر ایک خیال کے لئے ہر دم وا نظر آتا ہے۔ ان کا گلستان تخیل اگر ایک طرف ملی روحانی اور اخلاقی پھولوں سے مزین ہے تو دوسری طرف سائنس کے پھولوں کی کلیاں بھی چمکتی نظر آتی ہیں۔ اس نے سائنسی اور تخلیقی قوت کا اظہار بہت خوبی سے یوں کیا ہے:-

”محبوب کے چہرے کے سوا میں کسی چیز کو اپنی پتلی سے نہیں دیکھتا۔

آنکھ کی دونوں چٹلیاں سورج کی روشنی سے ملک کا نظارہ کرتی ہیں“

”لگ بھگ ساڑھے تین سو سال پہلے ایسے باریک سائنسی نکتے سے

آگاہی خان بابا کے فہم و ادراک پر دلالت کرتی ہے۔ اس سے پتہ چلتا

ہے کہ وہ ایک نابعد انسان تھا۔ اگر کوئی اسی شعر کو بارہی سے دیکھے تو پتہ

چلے گا کہ انہوں نے کس خوبصورتی کے ساتھ دو متضاد خیالات یعنی

رومان اور سائنس کو ایسے یکجا کیا ہے کہ انسان انگشت بدنداں رہ جاتا

ہے۔ آپ محبوب کے چہرے کو سورج سے تشبیہ دیتے ہیں۔ یہ تو ظاہر

ہے کہ دیکھنے کی طاقت سورج کی روشنی کی محتاج ہے۔ اگر سورج نہ ہو تو

دید کی طاقت کمزور پڑ جاتی ہے۔ اسی طرح جب وہ اپنے محبوب کو نہیں دیکھ پاتا تو اس کی نظر نہیں لگتی یعنی اگر اسے کچھ دکھائی دیتا ہے تو وہ چہرہ یاد ہے۔ یہی خیال اگر ایک طرف عظیم رومانی کیفیت رکھتا ہے تو اس کے ساتھ ہی سائنسی نظریے کا ایک تصور سامنے آ جاتا ہے اور وہ یوں کہ بقول انکے یہ آنکھ کی پتلی کا کمال ہے کہ پہلے سورج کی شعاعوں کو جذب کر لیتی ہے اور پھر واپس منعکس کرتی ہے۔ یہ روشنی جس چیز پر پڑے وہ نظر آ جاتی ہے۔ موجودہ طبی سائنس کا نظریہ انکا اس نور ہو، ہو خوشحال بابا کے اوپر بیان شدہ شعر کی ترجمانی کرتا ہے:-

(محمد نواز خٹک۔ ”بابائے انسانیت“ ص ۱۹۸، خوشحال نامہ ۱۹۸۰ء پشاور)

ہوائی جہاز اور راکٹ کسی دھماکے یا رسی کی مدد کے بغیر بھی اڑتے ہیں یہی اشارہ آج سے ساڑھے تین سو سال (پہلے جب کہ ہوائی جہاز اور راکٹ ابھی ایجاد بھی نہیں ہوئے تھے) خوشحال بابا نے اپنے چند اشعار میں یوں کیا ہے:-

ترجمہ:- ”اگر یہ سچ ہے کہ کاغذ کی چٹنگ اوپر اڑ سکتی ہے تو وہ بغیر ڈور کے بھی اڑا کرے۔“

ترجمہ:- ”میں نے پوچھا میں اڑ کر آسمان تک کیسے جاسکوں گا؟

کہا: یہ کام ہمت کے بال و پر کے ذریعے ہوتا ہے“

ترجمہ:- ”ہمت کے بال و پر لگا کر میں آسمانوں سے ہوا آتا ہوں“

خوشحال نے اپنے دوسرے چند اشعار میں سائنسی نکتے یوں بیان کئے ہیں:-

ترجمہ:- اے خوشحال چاروں عناصر تو (فقط) نوکر ہیں اور نوکر ہی کام کرتا ہے جس کا آقا حکم دیتا ہے۔

ترجمہ:- ”فرشتے نور سے اور جنات آگ سے ہیں“

ترجمہ:- ”آدمی چار عناصر سے مرکب ہے۔ (اگر تمہیں معلوم ہو) انکی ذات سے اس لیے فتنے اٹھتے ہیں کہ وہ آگ پانی ہوا اور مٹی کا مرکب ہے۔“

ترجمہ:- ”سونا کچھ اور چیز ہے اور گندھک کچھ اور۔ کیا ہوا اگر گندھک میں سونے کا رنگ اور آب و تاب بڑھ جاتا ہے“

کیا ہوا ان خوشحال کا یہ شعر ایک عجیب تاثر پیدا کرتا ہے:-

ترجمہ:- اگر اے آگ کے شعلوں میں جلاؤ اور راکھ ہو جائے تب بھی سیماب (پارہ) سے زندہ رہنے کا ہنر کوئی نہیں جھین سکتا“

خوشحال ”تاریخ نویس“ بھی تھے اور ”تاریخ گو“ بھی تھے۔ تاریخ گوئی کے متعلق خورشید اقبال خلک یوں رقمطراز ہیں:-

”علمی اور فنی دونوں لحاظ سے تاریخ گوئی مختصر مگر جامع اور سائنسی طریقہ استخراج کے نزدیک ایک فن ہے۔ اس کو تاریخ نویسی پر اس لئے برتری حاصل ہے کہ اس میں ایک اہم تاریخی واقعہ نہایت مختصر ہندسوں میں بیان کر دیا جاتا ہے۔ یعنی یہ کوزے میں سمندر کو بند کرنے کے مترادف ہے۔ یہ علمی طور پر سائنس نویسی پر اسی لئے برتری ہے کہ اس میں علم ریاضی کے حروف کی عددی قیمتوں کے ذریعہ خاص اصولوں اور قواعد کے تحت ایک اہم

واقعہ کے وقت کا قہقہہ کیا جاتا ہے۔ اس زاویہ سے دیکھا جائے تو تاریخ گو خوشحال کے سائنسی تخیل کی طرف ایک واضح اشارہ ملتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے اپنے کلام میں تاریخ گوئی کے ذریعے جگہ جگہ اہم واقعات کی تاریخیں بھی ہیں اور یوں اپنے زمانے کے اہم تاریخی واقعات کو اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لیے صفحہ قرطاس پر محفوظ کر دیا ہے۔

خوشحال نے آج سے کم و بیش ساڑھے تین صدیاں پہلے DNA کے مسئلہ پر یوں روشنی ڈالی تھی۔

ہر و سبب نہ چہ بہ صورت باندہی لیدہ شی

کہہ پر خیر شبی، دشناخت و رہہ درتہ واکا

ترجمہ:- ایک ایک بال جو بدن پر نظر آتا ہے۔ اگر اس پر غور کرو گے تو تم پر شناخت کا دروازہ کھل جائے گا۔

آخر میں سر اولف کیر و اور ایولن ہاؤل کی کتاب The Poems of Khushal khan Khattak (1963) سے خوشحال کی نظم ”پانی کے بلبلے“ کے ایک شعر کا انگریزی ترجمہ ملاحظہ کریں۔ اس میں بھی ایک سائنسی نکتہ پنہاں ہے:-

"Blowing bubbles bubbles blown

Are neq sooner Blown than flown

Scarcely sooner flown than ended

Bubbles burst when they are distended

And can never more be mended"

غالب اور سائنس

ظاہر ہے کہ خوشحال نے غالب سے لگ بھگ پونے دو صدیاں پہلے سائنسی تخیل کا مظاہرہ کیا۔ غالب کے زمانے تک مغربی سائنسی ترقی اور سائنسی ایجادات کی شروعات ہو چکی تھیں۔ اسلئے جب غالب نے اپنے چچا کی جاگیر کے صلے میں ملنے والی پنشن کا قرضہ خزانے کے سلسلے میں کلکتہ کا سفر اختیار کیا۔ تو اس سلسلے میں انھیں انگریزی عدالتوں سے واسطہ پڑا اور انگریزی طرز حکومت کا اندازہ ہوا۔ وہ لکھنؤ، بنارس اور دوسرے مقامات اور حالات سے بھی واقف ہوئے۔ کلکتہ میں غالب نے جدید عمارتیں دیکھیں اور ایک نیا بننا ہوا تمدن دیکھا۔ سید احتشام حسین نے بڑی خوبی سے کلکتہ اور غالب کے ذہنی تعلق پر یوں روشنی ڈالی ہے:-

”تاج محل اور لال قلعے کی عمارتوں کے لاشریک حسن کی یکمائی اور بے ہنگمی سے محروم ہوتے ہوئے بھی یہ انگریزی تعمیرات ایک الگ کیفیت رکھتی تھیں۔ بادشاہی دور کے آخری شاعر کی زکاوت ذہن ایک نئے جمہوری فن تعمیر کی زیبائش اور پوری شہر سازی کے اجتماعی آہنگ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی۔۔۔ اس نیم فرنگی، نیم ایشیائی شہر میں مشرقی اور مغربی معاشرت کا عجیب احتراج نظر آتا تھا انگریز اگر عطر لاپنجی اور پان کے استعمال سے بے خبر نہ تھے۔ تو ہندوستانی بھی دسکی اور اولڈ ٹام سے مانوس ہوتے جاتے تھے“

(احتشام حسین خان، ”غالب کا نظار“)

غالب کلکتہ سے جو خیالات اور تصورات اپنے ساتھ واپس لائے۔ وہ ان کے دلی کے

حریفوں اور ہم عصروں کے ”سرحد اور اک“ سے باہر تھے۔ غالب نے اس سفر میں نہ صرف ایک نئے طرز حکومت اور طرز سلطنت سے واقفیت حاصل کی۔ بلکہ سید احتشام حسین خان کے مطابق وہ سائنس کی حیرت زانیوں اور برکتوں کا بھی اندازہ کر چکے تھے۔ اس ضمن میں سید احتشام حسین خان کہتے ہیں:-

”غالب کی عظمت اس میں ہے کہ انہوں نے ترقی کی علامتوں اور سائنس کے امکانات کو اپنے دائرہ تخیل میں جگہ دی۔ ان سے یہ مطالبہ فضول ہے کہ انہوں نے بادشاہت کی کھلم کھلا مخالفت کیوں نہیں کی۔ محنت کش طبقہ کی رہنمائی کے لیے کچھ کیوں نہیں لکھا۔ دیکھنا چاہیے کہ انہوں نے بدلتے زمانے کو کس نظر سے دیکھا۔ اس وقت کتنے شاعر تھے۔ جو اسٹیم انجن، ٹیلیفون، ریلوے اور بجلی کا نام جانتے تھے۔ غالب نے آئین اکبری کے مقابلے میں اس نظام کو سراہا جو سائنس کی ان برکتوں سے مالا مال کر سکتا تھا۔“

(سید احتشام حسین ”غالب کا فنکار“)

کچھ ہمارے نابھہ عصر غالب کی اپنی ذہنی اُسیج اور کچھ کلکتہ میں دو سالہ قیام کے دوران جدید سائنس کے تعارفی دور کے احساس نے لکرا کے کلام میں جا بجا ایسے اشعار کا روپ دھارا جس سے ان کے سائنسی تخیل کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:-

نظر میں ہے ہماری جادو روا فنا غالب

کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

اہل علم اس شعر کے روحانی 'صوفیانہ' اور نہ جانے کس کس زاویے سے توجیح کرتے رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس شعر کا محرک غالب کے ذہن میں کائنات کے وجود میں آنے اور دوبارہ فنا ہو جانے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ گو کہ جدید سائنس کی **The Big Bang** تھیوری غالب سے بہت عرصہ بعد پیش کی گئی۔ ہمیں غالب کے اس شعر میں یہ تھیوری پوری آب و تاب کے ساتھ کا درما نظر آتی ہے پہلے مادے کا شیرازہ بکھرا اور ان اجزائے پریشان سے زمین اور دوسرے اجرام فلکی وجود میں آئے۔ قیامت میں یہ سب کچھ بھی تباہ ہو جائے گا اس جاہی کی طرف بڑھنے کے عمل کو غالب نے کس فراست اور چابکدستی سے جادہ راہ فنا سے تعبیر کیا ہے۔

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں

ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

جب غالب کے دور کے دوسرے شعراء کا کلام صنف نازک کے ناز و ادا سے مقلوب نظر آتا ہے۔ وہاں غالب کے کلام میں سائنسی استغمام کا یہ نمونہ ایک عجیب تاثر دیتا ہے۔ غالب جاننا چاہتے ہیں کہ سبزہ و گل کیا ہیں کہاں سے اور کیسے آئے۔ پھر دوسرے مصرعے میں خودی بالواسطہ طریقے سے اس سوال کا جواب دے دیتے ہیں۔ یعنی آسمان سے ابر برسا، زمین کو آباد کیا۔ اور ہوانے اس زمین میں سبزہ و گل کی پیدائش و افزائش میں مدد دی۔ غالب اگلے شعر میں ابر بننے کے عمل کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:-

ضعف سے گر یہ مہبل پہ دم سرد ہوا

باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

ذیل میں دیئے گئے شعر میں غالب ہسکواپنے سائنسی تخیل کی بھول بھیلوں میں یوں لاکھنچتے ہیں:-

تاکہ تجھ پر کھلے اعجاز ہوائے صیقل

دیکھ برسات میں سبز آئینے کا ہو جانا

ہم غالب کو آئن سٹائن کا پیش رو بھی کہہ سکتے ہیں۔ اینٹم اور اسکی کارفرمائوں کا علم غالب کو بھی تھا۔ یہ نیوٹرانز کی بے قراری نہیں تو اور کیا ہے:-

بے پردہ سوئے وادی مجنوں گذر نہ کر

ہر ذرے کے نقاب میں دل بے قرار ہے

یوں لگتا ہے کہ غالب نے اس قبیل کے اکثر اشعار کے پہلے مصرعے میں اشاروں سے کام لینے پر اکتفا کیا ہے اور دوسرے مصرعے میں کھل کر سائنس سے متعلق بات کی ہے۔ گو کہ ان تمام اشعار کو بھی خوشحال کے اسی قسم کے اشعار کیساتھ رکھا جاسکتا ہے۔ مگر آگے جو اشعار آتے ہیں انکا موازنہ خوشحال کے دیئے گئے اشعار سے کرنا سودمند ہو سکتا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب بھی کوئی کم تر جغرافیہ دان ماہر فلکیات اور ماہر موسمیات نہ تھے۔

ہے جلی تری سامان وجود

ذرہ بے پرتو خورشید نہیں

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

کچھ نہ کی اپنے جنون مار سانسے ورنہ یاں
ذره ذره روکش خورشید عالم تاب تھا

چھڑ کے ہے شبنم آئینہ برگ گل پہ آب
اے عندلیب وقت وداع بہار ہے

ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر
زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا قحط

•

اے عندلیب یک کف خس بہر آشیاں
طوقان آمد آمد فصل بہار ہے

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازیگر کھلا

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغ رہ گزار بادیاں

زخم گردپ گیا لہو نہ تھا
کام گر رک گیا روانہ ہوا

فرانسیسی سائنسدان پاسکل نے روانی خون کی تیوری غالب سے برسوں بعد پیش کی مگر ایسا لگتا ہے کہ غالب کو انسانی رگوں میں روانی خون اسکے رکنے اور جاری ہو جانے کے مضمرات سے بخوبی آگاہی تھی۔

خوشحال کی طرح غالب بھی تاریخ نویس تھا۔ اس نے مہر نیمروز اور دہلیو لکھ کر اپنے تاریخ نویس ہونے کا یقین ثبوت دیا ہے۔ چونکہ تاریخ نویسی بھی سائنسی اصولوں کے تحت کی جاتی ہے اس لیے اس فن کو خوشحال اور غالب کی سائنسی عظمت ہی گردانا جائے گا۔

موازنہ

آخر میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ خوشحال و غالب دونوں کے کلام میں جا بجا سائنسی تخیل کی کارفرمائی محسوس کی جاسکتی ہے جس سے ان دونوں شخصیتوں کے باہر عصر ہونے میں کوئی شک باقی نہیں رہ جاتا۔

خوشحال و غالب کا فلسفہ غم

خوشحال کا فلسفہ غم

”یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک جوانمرد صاحب کمال اور خود آگاہ شخص کی شخصیت کی بلندی اور ترقی کا راز فتنوں اور امتحانوں میں مضمر ہوتا ہے۔ ایسا شخص اپنی عالی فطرتی کے بل بوتے پر خارجی شر اور مصیبت کو خیر اور برکت میں بدل دیتا ہے۔ خوشحال خان بابا کے نزدیک غم ’مصیبت‘ تکلیف اور شر ایک انسان کی قدر و قیمت کو اجاگر کرنے کی ایک کسوٹی ہے“

(دوست محمد خان کامل مرحوم ”خوشحال مطالعہ ص ۸۰“)

ہمارے عظیم شاعر خوشحال کا فلسفہ غم انکی رجائیت سے وابستہ و پیوستہ ہے۔ یہاں غموں سے مراد وہ غم ہیں جو اولوالعزم لوگوں کو مہمات عظیم پر کرتے وقت پیش آتے ہیں۔ اور جو انکو

زندگی کی ڈگر پر آگے بڑھنے میں ہمیشہ کا کام دیتے ہیں۔ خوشحال اپنی بے شور زندگی کے متعلق خود فرماتے ہیں:-

”مجھ سے ابھی ایک شور رخصت نہیں ہوا ہوتا کہ دوسرا شور مجھے آلیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے میں شور و شر کے دن پیدا ہوا ہوں“

جس بچے پر آٹھ سال کی عمر میں مکان کا چھپر آگرے اور وہ اسکے نتیجے میں چند دن بے ہوش رہے۔ جو ۱۳ سال کی عمر میں اپنے باپ کے ہمراہ یوسفزیوں کے خلاف ایک معرکہ میں زخمی ہو جائے۔ جسے جوان ہونے پر ۱۸ برس کی عمر میں بین اپنی شادی کے دن سخت بخار آگھیرے جو پانچویں دن جا کر فوٹے۔ جسے ۲۸ برس کی عمر میں حیم ہو جانا پڑے اور اپنے قبیلے کی سرداری سنبھالنی پڑے۔ جو پچاس برس کی عمر تک یہ ذمہ داری احسن طریقے سے پوری کرتے ہوئے مغل بادشاہوں کے لیے ”بلخ“ بدخشاں اور کابل (قلعہ تارہ گڑھ) کی مہمات میں حصہ لیتا رہا ہو۔ جسے ۵۱ برس کی عمر میں مغل گورنر کابل کی ایک سازش کے تحت گرفتار کر کے پانچ سلاسل پشاور سے دلی لے جایا گیا ہو۔ اور پانچ برس تک قید و نظر بند رکھا گیا ہو۔ جس دوران میں اسکے اہل خاندان اور قبیلے کو بے انتہا تکالیف کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ جس نے قید و بند سے آزادی کے بعد مغل تاجدار کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے چند معرکوں میں مغل فوج کو پے در پے شکستوں سے دوچار کیا ہو۔ جس کے خلاف مغلوں کے اکسانے پر اسکے اپنے بیٹے آٹھ کھڑے ہوئے ہوں اور آخر کار انکے ہاتھوں زنج ہو کر جلا وطنی پر مجبور ہونا پڑا ہو۔ جس کو آخری داؤ کے طور پر پشتون قبائل کو مغلوں کے خلاف متحد

کرنے میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہوا ہو۔ اور ان تمام مصائب پر مستزاد اس نے اپنی زبان کے ادب میں ایک نئی روح پھونک دی ہو تو وہ خوشحال خان خلک ہوگا۔ خوشحال اپنے بار غم پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:-

”خوشحال کا بار غم اگر پہاڑ پر ڈالو تو وہ بھی ہال جیسا پارک ہو جائے“

اپنے نصیب کو دوش دینے کی بجائے خوشحال بابا ایک نیا ڈھنگ اختیار کرتے ہوئے غم ہی کو اپنی مصیبتوں کا دوش دیتے ہیں:-

”اے غم ادنیٰ میں تیرے لائق کوئی اور بھی ہے۔ یا تم بس خوشحال ہی

کے بن کر رہ گئے ہو“

غم کے ساتھ انسان کا دو ہر ارشتہ ہوتا ہے۔ سب سے پہلے تو انسان کو بنیادی طور پر غم کی انفرادی حیثیت اور اسکے ہونے کی حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے، گو یا غم کی موجودگی کے احساس کے ساتھ زندگی کے گزارنے پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ اگلے مرحلے میں ہر انسان کو اپنی اپنی جبلت، فطرت اور حواس کے مطابق غم کے ساتھ ایک سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے یا تو غم کو غم کے طور پر من و عن تسلیم کر لیا جاتا ہے یا اس کے سامنے سینٹان کر اس کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ یا پھر رجائیت کے اسلحہ سے لیس ہو کر غم کو مار بھگایا جاتا ہے۔ خوشحال بابا نے غم کا مقابلہ سینٹان کر بھی کیا اور اس کے خلاف رجائیت کا اسلحہ بھی استعمال کیا اس سلسلے میں خوشحال کے کہے ہوئے چند اشعار پیش خدمت ہیں:-

”اس دنیا میں ہانت ہانت کی ہانتیں ہیں اور جگہ جگہ لشکر پڑے ہوئے

ہیں۔ لیکن میرا دل بڑ سکون ہے اور اپنی جگہ سے نہیں ہل رہا۔ پہاڑ تو ایسا ہی ہوتا ہے۔“

”اے خوشحال پہاڑ کا چہرہ سورج کی گرمی برداشت نہیں کر سکتا۔ کیا ہوا جو وہ کچھ دنوں کے لیے برف سے منجمد ہو جائے“

”خدا نے غم کو بغیر کسی حکمت کے پیدا نہیں کیا۔ کیونکہ غم مرد اور نامرد میں تمیز کرنے کی کسوٹی ہے۔“

”اس دنیا میں وہی جوان (بہادر) کہلانے کے لائق ہیں۔ جو سختی اور مصیبت کے سامنے سینہ سپر ہونا جانتے ہوں۔“

خوشحال نے ہمیشہ غم کو گلے لگایا اور پچھاڑ دیا۔ انکے نزدیک انسان میں غموں کو گلے لگانے اور پچھاڑنے کی خاصیت اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب وہ غیرت مند اور باہمت ہو۔ اسی لیے خوشحال نے اپنے کلام میں ہمت کو اپنانے پر بہت زور دیا ہے فرماتے ہیں:-

”اگر آسمان تمہیں شیر کے منہ میں بھی دے دے تو وہاں بھی اپنی ہمت کو قائم رکھ“

”مرد وہ اچھا جو باہمت اور باہرکت ہو۔ اور دنیا کے ساتھ اچھے بُرے وقت میں زندہ رہ سکے“

”بلند ہمت انسان اوپر ہی اوپر ترقی کرتا جاتا ہے۔ پست ہمتی انسان کو پاتال میں گرا دیتی ہے“

خوشحال کا فلسفہ رجاہیت کی طرف مائل ہے۔ بڑے سے بڑا غم بھی انہیں شکست خوردہ نہیں

کر سکتا۔ وہ مصیبتوں کے درمیان رہ کر بچنے کا ڈھنگ جانتے ہیں۔ جناب میر عبد الصمد خان اس حقیقت کا ثبوت خوشحال کے کلام کی روشنی میں ذیل کے اشعار سے دیتے ہیں:-

”سرت اور شادمانی کے دنوں میں تو ہر شخص کا دل پُر سکون اور مسرور ہوتا

ہے۔ لیکن (اصل) دل وہ ہوتا ہے جو ایامِ غم میں مردانہ اور شیر ہو۔“

”ہر شام کے بعد صبح ہوتی ہے۔ جو ٹھنکین ہو گئے وہ بالآخر مسرور و

شادان بھی ہو گئے“

”اگر میں مخوس ستارے کی گردش میں آ گیا ہوں تو کیا ہوا۔ ہلال بھی

تو کبھی کبھی گہٹا جاتا ہے“

”خدا مجھے دنیا میں بے غم نہ کرے۔ غم اور خوشحال تو آپس میں دیرینہ

دوست ہیں۔“

”میرا دل پُر سکون ہے۔ کیونکہ غم اور خوشی دونوں گذر جانے والی

چیزیں ہیں“

(میر عبد الصمد خان ”رجائیت پسند خوشحال“)

خوشحال کے کلام میں غم کے سلسلے کا ایک عجیب شعر وارد ہوا ہے۔ میں چاہوں گا کہ آپ اس سے ضرور لطف اندوز ہوں:-

”ناکھوں کے حرے ہیں کہ انہیں غم و اندوہ نہیں ہوتا۔ دنیا میں جو بھی

غم ہیں ہوشیاروں اور غفلتوں کے لیے ہیں۔“

غالب کا فلسفہ غم

”غالب کی ساری زندگی بلاشبہ اس بات کی گواہ ہے کہ وہ عمر بھر بے اطمینانی کے شدید احساس سے دوچار رہے۔ ان کے سامنے غم کا ایک پہلو دار تصور سن شعور سے فکر زیست کے آخری لمحوں تک موجود رہا۔ غم تنہائی، غم عشق، غم بے مہرئی احباب، غم ستم ہائے روزگار، غرض انہیں ہر دکھ سہنے اور ہر رنج اٹھانے کی توفیق ملی۔

غم درحقیقت فن کار کی تخلیقی قوت کے لئے بہت بڑا محرک بن جاتا ہے لیکن اس بے اطمینانی کو بعض فنکار اپنی ذات پر اس قدر طاری کر لیتے ہیں کہ اس سے مظلوم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن غالب ہر ایسی انفعالیت کی بجائے ایک اثباتی کیفیت پیدا کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے فن میں ان کے ذاتی رجحانات سے آخری حد تک ہم آہنگی موجود ہے۔ ان کے لب و لہجہ کی تندی اس نشاط آرزو کی پیداوار ہے جو لذت و رد و غم کے نتیجے میں انہیں حاصل ہوئی۔“

(سمیع اللہ قریشی ”غالب اور غم دور ان“)

ڈاکٹر محمد حسن کہتے ہیں کہ غالب نے زندگی کی حسرتوں میں تابناکی ڈھونڈی ہے۔ ناکامیوں کے باوجود آرزو مند کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا تصور غم انہیں اپنے دور کی فکر

سے علیحدہ اور ممتاز کرتا ہے:-

”درد و غم کی طرف بھی رویہ ہے جو غالب کو جدید ذہن کے لیے قابل قبول بناتا ہے۔ غالب غم آشنا ہیں لیکن غم پرست نہیں۔ وہ آرزو کرتا جانتے ہیں۔ اور اپنی دوروزہ جوانی کی شکستوں کا شمار بھی پورے درد و غم کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ لیکن اس سے تھک کر نہ وہ دنیا اور اس کی آرزو ترک کر سکتے ہیں اور نہ ذہن کو غم پرستی کے حوالے کرتے ہیں۔ وہ نہ آتش ہیں نہ میر غم کی یہ سرمستی اور جان نوازی غالب کے کلام کا بنیادی نغمہ ہے۔ غالب نے اس رویہ کو خود اس طرح یکجا کر دیا ہے:-

سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی

عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

(ڈاکٹر محمد حسن۔ ”غالب کا تصور غم“)

غالب کو بچپن میں جو آسائشیں میسر تھیں۔ وہ انہیں تا عمر چاہئیں تھیں مگر حالات نے انہیں یہ آسائشیں تو میسر نہیں کیں مگر اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر انہیں معاشی تنگ و دو میں گرفتار کر دیا مگر ان کی فطری عالی ہمتی نے اسے زندگی کرنے کا حصہ جانا اور اپنی ذکر پر خوشدلی سے آگے بڑھتے رہے:-

”عام زندگی میں غالب کو اتنے مصائب اور مصدمات سے دوچار ہونا پڑا کہ انکی قوت برداشت بہت بڑھ گئی تھی۔ چنانچہ وہ مصائب کو فائدہ و استہزاء میں از دینے کے قابل ہو گیا

تھا۔ اس سے اس کا وہ فلسفہ حیات مرتب ہوا جس کے مطابق درد جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو دوامن جاتا ہے:

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کی آساں ہو گئیں

بعض دوسرے ادباء کے نزدیک غالب حوالث زمانہ سے بُری طرح متاثر ہو کر پورے سنسار کو دکھیا تصور کر لیتے ہیں۔ گو کہ وہ غم کا خوگر ہو کر اسے اپنے اوپر طاری کرتے رہتے ہیں۔ یہ حقیقت ذیل کے اشعار میں بھی جھلکتی ہے:-

آگ سے پانی میں بجتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی در ماندگی میں تالے سے دو چار ہے

غالب کے تصور غم، فلسفہ غم اور قنوطیت کا مطالعہ کرتے وقت یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ان کے تعزل میں نہ یہ کہ شوخی کا پہلو بھی نمایاں تھا۔ بلکہ انہیں اس شوخی کلام کی وجہ سے حیوان ظریف کا درجہ بھی عطا کیا گیا۔ یہ سب غالب کی فنکاری اور جدت اداسے ہی ممکن ہوا۔ آئیے اس ضمن میں چند ارا ملاحظہ کریں:-

”غالب کی شاعری کی ساری فضا پانچمی حزینہ ارتسامات اور غمگین
ارتعاشات کی دبیز چادر پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس چادر کو آپ
جب بھی کبھی اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ غالب کے لب چاہے
کتنے ہی آٹھائے خندہ کیوں نہ نظر آئیں لیکن اس کا دل ہمیشہ محیط

گر یہ ہی دکھائی دے گا۔۔۔۔ غالب کا کلام ایسے جواہر پاروں سے
بھرا پڑا ہے جن کی چمک دمک رہتی دنیا تک مائل نہیں ہو سکتی:-

غیر لگا پھر کھلے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا
ہو چکیں غالب جلائیں سب تمام
ایک مرگ ناگہانی اور ہے

L

(شریف رزوی "غالب اور قنوطیت")

اسکے برعکس جب حالی نے اپنے استاد محترم یعنی غالب کو حیوان ظریف لکھا تو گویا ہمیں
غالب کی فطرت کے راز سے آگاہ کر دیا گیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر حسن فاروقی کا خیال
ہے۔

"غالب کو نہ معلوم کیا کیا کہا گیا ہے۔ مگر سب غلط۔ وہ حیوان ظریف
کے سوا اور کچھ ہیں ہی نہیں۔ ان کو مفکر' المیہ نگار' غزل خواں' مدح سرا'
تحمید نگار اور نہ معلوم کیا کچھ ثابت کیا گیا۔ وہ یہ سب ہیں مگر یہ سب
باتیں ان کی ظریف حیوانیت کا حصہ ہیں۔ وہ مکمل حیوان ظریف ہیں
جو اپنی ظرافت میں تمام کائنات کو ہی نہیں بلکہ ہر قسم کے جذباتی
تاثرات کو لے لیتے ہیں۔"

آگے چلکر ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:-

”میتھیو آرنلڈ نے ٹیکسہیر کے بابت جو دقیق ترین تنقیدی بات کہی ہے۔ وہ یہ ہے: **Thou Smiles and Art Still** تو مسکراتا ہے اور خاموش ہے۔ یہ بنیادی مسکراہٹ ہی ٹیکسہیر کی ہر تخلیق کی جان ہے اور یہی غالب کے ہر شعر میں موجود ہے۔ غالب کا ادراک بھی آفاقی ہے۔ جس میں دردناک سے دردناک بات کے پس منظر میں بھی ایک تخلیقی ہے جو درد کے پیچھے ایک عجیب دائمی مسکراہٹ کو چھپا ہوا دکھاتی ہے۔“

(ڈاکٹر احسن فاروقی ”حیوان ظریف“)

غالب نے اپنے ایک شعر میں قدرت سے بظاہر ایک گلہ کیا ہے مگر اس میں چھپی ہوئی غالب کی ظرافت ہم سے چھپ نہیں سکتی:-

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا

دل بھی یا رب کئی دیے ہوتے

غالب کے فلسفہ غم پر ڈاکٹر عبادت بریلوی نے گویا حرف آخر کے طور پر فرمایا ہے:-

”یوں غالب کی شخصیت میں بڑا غم ہے۔ زندگی سے ان کے

جو تعلق تھے وہ پورے نہیں ہوئے۔ انہوں نے جس بات کی تمنا

کی تھی وہ تکمیل سے ہمکنار نہیں ہوئی۔ ان کے ارمان اگرچہ بہت

نکلے ہیں لیکن پھر بھی کم نکلے ہیں۔ ان کے دل میں حسرت ہستی کا

داغ ہے اور اس صورت حال کو انہوں نے کچھ زیادہ ہی محسوس کیا ہے۔ کیونکہ ان کا دل غم کھانے میں بہت بڑا ہے۔ لیکن داغ حسرت ہستی سے پیدا ہونے والے غم اور مے گلِ قلم کی کمی سے پیدا ہونے والے رنج نے ان کے یہاں اداسی کی تاریکی پیدا نہیں کی ہے۔ اس اداسی کے باوجود ان کے یہاں روشنی کا احساس ہوتا ہے ان کا کمال یہ ہے کہ وہ اس غم کے باوجود زندگی سے دلچسپی لے سکتے ہیں۔ اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کر سکتے ہیں مسکرا سکتے ہیں۔ وہ روتے ہیں لیکن انہیں رونا نہیں آتا۔ اسی لئے وہ رونے میں بھی جتے ہیں۔ انہیں جتنے پر رونا نہیں رونے پر ہنسنا ضرور آتا ہے۔ ان کی شخصیت کی یہ خصوصیت بڑی حد تک اس سماجی تہذیب اور فکری ماحول کی پیدا کردہ ہے۔ جس میں انہوں نے آنکھ کھولی اور جس میں ان کے ذوق و شعور کا نشوونما ہوا“

(ڈاکٹر عباوت بریلوی ”غالب کے تغزل میں شوخی کا پہلو“)

مگر کیا سمجھئے کہ غالب کی نوکِ خامہ سے یہ شعر بھی نکلا ہے:-

غم نہیں ہوتا ہے آزاووں کو بیش از یک نفس

برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتمِ خانہ ہم

موازنہ

خوشحال و غالب ہر دو کے کلام میں دو ایسے اشعار وارد ہوئے ہیں جو ان نابغہ شعراء کے تصورات غم کو صاف طور پر سامنے لاتے ہیں اور ان کا فرق اجاگر ہو جاتا ہے۔ جہاں خوشحال نے کہا:-

کہ آسمان د مزکی خله و بلہ و وری

د خوشحال خاطر بہ نہ وی بی سرورہ

ترجمہ:- ”اگر آسمان اور زمین باہم بیوست ہو جائیں تو بھی خوشحال کا دل مسرت سے جی نہ ہوگا۔“

وہاں غالب حوادث کا مقابلہ اس طور کرتے ہیں:-

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام

خدا نے ہم کو دیا ہے وہ دل کہ شاد نہیں

لیکن بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو جہاں خوشحال اپنے غموں کے سامنے پہاڑ بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہاں غالب بھی غم سے شکست نہیں کھاتے اور اپنے غم و اندوہ کو مزاح و ظرافت کی ڈھال سے روکتے ہیں۔ یوں یہ دونوں اپنے اپنے طور پر غم و دوراں کا مقابلہ کرتے رہے۔

خوشحال وغالب کی نثر

اگر خوشحال جدید پشتو نثر کے بانی ہیں تو غالب جدید اردو نثر کے بانی ہیں۔ آئیے ان دونوں کی نثر پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

خوشحال کی نثر

خوشحال سے پہلے پشتو ادب میں نثر کی چند ہی تحریروں موجود تھیں۔ پشتو کے اولین نثر نگار ابو محمد ہاشم (۱۲۲۳ھ تا ۱۲۹۷ھ) تھے۔ جس نے ایک نثری کتاب ”ذمہ سالو و پرمہ“ کے نام سے لکھی۔ اس کتاب کی نثر پر عربی کا اثر نمایاں تھا۔ کیونکہ یہ عربی شاعری کی فصاحت و بلاغت سے متعلق تھی۔ یہ کتاب اب نایاب ہے۔

ابو محمد ہاشم کے بعد جس پشتو نثر نگار کا نام سامنے آتا ہے وہ قندھار کا سلیمان ماکو ہے۔ جس نے ۱۲۱۶ھ میں تذکرۃ الاولیاء کے نام سے ایک کتاب پشتو نثر میں لکھی۔ یہ کتاب پشتو نثر کے اولیاء اور شعراء کی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے۔ افغان محقق صدیق اللہ رشتین کے مطابق یہ کتاب پشتو زبان کی پہلی نثری کتاب ہے۔

سلیمان ماکو کے تقریباً دو صدیوں بعد ۱۸۲۰ھ میں مشہور پوسٹری شخصیت شیخ ملی

نے دفتر شیخ ملی کے نام سے ایک نثری کتاب لکھی جس میں زمین کے بندوبست کی تفصیل اور ہدایات دی گئی ہیں۔

شیخ ملی کے بعد ایک دوسرے یوسف علی اویس کچو خان رانی زئی نے ۹۰۰ھ میں تاریخ کچو خان کے نام سے ایک نثری کتاب لکھی۔ جس میں اس نے پشتونوں کی تاریخ اور حالات لکھے ہیں۔

اس کے بعد ۸۷۹ھ میں بایزید انصاری نے خیرالبیان کے نام سے ایک نثری کتاب چھوڑی ہے جس کا موضوع مذہب تھا۔ اس کتاب کے جواب میں ایک اور عالم حضرت اخون درویش نے بایزید انصاری کے خیرالبیان میں دیئے گئے مذہبی عقائد کو جھٹلانے کے لئے ۱۰۱۵ھ میں مخزن اسلام کے نام سے ایک نثری کتاب لکھی۔ جناب خاطر غزنوی ان دونوں کتابوں پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:-

”خیرالبیان اور مخزن دونوں کتابوں کی نثر صحیح اور منطقی ہے“

(خاطر غزنوی ”خوشحال نامہ“)

خیرالبیان اور مخزن کے بعد ۱۰۷۶ھ میں خوشحال خان کی نثری کتاب دستار نامہ منظر عام پر آئی۔ جسکی نثر خیرالبیان اور مخزن کی نثر کے مقابلہ میں غیر صحیح اور سادہ تھی۔ دستار نامہ سے جدید پشتو نثر کا آغاز ہوا۔ میاں سید رسول رسا کے مطابق (پشتو میں) دستار نامہ کی نثر سے بہتر نثر کسی نے نہیں لکھی۔

خوشحال بابا نے اس کتاب کے لکھنے کی وجہ اور مقصد کو کتاب کے شروع میں یوں بیان کیا

ہے:-

ترجمہ:- اس انشاء اور املا کا پانی کہ اس تصنیف کے لکھنے کا باعث ہوا یہ شعر ہے:-

دستار باندھنے والے تو ہزاروں ہوتے ہیں

لیکن صاحب دستار چند ایک ہی ہوتے ہیں

یہ شعر فراق نامہ میں وارد ہوا ہے۔ اس شعر کی دو بحریں اور دو قافیے

ہیں۔ مجھے خیال آیا کہ ایک ایسا مختصر رسالہ لکھوں جس کی عبارت

رواں ہو۔ قریب الفہم ہو۔ نام دستار نامہ اس شعر کے معنی کی نسبت

سے رکھوں۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ اس مشغلے کے ذریعے اپنی فکر کو خرچ

کروں اور یوں اپنی دلگیری کو دفع کروں اور یہ کہ اس کے لکھنے سے

کسی کا فائدہ ہو جائے ان اسباب نے میرا ارادہ اس کتاب کو لکھنے

کے لیے مصمم کیا۔

اس کتاب میں خوشحال خان نے یہ بتایا ہے کہ ایک قوی رہنما کو کن صفات کا حامل ہونا

چاہیے۔ دستار نامہ پہلی بار ۱۹۵۴ء میں پشاور سے اور ۱۹۶۶ء میں کابل سے شائع ہوئی۔

قیام الدین خام نے بھی دستار نامہ چھپوایا۔ دستار نامہ کا اردو ترجمہ جناب خاطر غزنوی نے

کیا اور ۱۹۸۰ء میں پشتوا کینڈی نے شائع کیا۔

محمد زبیر حسرت کی تحقیق کے مطابق یہ کتاب ۱۰۷۶ھ بمطابق ۱۶۶۵ء میں لکھی

گئی۔ محترمہ بی بی مریم نے لکھا ہے کہ محترمہ خدیجہ فیروز الدین نے خوشحال خان خٹک کی

زندگی پر اپنے پی ایچ ڈی (ڈی لٹ) کے مقالہ میں دستار نامہ کی تکمیل کا سال ۱۶۸۵ء بتایا ہے۔ جو صحیح نہیں ہے۔ محمد زبیر حسرت آگے چل کر کہتے ہیں:-

”پشتون نثری ادب میں اس کتاب کو پہلی جدید نثری کتاب ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اسے خوشحال خان نے رتھنپور میں اپنی امیری کے دوران لکھا۔ اور یہ کہ اس کتاب کو لکھنے کے دوران خوشحال بابا کے پاس نہ تو مطالعہ کے لیے کوئی کتب موجود تھیں اور نہ ہی کوئی دوسرے ذرائع میسر تھے۔ خوشحال خان خلک خود اعتراف کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ کتاب اپنے پچھلے مطالعہ اور اپنی علمیت کے زور پر لکھی ہے“

(محمد زبیر حسرت ”دخوشحال نامے“)

جناب خاطر غزنوی مترجم دستار نامہ اس کتاب کی افادیت اور نثری محاسن پر یوں رقمطراز ہیں:-

”خوشحال نے اپنی کتاب میں لائق دستار کے لفظ پر پوری توجہ دی ہے اور دو ابواب میں سرداری کی صفات کی نشاندہی کی ہے۔۔۔۔۔ اپنی افادیت کے لحاظ سے دستار نامہ کو افلاطون کی کتاب جمہوریہ، شیخ سعدی کی گلستان سعدی، امیر کیکاؤس بن سکندر قابوس کی قابوس نامہ اور میکاؤلی کی شہرہ آفاق کتاب The Prince (شہزادہ) کے

مقابلے میں رکھا جاسکتا ہے۔ مگر دستار نامہ ایک الگ رجحان اور مختلف نقطہ نظر کی ترجمانی کرتی ہے۔ خوشحال خان نے بیس خصلتوں کو تفصیل سے بیان کر کے بادشاہوں اور سرداروں کو اخلاقی بلند یوں کا راستہ دکھایا ہے۔ اپنے موضوع کی رفعت و وسعت اور آفاقیت کے ساتھ ساتھ دستار نامہ پشتو نثر کا نادر اولین نمونہ ہے۔ اس کی نثر سادہ اور رواں ہے جبکہ اس سے بیشتر بایزید انصاری اور اخون درویش کی تصنیفات مسجع، معقنی اور تھک عبارت کی حامل ہیں۔ یوں ہم دستار نامہ کو پشتو کی جدید نثر کا اولین حسین نقش کہہ سکتے ہیں۔ اس انداز نے آئندہ پشتو نثر پر بڑا گہرا اثر ڈالا اور پشتو ادب کے دامن کو ایسے جواہر پاروں سے نوازا۔“

(خاطر غزنوی ”خوشحال نامہ“)

خوشحال کی پشتو نثر سے متعلق چند دوسرے شعراء وادباء کی آراء سے معلوم ہوتا ہے کہ:-

”خوشحال خان خٹک نے نثر میں دو تصانیف چھوڑی ہیں۔ ایک ان کی بیاض یا روزنامہ تھا جس کا کچھ حصہ خوشحال خان کے پوتے افضل خان خٹک نے اپنی کتاب تاریخ مرصع میں شامل کیا ہے۔ مگر باقی (روزنامہ) اب دستیاب نہیں دوسری تصنیف دستار نامہ ہے“

(ڈاکٹر خالد خٹک ”خوشحال نامہ“ ۱۹۸۰ء، ص ۲۱۸)

”خوشحال بابا کی گفتار اور کردار کی تعریف اور اعتراف ہر وہ شخص کرے گا۔ جس نے دستار نامہ میں دیئے ہیں ہنر اور قیاس خصال کا مطالعہ گہری فکر و نظر کیساتھ کیا ہو“

(روحان پوسٹری، ”تاترہ اکتوبر - دسمبر ۲۰۰۱ء“ ص ۱۹۷)

پروفیسر محمد قاسم مظہر اس بارے میں یوں رقمطراز ہیں:-

”گوکہ خوشحال نثر میں عربی فارسی سے متاثر ہے۔ اور مسیح و منقہی تحریر کو اس وقت کے رواج کے مطابق بہتر سمجھا ہے۔ لیکن اس کی نثر ایسی نہیں کہ اس پر ”بلیک ورس“ کا گمان کیا جاسکے۔ خوشحال نے اپنے بعد آنے والوں کو سادگی سے لکھنے کی راہ نبھائی یعنی ایک Pioneer کا کردار ادا کیا ہے“

(پروفیسر محمد قاسم مظہر ”خوشحال مطالعہ“)

”خوشحال جدید پشتو نثر کا بانی ہے اس نے پشتو نثر کو نیا موڑ دیا۔ اسے منقہی مسیح تکلفات سے چھڑا کر بے تکلف، سادہ اور عام فہم اسلوب دیا۔ اور اس طرح اس پر ترویج و ترقی کے راستے کھول دیئے“

(فارغ بخاری رضا ہدائی، ”خوشحال خان خٹک“، مطبوعہ لوک ورثہ اسلام آباد ص ۱۵)

”خان عظیم مکان کی نثر پشتو ادب کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے وہ پہلا افغان ادیب ہے جس نے پشتو نثر کو بڑی حد تک

غیر ضروری تکلفات اور عربی فارسی کے نامانوس الفاظ سے آزاد کیا
اور عام پشتوا انداز گفتگو اور روزمرہ محاورہ کے بالکل قریب لے آیا۔

(دوست محمد خان کامل مرحوم)۔

آخر میں دستارنامہ کے آغاز کا ذکر خوشحال خان کے الفاظ میں بطور نمونہ پیش خدمت ہے۔
جناب خاطر غزنوی مترجم دستارنامہ نے انہیں پشتو سے اردو میں یوں ترجمہ کیا ہے:-
”معلوم ہونا چاہیے کہ سر پر دستار باندھنے کا مطلب نمود و نمائش نہیں۔
دستار آدمی کی حیا اور عزت کا نشان ہے۔ مرد کی حیا تمام تر دستار میں ہے۔
دستار کی اہلیت ان خصائل اور فنون پر موقوف ہے جن کے عدم حصول کی
صورت میں سراسر نقصان ہے۔ ہنر، چٹے فنون، صنعت و حرفت، عادات و
خصائل بے حد و بے شمار ہیں۔ ان کا احاطہ کرنے کے لئے عمر و نوج و درکار
ہے۔ ان کا حصول تصور سے بعید لیکن پھر بھی جس قدر ان کی تحصیل سے
انسان اہل کہلا سکے ان کا حصول لازمی ہے۔ اگر اتنا بھی نہ ہو سکے تو ایسے
شخص کو نا اہل قرار دیا جائے گا۔ وہ لائق دستار نہیں گردانا جائے گا۔“

اس مضمون کو ہم اس نوٹ پر ختم کرتے ہیں کہ خوشحال بابا نے فارسی نثر میں کوئی قابل ذکر
تحریر نہیں چھوڑی گو کہ صرف ان کا فارسی شعری کلام ہم تک پہنچا ہے۔

غالب کی نثر

اپنی فارسی نثر اور شاعری کو اپنی اردو نثر اور شاعری سے بہتر سمجھنے والے غالب کو انکی اردو نثر اور شاعری نے ہی شہرت دوام بخشی۔ غالب صرف اردو شاعری میں ہی اعلیٰ مقام نہیں رکھتے بلکہ اردو نثر میں بھی صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ انکی جدت پسندی نے ان کے خطوط کو مراسلے سے مکالمہ بنا دیا۔ طنز و مزاح ان کے ہر خط کی جان ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ فرماتے ہیں:-

”غالب کے زمانے تک اردو نثر نے ترقی کی دو بڑی منزلیں طے کی تھیں۔ ایک ملاوحتی سے فورٹ ولیم کالج تک اور دوسری فورٹ ولیم کالج سے غالب تک۔ جب مرزا غالب نے اردو میں مکتوب نگاری شروع کی تو ان کے سامنے نثر نگاری کے دو انداز موجود تھے ایک وہ پُر تکلف انداز جو فارسی انشا پرداز کی تہذیب میں اردو میں رواج پا چکا تھا۔ دوسرا سادہ اور سلیس طریقہ جس کو فورٹ ولیم کے نثر نگاروں نے رائج کیا۔ مرزا غالب نے ان دونوں طرزوں کے استخراج سے نثر نگاری کی ایک نئی طرز ایجاد کی“

(ڈاکٹر سید عبداللہ ”غالب کی اردو نثر“)

فورٹ ولیم کالج سے پہلے اردو نثر میں جو پر تکلف انداز اپنایا جاتا تھا اس میں واقعیت اور اصلیت سے زیادہ شاعرانہ رنگ کی بہتات ہوتی پُر شکوہ الفاظ کو انکے معانی پر ترجیح دی جاتی۔ مقصدیت کا عنصر کم ہوتا اور اس کے مقابلے میں عبارت کی آرائش اور زیبائش پر زیادہ دھیان دیا جاتا۔ فورٹ ولیم سے پہلے کے اردو کے دو بڑے نثری کارنامے ملا وجہی کی سب رس اور حقین کی نو طرز مرصع اسی طرز انشا کی حامل کتابیں ہیں۔

جہاں تک سادہ اور سلیس اردو نثر کا تعلق ہے تو اس کی تحریک اور ترقی فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی مرحون منت ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے فورٹ ولیم کالج کی بنا انگریزوں کو اردو سکھانے کی غرض سے رکھی گئی تھی۔ اس کے بڑے بڑے نمائندے میرامن دہلوی، حیدر بخش حیدری اور میر شیر علی انیسویں تھے۔ ان اویسوں نے اردو نثر میں فارسی اور عربی ترکیبوں کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ مگر انکی تحریروں میں بھی مسجع نگاری (یعنی قافیہ بندی جس سے نثر پر نظم کا گمان ہو) موجود تھی۔ اس دور کی نمائندہ کتاب کے طور پر میرامن کی ”باغ و بہار“ کو رکھا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کے مطابق:-

”فورٹ ولیم سے غالب تک کے عرصے میں فورٹ ولیم کے طرز کی سادہ اردو نثر کو عوام میں قبولیت نہ ملی کیونکہ یہ تحریک کلکتہ میں ظہور پذیر ہوئی۔ جو اردو کے دوسرے دو دبستانوں یعنی دہلی اور لکھنؤ سے دور واقع تھا۔ لکھنؤ کے ادبی دبستان میں ان دنوں تکلف اور مضمطرات سے

کام لیا جاتا اسلئے اس کے سامنے فورٹ ولیم کی سادگی اور سلاست کا چراغ نہ جل سکا۔ رجب علی بیگ سرور کی ”فسانہ عجائب“ اس دور کی نمائندہ تحریر ہے۔ جس میں اس دور کا بڑا تکلف طرز موجود ہے۔ فسانہ عجائب ”سادگی“ کی تحریک کے خلاف ایک ایسا احتجاج ہے جو مرغوب کن ہونے کے باوجود کامیاب نہیں ہوا۔

ان حالات میں غالب نے اردو خطوط نویسی کو ایک ایسے اسلوب سے روشناس کیا جس میں قدیم پر تکلف انداز اور فورٹ ولیم کالج کی سادہ نگاری کو یکجا کر دیا گیا۔ سادگی بول چال کی بے تکلفی نثر کی ضرورتوں کے احساس، مکتوب نویسی۔ جزئیات نگاری، جذبات، اثر آفرینی، شوقی، ظرافت اور ذومعنی الفاظ کے استعمال جیسے امتیازی خصوصیات کی وجہ سے غالب کی نثر اردو ادب کے بہترین کارناموں میں شمار ہوتی ہے۔

”غالب نے اگرچہ اردو شاعری کو نیا رنگ، نیا آہنگ دیا مگر اردو نثر کو انہوں نے ایک معنی میں نئی زندگی دی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی اردو نثر کی اہمیت فارسی نثر سے زیادہ ہے۔ فارسی میں وہ ایک صاحب طرز انشا پرداز اور کہنے مشق استاد ہیں مگر اردو میں وہ جدید نثر کے بانی اور مکتوب نویسی کے راہ نمایاں ہیں“

(آل احمد سرور ”غالب کی عظمت“)

ڈاکٹر شوکت ہنزوا ری کے مطابق:-

”غالب کی باد بہار طبیعت کی حسن آرائی کا تماشا دیکھنا ہوتا ان کے خطوط پڑھیے۔ خطوط میں اپنے یار دوستوں سے دوستانہ چھیڑ چھاڑ یوں جاری رہتی تھی۔

”سنو میاں سرفراز حسین ہزار برس میں تم نے مجھے ایک خط لکھا۔ اس خط کو پڑھتا ہوں اور ڈھونڈتا ہوں کہ میرے واسطے کوئی بات ہے مجھ کو کیا پیام ہے کچھ نہیں شاید دوسرے صفحے میں کچھ ہو۔ ادھر خاتمہ بالخیر یا رب سرنامہ میرے نام کا۔ آغاز تقریر میں القاب میرا پھر سارے خط میں میرن صاحب کا جھگڑا یہ کیا سر ہے؟ میں ایسے خط کا جواب کیوں لکھوں میری بلا لکھے۔ اب جو تم خط لکھو گے اور میرن صاحب کا نام اور ان کے لیے سلام تک بھی اس میں نہ ہوگا تو میں اس کا جواب آنکھوں سے لکھوں گا“

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:-

”مجھ کو دیکھو نہ آزاد ہوں نہ مقید نہ رنجور ہوں نہ تندرست نہ خوش ہوں نہ ناخوش نہ مردہ ہوں نہ زندہ۔ جنے جاتا ہوں باتیں کئے جاتا ہوں۔ روٹی روز کھاتا ہوں۔ شراب گاہ گاہ چیتا ہوں جب موت آئے گی مر رہوں گا“ شکر ہے نہ شکایت جو تقریر ہے بر سبیل حکایت“

غالب اپنے گرد و پیش کا نقشہ اپنے خطوط میں اس طور کھینچتے کہ اپنے مکتوب الیہ کو اپنے

ماحول میں سمجھنے لگتے :-

”کھڑی میں بیٹھا ہوں۔ بٹی لگی ہوئی ہے۔ ہوا آ رہی ہے۔ پانی کا
جھرجھرا ہوا ہے۔ حقہ پی رہا ہوں۔ یہ خط لکھ رہا ہوں۔ تم سے باتیں
کرنے کو جی چاہیہ باتیں کر لیں“

غالب سے پہلے مکتوب نگار اپنی شخصیت اور سیرت کو چھپانے میں کامیاب رہتے تھے۔
ڈاکٹر شوکت مہزوری کے مطابق ”غالب کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ بے باکی کے ساتھ
اس آئینہ کے سامنے آ کر آنچھی فرمایم ہستم کہتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ اس لئے ان کی
خوہیاں ہی نہیں ان کی برائیاں بھی ہمیں صاف صاف نظر آئیں۔ ان کی توانائیاں ہی نہیں
ان کی کمزوریاں بھی ہم نے دیکھیں۔“

(ڈاکٹر شوکت مہزوری ”غالب خطوط کے آئینے میں“)

مالک رام نے اپنے مضمون آزاد بنام غالب میں غالب کی اردو نثر کو مولانا محمد حسین آزاد
کی تنقیدی نظر سے یوں دیکھا ہے :-

”یہاں تک تو نظم کا بیان تھا۔ اب ڈراموں کا بھی سن لیجئے۔ جس کے متعلق لوگ کہتے ہیں کہ
نئی اردو کا بانی بلکہ موجد غالب ہے۔ اور اردوئے معلّٰی اس دین کی ”ایزدی“ کتاب ہے۔
مولانا محمد حسین آزاد غالب کے اردو خطوط کے مجموعے اردوئے معلّٰی پر تبصرہ کرتے ہوئے
لکھتے ہیں :-

”اس مجموعے کا نام مرزا نے خود اردوئے معلّٰی رکھا۔ ان خطوط کی عبارت ایسی ہے گویا

سامنے بیٹھے گل افشانی کر رہے ہیں۔ مگر کیا کریں کہ ان کی باتیں بھی خاص فارسی کی خوش نما تراشوں اور عمدہ ترکیبوں سے مرصع ہوتی تھیں۔ بعض فقرے کم استعداد ہندوستانیوں کے کانوں کو نئے معلوم ہوں تو وہ جانیں یہ علم کی کم روایتی کا سبب ہے چنانچہ (غالب) فرماتے ہیں:-

”اب درنگ و رزی کی تقصیر معاف کیجئے“

”یہ رجبہ میری ارزش کے فوق ہے“

مولانا آزاد کے مطابق غالب اردو نثر میں فارسی ترکیبوں اور محاوروں کا ترجمہ لکھتے تھے۔ جو اردو کے اہل زبان کے روزمرہ کے خلاف ہوتا ہے۔ ان کی اردو سوائے غیر سنجیدہ تحریر کے اور کسی مصرف کی نہیں اور ان کے اردو خطوط عام قاری کے لیے بے مزہ ہیں۔

(مالک رام آزاد بنام غالب آجکل۔ دہلی)

آئیے اب زاویہ بدلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ معروف غالب شناس ڈاکٹر اعجاز حسین غالب کی نثر کے متعلق کیا تاثر رکھتے ہیں:-

”غالب کی علمی جولان گاہ سے متصل ایک نیامیدان نظر آتا ہے۔ شعرو

شاعری کے گلستان سے نکل کر وہ نثر کی دنیا میں بھی خراماں خراماں چلتے

ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اردو میں انہوں نے مکتوب نگاری کا وہ انداز

پیدا کیا جو عہدیم المثال تھا۔ جو شہرت اور انفرادیت ان کے اردو خطوط

نصیب ہوئی وہ نہایت اہم و ہمہ گیر تھی۔ یہ خطوط اپنی اندرت کی وجہ سے

بہت جلد مقبول ہو گئے۔ یہاں ان کی مکتوب نگاری کی خصوصیات پر تبصرہ کرنا مقصود نہیں۔ بہت کچھ لکھا جا چکا ہے کہنا صرف یہ ہے کہ ان کے اشعار کی طرح خطوط میں بھی ندرت و جاذبیت تھی بلکہ ایک لحاظ سے یہ نثری خدمت شعری کاوش سے بہتر ثابت ہوئی۔۔۔ یہ عجیب بات تھی کہ جو شخص نظم کے میدان میں اتنا مشکل پسند ہو وہی شخص نثر کی دنیا میں قدم رکھتے ہی اتنا سہل پسند و بے تکلف ہو جائے کہ ہر کس و نا کس اس کو بغیر کسی دماغی کاوش کے آسانی سے سمجھ لے۔ انداز بیان دیکھ کر یقین کرنا پڑے کہ کچھ عجیب مرزا نے۔۔۔ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔“

(ڈاکٹر انجینئر حسین ”غالب اپنے زمانے میں“)

خطوط غالب کے متعدد مجموعے مختلف اوقات میں مختلف ناموں سے چھاپے گئے۔ یعنی عموماً ہندی، اردو، معنی، ادبی خطوط غالب، مکاتیب غالب، خطوط غالب، نادرۃ غالب، نادر خطوط غالب اور غالب کی نادر تحریریں۔ ان مجموعوں کی طباعت کا عرصہ غالب کی وفات کے سال ۱۸۶۹ء سے لیکر ۱۹۶۲ء تک پھیلا ہوا ہے۔

غالب کا بہترین خط - میری نظر میں

یوں تو غالب کے خطوط دلچسپ کھلے لہجے اور سادگی کی اکسل مثالیں ہیں۔ لیکن وہ جو ہم کہتے ہیں کہ غالب نے قرن خطوط نو پسئی کو مکالمے کا فن بنا دیا ہے۔ تو اس کی بہترین مثال اب تک میری نظر سے گزری وہ اردوئے معلیٰ (مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل پبلشر مجلس ترقی اردو لاہور) میں ص ۳۳۹ پر موجود غالب کا یہ خط ہے۔ آپ بھی پڑھیے اور خط اٹھائیے:

خط بنام ظہیر الدین خان صاحب

پنج شنبہ ۲ نومبر ۱۶۶۵ء *

”اقبال نشاں“ حکیم ظہیر الدین احمد خان کو فقیر غالب علی شاہ کی دعا یہو نچے۔ کہوں میاں تمہارا مزاج کیسا ہے؟ اور تمہارے بھائی تفضل حسین خاں کیسے ہیں؟ اگر ملو تو میری دعا کہنا اور مزاج کی خیر پوچھنا اور اپنے والد ماجد کو بھی میری دعا کہنا۔

سنو میاں ظہیر الدین تم اپنی دادی کے پاس چلے جاؤ اور ان سے میری اور دونوں لڑکوں کی عافیت کہو۔ اور پوچھو کہ شہاب الدین خان نے اکتوبر مہینے کی تنخواہ کے پچاس روپے پہنچا دیئے یا نہیں؟ کیدار ناتھ ڈیوڑھی پر آ کر جعفر بیگ وقادار وغیرہ کی تنخواہ بانٹ گیا یا نہیں؟ اچھا میرا بیٹا! یہ دونوں باتیں اپنی دادی سے پوچھ کر جلد مجھ کو لکھو۔ دیر نہ کیجیو۔

خط کے جواب کا طالب 'فقیر غالب'

آخر میں غالب کی اردو نثری طرز تحریر میں سفر نصیبی، انسان دوستی اور بے تکلفی کے عناصر کو اجاگر کرنے کی غرض سے ایک خط کا کچھ حصہ پیش کیا جاتا ہے:-

”قلندری و آزاگی و ایثار و کرم کے جو دعاوی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے ہیں بقدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاشی ہاتھ میں لوں اور اس میں خطر نچی اور ایک ٹین کا لوٹا معد سوت کی ری کے لٹکا لوں اور پیادہ پا چل دوں، کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف جا پہنچا، نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں، اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی، جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو نیگا بھوکا نظر نہ آئے۔ خدا کا مقبور، خلق کا مردود، بوڑھا، ناتواں بیمار، فقیر، کبکٹ میں گرفتار، میرے اور معاملات کلام و کمال سے قطع نظر کرو۔ وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگے، وہ میں ہوں“

موازنہ

جب ہم خوشحال و غالب جیسی نابہ شخصیتوں کی نثر کا موازنہ کرتے ہیں تو کھلتا ہے کہ دونوں کی نثری کاوشوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ یہ ضرور ہے کہ غالب نے خوشحال کی نسبت اپنی نثر میں زیادہ بوقلمونی دکھائی ہے۔ دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو دونوں نے اپنی اپنی زبان کی جدید نثر کی بنیاد رکھی۔

خوشحال و غالب کے کلام میں تصوف

خوشحال و غالب کے کلام میں تصوف پر بحث کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ تصوف کے نظریے کے بنیادی نکات ذہن نشین کر لئے جائیں۔ جب ہم تصوف کی بات کرتے ہیں تو یونانی تصوف، عجمی تصوف یا اسلامی تصوف کی بات کر رہے ہوتے ہیں اور جب عجمی یا اسلامی تصوف پر بات چھیڑتے ہیں تو شریعت، طریقت، معرفت، حقیقت، مجاز، وحدت الوجود اور وحدت الشہود جیسے الفاظ سامنے آتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ سب کچھ آپس میں اس طرح سے گڈمڈ ہیں کہ قاری کو ایک پیچیدگی کا احساس دلائے بغیر نہیں رہے۔ آئیے سب سے پہلے تصوف کے متعلق جانیں۔ ماہر خوشحالیات اور پشتو کے معروف ادیب میاں سید رسول رسا نے اسکی تفصیل یوں دی ہے:-

”افلاطون کو یونانی تصوف کا بابا کہا جاتا ہے افلاطون کا نظریہ امثال اور نظریہ حسن محض عجمی تصوف کی بنیاد ہیں۔ اگرچہ ظاہراً مسئلہ وحدت الوجود عجمی تصوف کی روح نظر آتا ہے۔ افلاطون کا خیال تھا کہ جو دنیا ہماری نظروں کے سامنے موجود ہے یہ حقیقی دنیا نہیں ہے۔ بلکہ حقیقی دنیا کوئی اور ہے۔ وہ عالم امثال کی دنیا ہے اور ہماری دنیا جیسا کہ ہم کو نظر آتی ہے عالم امثال کی دنیا یا حقیقی دنیا کا سایہ یا عکس ہے۔ افلاطون اس کی مثال یوں دیتے ہیں کہ

اگر ایک شخص کسی غار کی طرف منہ کر کے بیٹھ جائے اور اسکی پیٹھ پیچھے سے قسمائیں مخلوقات گزریں اور وہ شخص غار کی اندرونی دیوار پر ان مخلوقات کا محض سایہ ہی دیکھ پاتا ہو اور اصلی مخلوقات اسکی نظروں سے اوجھل ہی رہیں۔ تو یہ افلاطون کے نظریہ امثال کا ثبوت ہوگا۔ یا آجکل کے زمانے میں سینما ہال کی مثال لیں۔ آپ ایک پروے کی طرف منہ کر کے بیٹھے ہیں اور آپکے پیچھے ایک مشین میں سے اصلی تصاویر کو گزار کر روشنی کی شعاعوں کے ذریعے ان کا عکس پروے پر ڈالا جاتا ہے۔ تو آپ اصلی تصاویر نہیں بلکہ ان کا عکس دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اسکے علاوہ افلاطون کا نظریہ حسن محض یہ تھا کہ جمال حقیقی کی خوبصورتی انسان کو ایک حسین چہرے میں اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ اور پھر یہ جمال انسان کو ہر چہرے پر نظر آنے لگتا ہے۔ بلکہ اسے یہ پوری کائنات اس جمال کے نور سے منور نظر آتی ہے۔ افلاطون کے حسن محض کا نظریہ اس پشتو شعر میں بند نظر آتا ہے:-

اول خوبن مہی دیار حسن بیا مہی خوبن ہمہ حسین وو
اوس پہ داسہی ثنائے مقیم یم چہی مہی خوبن دی خیال د حسن
ترجمہ:- پہلے پہل مجھے یار کا حسن پسند آیا بعد میں تمام حسین اچھے لگنے لگے۔ اور اب میں ایک ایسے مقام پر مقیم ہوں کہ مجھے حسن کا خیال تک بھاتا ہے۔

آگے چلکر میاں سید رسول رسا وحدت الوجود پر اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:-

”وحدت الوجود کا نظریہ چین کے محی الدین العربی نے دیا ہے۔

تصوف کے اس مسئلہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اس عالم میں ہزاروں لاکھوں

مختلف چیزیں نظر آتی ہیں۔ یہ ظاہری کثرت دراصل ایک وحدت محض ہے۔ یا وحدت محض کی مختلف شکلیں یا رنگ ہیں۔ ان تمام چیزوں میں وہی ایک ذات جاری و ساری ہے اور ہر چیز میں اس کا حسن جھلکتا ہے۔ یا اس کے سوا دوسری کوئی چیز نہیں۔ تمام موجودات اور ممکنات اس وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کا کرشمہ ہیں۔ وحدت الوجود کے اس فلسفہ سے صوفیاء نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ یہ تھا کہ دنیا اور مافیہا کی کچھ وقعت نہیں کیونکہ اس دنیا کی کوئی چیز حقیقی نہیں ہے۔ اسی لیے دنیا کی چیزوں میں دل لگانا ایک عبث کام ہے۔۔۔ ہندوستان میں مسئلہ وحدت الوجود کی اصطلاح حضرت مجدد الف ثانی نے سب سے پہلے استعمال کی اور فرمایا کہ یہ حقیقی تصوف میں ایک مقام ہے اور چاہیے کہ سالک اس مقام سے نکل آئے کیونکہ اگر وہ اس مقام پر پھنس کر رہ جائے تو وہ راستہ بھول جائے گا اور بھٹک جائے گا۔ اسلامی تصوف میں دنیا کی زندگی آخرت کا گوشہ ہے۔ یہ زندگی بیکار نہیں ہے دنیا حقیقی ہے۔“

(میاں سید رسول رسا ”مقدمہ ارغمان خوشحال“)

معلوم ہوا کہ اسلامی تصوف میں دنیا کو چھوڑنا یا اس سے منہ موڑنا منع ہے۔ مسلمان اپنی دنیاوی زندگی اسلام کے اصولوں اور تعلیمات کے مطابق گزارتا ہے اور ہر دم اس کی نظر

اللہ کی ذات پر ہوتی ہے۔ اگر مسلمان دنیاوی کاروبار چھوڑ دے تو اسلامی تصوف کی نظر میں یہ ایک غیر اسلامی قدم ہوگا۔

لیکن شاعری میں حقیقت اور مجاز کے الفاظ کا سرچشمہ تصوف ہے۔ شاعری جذبات کے اظہار کا نام ہے۔ اور تصوف کی برکت سے ان جذبات میں پاکیزگی اور شدت پیدا ہوتی ہے۔ اور چونکہ تصوف کا خمیر عشق حقیقی یا عشق الہی ہے اور عشق حقیقی ایک نہایت ہی پاک جوش اور بڑے مطہر اور مقدس جذبے کا نام ہے کہ یہ جذبہ انسان میں اولیٰ اخلاقی اور روحانی زندگی اور آگہی پیدا کرتا ہے۔ اس لئے جب شاعری میں تصوف کا مضمون جاگزیں ہوا تو عشق مجازی کی باتوں میں بھی ایک مزہ پیدا ہو گیا۔ اور غمی شعر میں بہ حیثیت مجموعی ایک زندہ لوب کی روح دوڑ گئی۔ اور یوں عجم کی شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ اس لمبی بحث کو سمیٹتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ خوشحال و غالب کی شاعری میں تصوف کا کیا مقام ہے۔ آئیے پہلے خوشحال کی دنیا میں چلیں۔

خوشحال کی شاعری میں تصوف

خوشحال کے زمانے میں پشتو شاعری تصوف کے نام سے آشنا ہو چکی تھی۔ خوشحال خود تو صوفی مشرب انسان نہ تھے۔ مگر ان کے کلام کے مطالعہ سے ایسا معلوم

ہوتا ہے کہ ان کو تصوف کی باریکیوں کا علم حاصل تھا۔ جن میں سقراط کا نظریہ حسن مطلق بھی شامل ہے۔ جس کے مطابق حسن زندگی کا مقصد بھی ہے اور حاصل بھی۔ اور یہ کہ مرد کامل کی پہچان بھی یہی ہے کہ اس کے قول و فعل میں حسن ہو۔ اس کے تصورات حسین ہوں اور اسے حسن مطلق کا عرفان حاصل ہو۔ ڈاکٹر اقبال نسیم خٹک حسن مطلق یا حسن ازل اور خوشحال کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:-

”خوشحال نے جب اس دنیا میں آنکھیں کھولیں۔ تو اپنے ساتھ ایک حسن بین نظر اور حسن شناس حراج بھی لائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظر نے حسن کے ہر پہلو سے پردہ اٹھایا۔ نباتاتی اور انسانی حسن سے لیکر حسن ازل تک کوئی ایسا موضوع نہیں جس پر خوشحال نے اپنے جمالیاتی افکار یا تاثرات کا اظہار نہ کیا ہو“

ڈاکٹر صاحب آگے چل کر فرماتے ہیں:-

”حسن ازل کے متعلق خوشحال کا نظریہ اسلامی تصورات پر مبنی ہے کیونکہ وہ ایک بڑے عالم اور مذہبی انسان تھے۔ اور احکام شریعت کے پابند تھے۔ گو خوشحال حسن ازل تک رسائی حاصل کرنے کے لئے تصوف کا چھوٹا راستہ پسند کرتے ہیں لیکن یہ بھی جانتے ہیں کہ طریقت کا راستہ شریعت کی راہنمائی کے بغیر خطرے سے خالی نہیں۔ اسی لئے خوشحال شریعت کو ایک درخت سے تعبیر کرتے ہیں اور

طریقت کو اس درخت کی شاخ کا درجہ دیتے ہیں“

خوشحال فرماتے ہیں:-

شریعت دونی پیخ دے

طریقت لکھ بناخونہ

حقیقت دونی پانی

معرفت میوہ گلوںہ

ترجمہ:- شریعت درخت کی جڑ کے مانند ہے

طریقت اس درخت کی شاخیں

حقیقت اس درخت کے پتے ہیں

معرفت اس درخت کے پھل اور پھول

خوشحال کا پکا عقیدہ ہے کہ یہ دنیا اور اس کے تمام موجودات صرف اللہ نے پیدا کئے ہیں۔ اور

کائنات کے ہست و نیست کا اختیار بھی اسی کے ہاتھوں میں ہے۔ اسے نہ آرام کی

ضرورت ہے اور نہ ہی نیند کی۔ وہ حسی قیوم ہے اور اپنے آپ میں مکمل ہے۔ اسے

کائنات کا نظام چلانے کے لئے کسی کی مدد لینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ تمام تعریفیں

اسی کے لیے ہیں:-

کل ثناء پہ ہفہ پنائی

جہی ثنائی ہر خوگ وائی

ترجمہ:- ساری تعریفیں اسی کو جحتی ہیں۔ جسکی شاہر شخص کہہ رہا ہے۔

(ڈاکٹر اقبال نسیم خٹک ”خوشحال کا تصور جمال“)

خوشحال میں صوفیانہ تجسس اور سوجھ بوجھ کے تین عوامل نظر آتے ہیں۔ سب سے پہلے وہ اپنے اساتذہ حضرت مولانا عبدالکیم سیالکوٹی اور حضرت شاہ اویس صدیقی ملتان کی صحبت میں رہ کر تصوف کے مضمون سے متعارف ہوئے۔ دوسرے ان کو حضرت شیخ رحکار کا کاخیل سے جو عقیدت تھی۔ اسکی وجہ سے اور حضرت شیخ کی صحبت کی وجہ سے تصوف کی طرف خوشحال کا میلان طبع ہونا قدرتی امر تھا۔ تیسری وجہ خوشحال کا اپنا وہ علم تھا جو انہوں نے اپنی کوششوں اور مطالعے سے حاصل کیا تھا۔ اس طرح وہ تصوف کی باریکیاں جاننے میں کامیاب ہوئے۔

خوشحال کی عشقی اور تصوفی شاعری پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک کہتے ہیں:-

”ان اور ایسے ہزاروں اشعار میں خان (خوشحال) بالکل ایک رنگین بیان، حسن و عشق کے دائمی شاعر نظر آتے ہیں۔ لیکن جب تصوف کی باریکیوں کا بیان کرتے ہیں تو ایک صاحب حال و صاحب معرفت صوفی لگتے ہیں۔ اور طریقت و سلوک کے مراحل سے جیسے کہ خود گزر چکے ہوں۔ تصوف میں ان کے زیادہ تر اشعار شیخ ابن العربی کے مسلک سے متعلق نظر آتے ہیں۔ یعنی خان وحدۃ الوجود کے قائل نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ شہودی وجود پر مبنی نظریات بھی خان کے کلام میں ملتے ہیں۔ شہودی وحدت کے بارے میں فرماتے

ہیں:-

کہ مسجد گوری کہ دیہ
 وارہ یو دے نشتہ غیر
 یو مہی بیا موند بہ ہر خہ کنہی
 چہی مہی وکڑہ دزہ سیر
 خوشحال یو وینی خوشحال دے
 ورتہ ورک دے غیر وزیر
 ترجمہ:- مسجد میں دیکھو چاہے دیہ میں
 سب میں وہی ایک ہے کوئی غیر نہیں
 میں نے ہر چیز میں اس واحد کو پایا
 جب میں نے اپنے دل کی سیر کی
 خوشحال خوش ہے کہ ایک ہی واحد کو دیکھتا ہے
 اور غیر و زیر اس کے لیے گم ہیں

(ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک ”رباعیات خوشحال“)

پشتو زبان کے مشہور شاعر، ادیب اور تصوف کے علیردار امیر اسفخر لہین جناب امیر حمزہ
 شنواری نے خوشحال کے کلام میں تصوف کے بارے میں کئی مقالے لکھے ہیں۔ اور خوشحال
 کے ایک تصوفی شعر سے متاثر ہو کر تو صرف ایک شعر پر پوری کتاب لکھ ڈالی ہے۔ اور اس

میں خوشحال کے تصوف پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ جناب امیر حمزہ شنواری اپنے ایک مقالے میں فرماتے ہیں:-

”جب خوشحال بابائے عقل کی پرواز کے سلسلے میں عقل و آگہی کو

انسانی روح کے حوالے کر دیا تو انکے یقین کی روشنی میں اضافہ ہوا“

خوشحال کا عارفانہ کلام بھی انکی تصوفی شاعری کی ایک کڑی ہے۔ افغانی محقق جناب عبدالحی حبیبی اس ضمن میں فرماتے ہیں:-

”معرفت کی دنیا میں خوشحال ظاہری حواس اور مادی خواہش کے علاوہ ایک دوسری روح اور باطنی حواس میں یقین رکھتے ہیں جن کے ذریعے سے معرفت تک پہنچا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ کہا ہے:-

عارفان دسر پہ سترگو گوتے کیپدی

دخیل زہرہ سترگو گوری تعاشا کا

ترجمہ:- عارف اپنے سر کی آنکھوں پر انگلیاں رکھ کر اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں ، اور تماشا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر اقبال نسیم خٹک اپنے تحقیقی مقالہ (اور کتاب) خوشحال اور تصور جمال میں خوشحال کے تصوفی رنگ کو یوں سمیٹتے ہیں:-

”ان حوالوں اور مباحث کے نتیجے میں انسان اس حقیقت تک پہنچتا

ہے کہ خوشحال کا ”حسن ازل“ اور ”نور مطلق“ کے متعلق خیال نہ تو

”ترک دنیا“ کی بنیاد پر ہے اور نہ ہی نفس کو قتل کرنے پر۔ خوشحال نفس کے ساتھ جہاد کو ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن بے جا نفس کشی کے ذریعے انسانی وجود پر ظلم کرنے کے شدید مخالف ہیں۔ ان کا نظریہ حسن ازل اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر محکم کھڑا ہے۔ اسی لیے ان کے فکر و فن میں ایک خوبصورت اعتدال نظر آتا ہے ایک ایسا اعتدال جو دین اور دنیا دونوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ ہم جب اس پورے باب پر غور کرتے ہیں تو محسوس کر سکتے ہیں کہ خالق کائنات نے اس بندے (خوشحال) کو کتنی تیز نظر، قوت مشاہدہ اور کتنا زبردست جمالی ذہن دیا ہے۔ ایک ایسا ذہن جس نے بیک وقت زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈال رکھی ہے“

(ڈاکٹر اقبال نسیم تنگ ”خوشحال کا تصور جمال مابعد الطبیعیاتی حسن“)

آخر میں تصوفی رنگ لئے ہوئے خوشحال بابا کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

پہ ہر خٹہ کنسی نندارہ دھغہ منہ کرم

چھی لہ دیوی پیدایی ناپدید شو

ترجمہ:- ہر شے میں اسی رخِ زیبا کا دیدار کرتا ہوں۔ جو کثرتِ شہود کی وجہ سے نامشہود ہو گیا

هر تشنه چو د وحدت په سیند سیراب شه

نور همه جهان و ده و ته سراب شه

ترجمہ:- جو پیاسا بھی ایک دفعہ دریائے وحدت سے سیراب ہو جائے تو پھر ساری دنیا اس کی نظر میں سراب بن جاتی ہے۔

آخر میں ظاہری اور حقیقی حسن سے متعلق خوشحال کا وہ شعر جو سراوانف کیر و اور سر ہوئل کی ”دی پونٹنر آف خوشحال خان خٹک“ میں شامل کئے گئے ایک قصیدے میں شامل ہے:-

د بسکلیو د جمال په ننداره کبسي ما خدائيه بيا موند

لږ نه دي له مجازه حقيقت ته رسيدلي

ترجمہ:- حسینوں کے جمال کے نظارے میں میں نے خدا کو پایا۔ اور یوں مجاز سے حقیقت تک پہنچنے والے کچھ کم نہیں ہیں۔

سراوانف کیر و اور سر ہوئل کی کتاب میں اس شعر کا انگریزی میں ترجمہ یوں کیا گیا ہے:-

"For me fair forms reveal, Such ecstasy I feel, I Swoon my senses real, Before all loveliness, All sense transcended in the form I see, Semblance that merges in Reality."

غالب کی شاعری میں تصوف

غالب کے مزاج میں فلسفیانہ انداز نظر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ تا آنکہ قاری ان کے حیات و کائنات کی حقیقت، مادہ، روح اور سب سے بڑھ کر خدا کی ہستی سے متعلق خیالات کا مطالعہ کرتے کرتے ایک ایسی سرحد پر آکھڑا ہوتا ہے جس کے ایک طرف فلسفہ کا علاقہ ہے تو دوسری طرف تصوف کی پریچہ وادی۔ کیا غالب نے خود بھی یہ سرحد پار کی۔ کیا انہوں نے تصوف کی وادی میں قدم رکھا اور اگر رکھا تو اسکی نوعیت کیا تھی۔ کیا غالب صوفی تھے۔ یہی وہ سب سوالات ہیں جن کے جوابات قاری کو چاہئیں اور ان سوالات کے تسلی بخش جوابات ڈھونڈنا ہماری آج کی نشست کا مقصد ہے۔ آئیے سب سے پہلے اردو ادب میں تصوف کے مقام کو جانیں:-

”تصوف نفی ذات اور نفی کائنات پر زور دیتا ہے لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اس کالنفی کا تصور اثبات سے پیدا ہوا ہے۔ صوفی ایک وجود واحد کو ماننے کے بعد ہی نفی ذات و نفی کائنات کی تلقین کرتا ہے اور اسی وجود واحد میں اپنے آپ کو ضم کر دینے کے لیے اس کے تصورات میں جوش و انبساط کی ایک زبردست کیفیت پائی جاتی ہے۔ یہ بات

بھی غور طلب ہے کہ قدیم زمانہ میں جب سماجی اور اخلاقی قدریں متزلزل ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں تو اکثر صوفیوں اور مجتہدوں ہی کی زندگی اور تعلیم میں انسان دوستی کا سراغ ملتا ہے۔ ایسے حالات میں تصوف ایک ذہنی بغاوت کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔“

(ابو محمد سحر ”غالب کا فلسفہ“)

اب اردو ادب میں حسن کے زاویے سے بھی تصوف کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اردو غزل کے بارے میں فراق گورکھپوری نے کیا کہا تھا۔ پروفیسر افضل حسین اظہر بتاتے ہیں:-

”شاعری زندگی کے ہر منظر میں ایک ماورائی یا روحانی لامحدود مابینیت کا احساس کرتی ہے۔ اور اسی کو جمالیات کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہر شے بیک وقت لطیف بھی ہے، کثیف بھی، موجود بھی، معدوم بھی، محدود بھی ہے۔ لامحدود بھی، کثرت کی مثال بھی ہے اور وحدت کی بھی، الغرض قضائے عام ایک ماورائے عالم حقیقت ضرور پائی جاتی ہے اور شاعر کا مذہب اسی عالمگیر حقیقت کا احساس ہے۔“

آگے لکھتے ہیں:-

”تصوف کا مرکزی اصول، وحدت الوجود یا حقیقت کا زمان و مکان و سبب و علت سے معرا ہونا ہے۔ حسن کا تصور آپ محدود طریقے پر کر ہی نہیں سکتے، کیونکہ یہاں مقداری تصور کا گذر ہی نہیں۔ کتنا اور

کس قدر کا مفہوم ہم حسن سے متعلق نہیں کر سکتے۔ حسن کا تیز احساس ہمیں لامحدود کی طرف لے جاتا ہے۔ جتنا یہ احساس تیز ہوگا اتنا ہی حسن ہمہ گیر ہوگا۔

(پروفیسر افضل حسین اعظمی ”غالب و اقبال کی ہم آہنگی“)

اس مقام پر نیاز فتح پوری ہماری مدد کو کھینچتے ہیں:-

”دراصل غالب کا تصوف اور فلسفہ ایک مستعار چیز تھا اور غالب نے اسے غالباً اس لیے اختیار کیا تھا کہ وہ ”برائے شعر نقش خوب است“ یا یہ کہ اس زمانہ کے محافل شعر و سخن میں اس چیز کی مانگ تھی اور غالب کے لیے ضروری تھا کہ ان مجالس میں درخور پانے کے لیے وہ اس رنگ کے اشعار بھی کہتے“

نیاز فتح پوری آگے فرماتے ہیں:-

”اس سلسلہ میں پھر غالب کی وہی کبھی ہوئی بات سامنے آ جاتی ہے ”فارسی میں تاجی نقش ہائے رنگ رنگ“ اور اس میں شک نہیں کہ اس نقش ہائے رنگ رنگ میں اس کا نقش تصوف بھی بڑا دلکش، بڑا جمیل اور بڑا عظیم نظر آتا ہے۔ فارسی کلیات میں پہلا شعر حمدی ملاحظہ فرمائیے:-

اے بہ خلاء و ملا' خوئے تو ہنگامہ زرا

با ہمہ در گفتگو بے ہمہ در ماجرا

تمام دوسرے صوفی شعراء کی طرح غالب نے بھی اس خدا کی وحدت وجود ہی کا ذکر کیا ہے لیکن الفاظ کے انتخاب ان کی نعت 'لب و لہجہ' کی متانت اور اسی کے ساتھ آفاقی قسم کی تنزیہی آہنگ نے خدا کی شوکت و جبروت اور عظمت و جلال کا اظہار جس انداز سے کیا ہے اس کی نظیر مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

(نیاز فتح پوری "ولی بادہ خوار")

ہم دیکھتے ہیں کہ غالب کی شاعری میں فلسفہ، معینہ اقدار و تصورات، کائنات، مادہ، روح، فنا، عقیدہ وحدت الوجود، حسن کا احساس، حسن مطلق، حکیمانہ مزاج، فکر و جذبہ، عشقیہ جذبات، استدلالی انداز، بیاں، تشنگ، کلتہ آفرینی، رمز و بلیغ، مخصوص تراکیب، تخیل، تصور ارتقاء، بنیادی عناصر کا کام دیتے ہیں۔ اسلوب احمد انصاری نے ان عناصر کو اپنے مقالہ میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان عناصر پر ایک اچھٹی نظر ڈالیں۔ ان میں سے چند عناصر دوسرے عناصر کی نفی کرتے نظر آتے ہیں۔ ہم اپنے مقصد کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے وحدت الوجود اور تشنگ کو لیتے ہیں۔ وحدت الوجود — لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ سب لے پہلے اللہ کی ذات کو واحد مانے اور اس میں شے نہ کرے۔ لیکن غالب کی شاعری میں تشنگ کا جو عنصر درآیا ہے۔ اس سے اسکے نظریہ تصوف کو نہیں نہ نہیں ڈک

ضرور پہنچتی ہے مزید برآں :-

”وحدت الوجود کی اصل روح اور آخری غایت تزکیہ نفس اور تصفیہ باطن ہے۔ غالب نے اسے اپنی عملی زندگی میں نہیں برتنا تھا۔ پھر یہ عقیدہ ان کے ذہن میں اتنا جاگزیں کیسے ہوا؟ کیا یہ محض روایت پرستی کا نتیجہ تھا تو اس کے شاعرانہ اظہار میں اتنا توازن اور اتنی جان نہ ہوتی۔ احتشام حسین صاحب کا خیال بڑی حد تک سحت پر مبنی معلوم ہوتا ہے کہ ”وحدت الوجود کی طرف غالب کا میلان مسائل حیات کو سمجھنے اور مذہب کی ظاہر داریوں سے بچ نکلنے کا ایک بہانہ تھا۔ غالب جس سماج کے فرد تھے اس سماج میں باغیانہ میلان اور آزادی کا جذبہ داخلی طور پر تصوف ہی میں نمایاں ہو سکتا تھا“

فلاطیس کے نظریہ کے بموجب روح اعظم کو جب یہ منظور ہوا کہ اپنی صورت کا مشاہدہ کرے تو کائنات وجود میں آگئی اور ماسوا کا ظہور ہو گیا۔

دہر نچ جلوہ یکنائی معشوق نہیں

ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود میں

(اسلوب احمد انصاری ”غالب کی شاعری کے چند بنیادی عناصر“)

گو ہر مقصود اب بھی ہمارے ہاتھ نہیں آیا۔ ابھی ہمیں کچھ اور آگے بڑھنا ہے۔ کیا ایسا تو

نہیں کہ وحدت الوجود کا عقیدہ غالب کے دل میں بہت گہرا ہوا۔ اس حد تک کہ انہوں نے احتیاط نہیں کی اور بھٹک گئے۔ کہ یہ راستہ وادی حیرت میں سے ہو کر گذرتا ہے۔ غالب کے ان اشعار سے ہمیں ان کے نظریہ وحدت الوجود یا انکے تصوف کو جاننے میں کوئی مدد ملتی ہے؟

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم
کر دیا کافر اس اصرام خیالی نے مجھے

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مرزا غالب کے یہاں بیدل کے انداز میں ان مضامین کی بازگشت ملتی ہے۔ جو وحدت وجودی کے صوفیانہ مسلک سے بیدل اور دوسرے شعراء نے متاثر ہو کر اپنائے۔ چونکہ بیدل اور ان دوسرے اردو قاری کے شعراء نے تصوف سے اپنی اپنی دکان سجائی ہے۔ اس لیے غالب نے بھی تقلید ایسا ہی کیا ورنہ کہاں غالب اور کہاں تصوف۔ لیکن جی نہیں مانتا غالب کو تصوف سے کوئی نہ کوئی علاقہ ضرور ہے ورنہ وہ یہ شعر کیوں اور کیسے کہتے:-

سراغ وحدت ذاتش تو اس زکثرت بحث
کہ سائر ست در اعداد بے شمار کیے

ایسا بھی تو ممکن ہے کہ غالب کی تصوفی شاعری کی جڑیں انکے اپنے زمانے اور اپنی تہذیب

اور بدلے ہوئے عمرانی حالات میں پیوست ہوں:-

”ایک طرف اسلامی تصوف کی وہ روایت تھی جس نے اردو شاعری کی فکر کو پروان چڑھایا ہے اور جس کے نشوونما میں اگر ایک طرف نو افلاطونی فلسفے، ایرانی اثرات اور ہندو یوگیوں کے رابلطوں کا حصہ رہا ہے تو دوسری طرف اسلامی فکر کے مختلف عناصر خصوصاً معتزلہ فرقہ اور اس کی استدلال نے بھی کافی مدد بہم پہنچائی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامی تصوف اس دور کا غالب فلسفہ تھا۔ اور اردو شاعری نہ صرف نفس مضمون کے اعتبار سے بلکہ علامتوں، اشاروں، اسالیب بیان حتیٰ کہ تشبیہ و استعارہ کے سارے ذخیرے تصوف ہی کے مرہون منت ہیں۔

پھر یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ غالب عملاً صوفی نہ تھے۔ عقائد کے اعتبار سے جہاں وہ صوفیاء کے بہت سے مروجہ عقائد کو مانتے تھے۔ وہاں نہ تو وہ ان کی راہ سلوک پر پوری طرح ایمان لاتے تھے۔ اور نہ اس کے مقابلے میں کوئی نیا فلسفہ فکر پیش کرتے تھے۔ ان کے نزدیک تصوف کو برائے شعر گفتن خوب است کا درجہ حاصل رہا“

(ڈاکٹر محمد حسن ”غالب کے چند اہم نقاد“)

کہتے ہیں کہ صوفی تو خدا کی ذات میں اتنا محو ہوتا ہے کہ اسکے سوال سے کچھ نظر ہی نہیں آتا اور

اس سے لا انتہا محبت کرتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو ہمیں یہی کلیہ کسی خاص حد تک غالب کی زندگی اور انکی دنیاوی اور مذہبی روش پر آ زمانا ہوگا۔ آئے انکی زندگی میں جھانکیں:-

”غالب کے کلام کا اگر ہم غور سے مطالعہ کریں اور اس کے دائروں تک ہماری نگاہ جاسکے تو یہ بات آسانی سے سمجھ آ سکتی ہے کہ ماضی کے افکار و خیالات کے علاوہ غالب کے ذہن پر خود اپنے ذاتی مسائل کا بھی اثر پڑا تھا۔ زمانے کے مروجہ نظام معاشرت میں زندگی گزارنے کے لیے اور زمانے میں اپنے آپ کو پیش کرنے اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے غالب کو جو کچھ کہہ سنے پڑے ان کی تفصیل بڑی لمبی ہے۔ لیکن اس کے نتائج کو آپ دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ اس کی وجہ سے ان کے یہاں تلخی، شکست خوردگی، طغز، تنگدلی، تنہائی کا احساس، انانیت اور مردم بیزار ی پیدا ہو گئی تھی۔ سماج کے مروجہ قوانین اور رسوم سے وہ بے زار تھے ہی۔ ناکامیوں اور ناامیدیوں نے انہیں ”خدا“ کے متعلق بھی شبہ میں ڈال دیا تھا۔ رشید احمد صدیقی کا کہنا صحیح ہے کہ اردو شاعری میں غالب پہلے آدمی ہیں جنہوں نے طغز میں خدا کو مخاطب کیا ہے اور خدا ہی کیا وہ تو خدا کی بنائی ہوئی جنت، اس کے فرشتوں، اس کے دیر و حرم اور اس کی پیدا کی ہوئی دنیا کی ہر شے سے بیزار ہو گئے تھے۔ ان سے لڑتے تھے۔ ان

پر استہزاء کرتے تھے۔ ہار کر مایوس ہوتے تھے اور ان پر فتح یاب ہونے کے لیے اپنے آپ کو زندہ رہنے کے لیے آمادہ بھی کرتے تھے۔ ان نقوش کو کہیں کہیں سے الٹ پلٹ کر دیکھیے:

تیری وفا سے کیا ہو خلائی کہ دیر میں
حیرے سوا کچھ اور بھی ہم پر ستم ہوئے
کیا وہ ضرور کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
زندگی اپنی جو اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

(خلیل الرحمان اعظمی "غالب اور عصر جدید")

خدا پر طنز کرنے والا اور مردم بیزار شخص کیونکر تصوف کا دم بھر سکتا ہے۔ لیکن ظہریے کچھ ہے جو ہمیں اکساتا ہے۔ کہ غالب کو تصوف کے رموز سے ضرور کوئی سروکار رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ غالب کی غزلوں میں عینیت اور انفرادیت پائی جاتی ہے۔ ہستی کو قریب سمجھ کر مادہ کے وجود سے قطعی انکار عینیت کا انتہا پسند نظریہ ہے:-

"عینیت سے قدرتی طور پر دو شخصیں پھوٹی ہیں۔ مابعد الطبیعات اور
مثالیت، مادہ سے مادہ روح اور اس سے متعلق ایک پوری کائنات کا
تصور اور پھر اس سے متعلق سچ در سچ شخصیں ہزار سال سے فلسفے کا اہم جز

رہی ہیں۔ غالب کے زمانے میں مہذب سماج کا مرغوب روحانی فلسفہ تصوف تھا۔ اور شاعروں میں تو اسے اور بھی زیادہ مقبولیت حاصل تھی۔ کیونکہ اس کے بارے میں ”برائے شعر گفتن خوب است“ کہا گیا تھا۔ پھر ہماری شاعری کو اس سے ایک بڑی حد تک فطری اور رواں چلی تعلق بھی تھا۔ اس لئے غالب کی شاعری اس سے بے نیاز کیسے رہ سکتی تھی؟ ظاہر ہے کہ تصوف کے متعلق ان کی معلومات بہت اچھی تھیں۔ ان کی شاعری میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں جہاں تصوف کے مختلف مقامات اور مسائل کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ وہ تو کبھی خیر ہوئی بادہ خواری نے پچالیا ورنہ اتھے خاصے انسان سے ولی بن جانے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی“۔

(راجندر ناتھ شیدا ”غالب کا شعور۔۔۔ ایک مطالعہ“)

اوپر جو کچھ گزرا اسکے علاوہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے اپنے مقالہ ”غالب اور نفسیاتی کشمکش“ میں چند نکات اٹھائے ہیں جو غالب اور تصوف کے سلسلہ میں ہمارے ممد ثابت ہو سکتے ہیں:-

(الف) بظاہر کثرت و وحدت دو جدا جدا اور متضاد حقیقتیں نظر آتی ہیں لیکن اگر بتایا جائے کہ کثرت دھوکہ ہے یا وحدت ہی کے رنگ برنگ ظہور کا نام ہے تو اس انکشاف سے تھوڑی دیر کے لیے خیر پیدا

ہو جائے گا۔ خصوصاً جب کہ تخیل نازک اور انداز بیان نادر ہو۔۔۔

اس لیے غالب نے بھی اس ترانے کو چھیڑا۔

(ب) ڈاکٹر صدیقی آگے چلکر یہ نکتہ سامنے لاتے ہیں کہ ڈاکٹر خورشید الاسلام کے مطابق

”غالب کا تصوف مابعد الطبیعات‘ اخلاق اور زندگی کے دوسرے

پہلوؤں پر محیط نہیں ہے۔ ان کا تصوف تزکیہ نفس یا دوسرے کی تلقین

کے لیے کم اور اپنے تحفظ کے لیے زیادہ ہے“

(ج) غالب نے اپنی فارسیت کو جلاوینے کے لیے تصوف کا سہارا لیا۔

(د) غالب کا تصوف ایک دلچسپ چیز ہے۔ اس نے خود یہ اشارہ کیا

ہے کہ اس نے تصوف کو تغن طبع کے لیے لگا رکھا تھا“ ظاہر ہے کہ یہ

قول یا تو غالب کی زندہ دلی پر دلالت کرتا ہے یا انکساری پر۔ اس لیے

کہ غالب کے کلام میں بعض ایسے اشعار ملتے ہیں جن کا کہنے والا

صرف ایسا شخص ہو سکتا ہے جو تصوف کے رموز سے آشنا ہو:

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم

ملائیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

ان کے علاوہ ایک اور بات جو ڈاکٹر صدیقی سامنے لائے ہیں۔ وہ یہ کہ شیعہ مسلک یا

عقائد کے ساتھ تصوف کا بال میل ممکن نہیں۔ دوسری طرف غالب کے خطوط میں واضح

طور پر ان کے اہل تشیع ہونے کے اشارے ملتے ہیں۔

آخر میں ڈاکٹر مظہیر احمد صدیقی اس مسئلہ کو ہمارے لیے یوں سینچتے ہیں:-

”ان مثالوں سے واضح ہو گیا ہوگا کہ مرزا مدتوں ایک ذہنی کشمکش کا شکار رہے۔ ان کا تصوفانہ رجحان نفی خودی کی دعوت دیتا ہے اور ان کی فطری انانیت ہر بار ابھر کر ان کو اثبات خودی کی دعوت دیتی تھی۔ بالآخر ان کے صوفیانہ پندار نے ان کی انانیت سے شکست کھائی۔ ممکن ہے اس کے بعد بھی ان کے ساز سے صوفیانہ نغمے کبھی کبھی نکلے ہوں مگر ان افکار کو حقیقی نہیں رہی کہہ سکتے ہیں“

(ڈاکٹر مظہیر احمد صدیقی ”غالب اور نفسیاتی کشمکش“)

تصوف کے ساتھ غالب کا رشتہ کچھ بھی رہا ہو۔ وہ تصوف کے رموز سے بہر حال واقف تھے۔ اور اسکے نتیجے میں کافی گہرے تصوفی اشعار سامنے آئے ہیں آئیں ان سے خط انٹھائیں:-

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرتا ہے دوا ہو جانا

فنا کو سوپ کر مشاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغ طالع خاشاک ہے موقوف کلخن پر

دل ہر قطرہ ہے ساز انا ابھر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

ہے وہی بد مستی ہر ذرہ کا خود عذر خواہ
جس کے جلوہ سے زمیں تا آسمان سرشار ہے

لطافت ہے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن رنگار ہے آئینہ باد بہاری کا

نظارہ کیا حریف ہو اس برق حسن کا
جوش بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے

آں راز کہ در سینه نہاں است نہ وعظ است
 بر دار تو اں گفت و بہ منہر نہ تو اں گفت

مقصود ما ز دیہ و حرم جز جیب نیست
 ہر جا کہینم سجدہ ' ہذاں آستان رسد

خوشحال و غالب کی فارسی شاعری

غالب کی فارسی شاعری

بر عظیم میں فارسی شاعری کا سلسلہ سعود سعید سلیمان سے شروع ہوا اور خسرو نظیری، ظہوری، عربی، فیضی، بیدل اور غالب سے ہوتا ہوا اقبال پر آ کر ختم ہوا۔ آجئے ہم غالب کی فارسی شاعری کا جائزہ لیں۔ غالب نے اپنے فارسی کلام کو اردو کلام سے ہمیشہ بہتر جانا اور فرمایا کہ:-

فارسی میں تاجہ بینی نقشہائے رنگ رنگ

ہگور از مجموعہٴ اردو کہ بے رنگ من است

اسکی وجہ جاننے کے لیے ہمیں جناب شہرت بخاری کی یہ تحریر پڑھنی ہوگی:-

”مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ غالب کو فارسی شاعری سے شغف کی

وجوہات کیا تھیں۔ جبکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ اس (فارسی) کا آفتاب

غروب ہوا چلتا ہے۔۔۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ نسلی برتری کا احساس

اس معاملے میں سب سے پہلے اس کا رہبر ہوا۔ ایرانی اور ترک

ہونے پر اس کا فخر غرور کی حدود میں داخل ہو گیا تھا۔ وہ امیر خسرو اور بیدل کو بمشکل مانتا تھا۔ ایک اور وجہ وہ شکست ہے جو اتہداء میں اس کو اپنی اردو شاعری کے سلسلے میں کھائی پڑی۔ دراصل وہ جس طرز کی شاعری کر رہا تھا یعنی تقلید ظہوری و بیدل وہ اردو کے لیے بالکل غریب تھی۔ اس زمانے میں ادھر ناسخ ادھر شاہ نصیر اور ذوق کے ترانے فضا میں رہے ہوئے تھے لوگ

شمار سجد مرغوب بت مشکل پسند آیا

تماشائے بیک کف بدون صد دل پسند آیا

کی طرف کس طرح متوجہ ہوتے۔۔۔ اس نے محسوس کیا کہ میرا یہ میدان نہیں اور فارسی کی طرف ہمد تن متوجہ ہو گیا۔“

(شہرت بخاری ”غالب کی فارسی شاعری“)

ایران میں سہدی و حافظ اور ہندوستان میں سعد سلیمان، خسرو، نظیری، ظہوری، عرفی اور بیدل، غالب سے پہلے فارسی شاعری کے بے بدل استاد گذرے تھے۔ غالب کے فارسی کلام پر یوں تو شیخ علی حزیں، طالب آملی، عرفی شیرازی، ظہوری، انوری، خاقانی اور نظیری کا اثر نظر آتا ہے۔ لیکن جس فارسی شاعر سے غالب سب سے زیادہ متاثر ہوئے وہ مرزا بیدل ہیں۔ جس کے متعلق غالب اپنے ایک اردو شعر میں فرماتے ہیں:-

مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالب

عصائے خضر صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

غالب کے فارسی کلام کے متعلق یہ اقتباس ملاحظہ ہو :-

”غالب نے اپنے فارسی کلام کو زندگی بھر اپنے اردو کلام پر ترجیح دی۔ ان کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنے فارسی کلام کی ناقدری کا افسوس تھا۔ مگر اصل یہ ہے کہ مرزا قاسمی میں کسی نئی طرز کے موجد نہیں ہوئے۔ یہ ضرور ہے کہ انہوں نے فارسی شاعری کی روایات کو اچھی طرح اپنے اندر سولیا تھا اور اس علم کتابی اور اپنی مناسبت طبع کی بدولت وہ نہایت پاکیزہ شعر کہنے لگے تھے۔ مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ ان کے ساز میں کوئی پردہ ایسا نہیں ہے جو ان کے پیشرو شعرائے فارسی کے یہاں موجود نہ ہو۔ انہیں فارسی شعر کی تاریخ میں زیادہ سے زیادہ اسالیب کے ایک ماہر کا درجہ مل سکتا ہے لیکن جس مقام پر وہ خود کو فائز دیکھنا چاہتے تھے۔ دراصل وہ انہیں کبھی نہیں مل سکتا تھا۔ اکرام نے لکھا ہے کہ ان کا فارسی کلام ”ہندوستان کے بہترین فارسی شعراء سے پیچھے نہیں ہے“ یہ صحیح ہو سکتا ہے لیکن غالب جو ہند کے فارسی شعراء کو اپنے مقابلے میں نیچے سمجھتے تھے اکرام کے اس جملے کو اپنی صریح توہین پر محمول کرتے“

(شجاع احمد زیا ”اردو غزل اور غالب“)

غالب نے اپنی شاعری کی ابتداء آگرہ میں اپنے فارسی کلام سے کی۔ مگر دلی آ کر اردو شاعری کی ابتدا کی جو ان کی مشکل پسندی اور فارسیت کی وجہ سے اُس زمانے میں اپنی جگہ نہ بنا سکی۔ اسلئے انہوں نے فارسی شاعری کی طرف توجہ کی۔ ان کا تقریباً تمام فارسی کلام (جو دس ہزار چار سو چوبیس اشعار پر مشتمل ہے) ۱۸۲۷ء سے ۱۸۳۷ء تک یعنی بیس سال کے عرصہ میں لکھا گیا۔ شروع شروع میں مشکل پسندی کی جھلک غالب کی فارسی غزلوں میں بھی جھلکتی رہی۔ مگر فارسی رباعیات، قطعات، مثنویوں اور قصائد میں مشکل پسندی نہ ہونے کے برابر ہے۔ غالب کی ۳۴۵ فارسی غزلوں میں سے ۲۷۶ غزلیں ۱۸۲۷ء اور ۱۸۳۸ء کے درمیان یعنی گیارہ سال میں کہی گئیں۔ اپنے فارسی دیوان کی تعریف یوں کی ہے:-

غالب اگر ایں فن سخن دیں بودے

آں دیں را ایزدی کتاب ایں بودے

غالب نے اپنی فارسی شاعری میں بھی دو تخلص یعنی اسد اور غالب استعمال کئے۔ جہاں تک غالب کی شعری خصوصیات کا تعلق ہے تو انہوں نے غزل کے دامن کو وسعت بخشی۔ دنیا کی ہر بات اور ہر مسئلہ پر غزلیں کہیں۔ یوں غزل کو جنگلی دامن کا لگہ نہ رہا۔

شہرت بخاری کے مطابق غالب نے غزل کو صنف سخن نہ رہنے دیا۔ بلکہ اردو اور فارسی زبان کی تقدیر بنادیا۔ غزل کو تہذیب کا درجہ دیا۔ اور اس قابل بنایا کہ آج ہمارے بڑے سے بڑے شاعر کو اس سے مفر نہیں۔ مرزا نے اردو اور فارسی غزل کو دلیری اور دلیری دی۔ انہوں نے فارسی شاعری میں خدا کو شہیدِ طنز سے مخاطب کیا:-

بیا کہ قاعدۂ آساں بگردانیم
قضا بگردش رطل گراں بگردانیم

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کہتے ہیں:-

”خوشی بیان، ندرت خیال و معنی، آفرینی، عالی ظرفی، حسرت و یاس،
ذوق و شوق، حرکت و سفر، اندیشہ، منزل، نو میدی، جاوید، نازک، دماغی،
راہ عشق اور درد و فراق کے نادر مضامین کی ایسی مثالیں کلام غالب
میں موجود ہیں جو ہندوستان کے فارسی گو شعراء کے یہاں بہت کم
ہیں اور جن کی بنیاد پر مرزا بیجا طور پر اپنی فارسی شاعری پر ناز کرتے
ہیں“

(ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ”نقشبائے رنگ رنگ“)

آئیے اب غالب کے فارسی کلام کے ان نقشبائے رنگ رنگ کا لطف اٹھائیں:-

مشکل پسندی:-

بودی کہ در آں خطر را عصا غفلت است
ہ سینہ می پرہم رہ اگرچہ پا غفلت است

غبارِ طرفِ حرام پہ بیچ و تابے ہست
ہنوز درِ رگ اندیشہ اضطرابے ہست

ہسان موجِ میِ بالم پہ طوقاں
برنگِ شعلہِ میِ رقصم درِ آتش

شیوہٴ رندان بے پرواہِ خرام از من پرس
ایں قدرِ دانم کہ مشکل است آساں ز بستن

تصورِ غم:-

گر بود مشکلِ مرغِ اے دل کہ کار
چوں رود از دستِ آساں میِ رود

شادی و غم ہمہ شریکتر از یک دگر اند
روز روشن بوداں شب تار آمد و رفت

وجدانی کیفیت:-

بیا کہ قاعدہٴ اسماں بگردانیم
تھا پہ گردشِ رطلِ گراں بگردانیم

گل انگینم و گلابے بہ را بگور پاشیم
مے آوریم و قدح درمیاں بگردانیم

ہوں گیری:-

گہے بہ لا بہ خن ہا ادا بیامیزم
گہے بہ یوسہ زباں در دہاں بگردانیم

تکلف برطرف لب تھنہ یوس و کنار استم
ز را ہم باز چیں دام نوازش ہائے پنہاں را

خودداری و تقاخر:-

بے برغنی من داغ لہذ بر دل ساماں
بے مہر کی من زرد کند روئے درم را

لکھنؤ و پشکوئی:-

کو کم را در عدم اوج قبولی بودہ است
شہرت شعرم بکشتی بعد من خواہد شدن

تصوف:-

مقصود ماہر دیہ و حرم بخو صبیب نیست
ہر جا کہینم سجدہ ہداں آستان رسد

سراغ وحدت ذاتش تو اس زکثرت جست
کہ سائر ست در اعداد بے شمار یکے

دنیا اور کائنات کی حقیقت:-

جہاں ہر جہت ' آئینہ آگہی
فضائے نظر گاہ ' وجہ الہی

عالم آئینہ راز است چہ پیدا چہ نہاں
تاب اندیشہ ہماری بہ نگاہ دریاب

ہر ذرہ محو جلوۂ حسن یگانہ ایست
گوئی ظلم شش جہت آئینہ خانہ ایست

عشق و عقل:-

عشق بے ربطی شیرازہ اجزائے حواس
عقل زنگار رخ آئینہ حسن یقیں

خوشحال کی فارسی شاعری

نکار من غضب آلودہ من ز سادہ دلی
پہ قہر خندوی آگہ کلشتم از غھبش
گراں بت را چو محراب است ابدہ
من او را سجده در محراب ندہ

خوشحال کے یہ فارسی اشعار کسی بھی ایسے شاعر کے کلام کے مقابلے میں رکھے جاسکتے ہیں جس کی ماوردی زبان فارسی ہو اور نام حافظ، سعدی، ظہوری، نظیری، بیدل اور غالب ہو۔ جب ہم غالب کی فارسی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو کھلتا ہے کہ وہ ظہوری، نظیری اور بیدل کی فارسی نظم اور فن شاعری سے متاثر ہوئے مگر خوشحال کے فارسی کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حافظ شیرازی کی طرح جام شراب کو موضوع بناتا ہے اور سعدی کی طرح اپنے دل کے رازوں کو۔ آئیے خوشحال کی فارسی شاعری کی خصوصیات کو جانیں:-

(۱) خوشحال کی ماوردی زبان فارسی نہیں تھی۔

(۲) خوشحال سے پہلے کوئی پشتون شاعر معلوم نہیں جس کا فارسی کلام دستیاب ہو۔

(۳) فارسی شاعری میں خوشحال نے دو تخلص استعمال کئے۔ خوشحال اور کوہی

(۴) خوشحال کے فارسی کلام میں صرف پچیس غزلیں دستیاب ہیں۔ جن میں لگ بھگ

ڈھانکی سوا شعرا ہیں۔

(۵) خوشحال کا فارسی کلام انکے پشتو کلام کے ضخیم دیوان کا حصہ ہے۔

(۶) خوشحال نے فارسی میں صرف غزل گوئی کی ہے۔ جس میں انکی آواز سادہ شیریں اور مترنم ہے۔

(۷) خوشحال نے اپنی فارسی غزلوں میں زیادہ تر چھوٹی بحریں استعمال کی ہیں۔

خوشحال بابا اپنے زمانے اور مغلیہ دربار میں رائج فارسی زبان پر بخوبی حاوی تھے۔ اسکے علاوہ ان کا فارسی زبان اور شاعری کا مطالعہ بھی وسیع معلوم ہوتا ہے۔ جب ہی تو انکے کلام میں سعدی و حافظ جھلکتے ہیں۔ خوشحال کی فارسی ادبیات سے یہ واقفیت پشتو زبان کے لیے سہ ثابت ہوئی۔ انہوں نے نہ صرف فارسی میں شاعری کی بلکہ فارسی شاعری کی خصوصیات کو پشتو شاعری میں سو کر پشتو نظم کو ایک اعلیٰ مقام تک لے گئے اور اس میں وسعت پیدا کی۔

خوشحال کی فارسی غزل میں سعدی و حافظ کے رنگ سخن سے متعلق ڈاکٹر سید پرویز سرمرقنی جعفری نے فرمایا:-

”خوشحال خان بابا کی فارسی شاعری کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ہاں ایران کا ہمہ گیر فہم و ہنر فلسفہ اخلاق و تصوف اور ان کا ادب اور آرٹ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ خوشحال اپنی فارسی شاعری میں سعدی و حافظ کے شیریں اور مترنم لب و لہجے سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔ اس غزل میں شیراز کی شیرینی کا لطف آ جاتا

ہے:-

از او دل بر گرفتن کار من نیست
 کہ از جاں سیرگشتن کار من نیست
 مرا گوئی بگو وصف دہانش
 چگونم چوں در او جائی خن نیست
 من و سودائی رویت تاکہ ہستم
 اگرچہ خود ترا بر رائی من نیست
 غمت تاور دل و جانم وطن کرو
 مرا در کوچہ شادی وطن نیست
 مرا خوشحال او پرسی کہ چونی
 مگر از چہرہ خالش مبرہن نیست

(ڈاکٹر سید مرتضیٰ جعفری "خوشحال بابا کی فارسی شاعری")

اب ہم ایک ایسی حقیقت کا اظہار کرنا چاہیں گے جس کی وجہ سے خوشحال کی فارسی شاعری میں ایک ایسی جدت پیدا ہوئی جس نے فارسی شاعری کے دامن کو وسیع تر کر دیا۔ تفصیل اس جدت کی یہ ہے کہ خوشحال نے پشتو قافیے اور روایات اپنے فارسی شعروں میں بڑی خوبصورتی سے استعمال کی ہیں۔ اس سے ان کے فارسی کلام کی عذرت و رعنائی میں اضافہ ہوا ہے۔ ذیل میں خوشحال کے چند ایسے فارسی اشعار نقل کئے جاتے ہیں جن میں پشتو قافیہ

ردیف استعمال ہوئے ہیں۔ قارئین کی آسانی کے لیے ان پشتو قافیہ اور ردیف کو نہ صرف خط کشیدہ کیا گیا ہے بلکہ انکے سامنے انکے اردو معنی بھی لکھ دیئے گئے ہیں۔ ان اشعار کو پشتو قافیہ ردیف کے اردو ترجمے کے ساتھ پڑھیے اور ان ”سرا آتھ“ اشعار کا خط اٹھائیے:-

بگرد کوئے تو کشتن مراد خدا دے (میری ہے)

بود کہ روئے تو نیم کہ کعبہ بادے (میرا ہے)

من اس جمال ترا کے مثال در یام

کہ خود خیال تو از مہر و ماہ اٹلی دے (اٹلی ہے)

منم کہ غیر تر اور جہاں نمی یام

خلاف نیست خبر در حق توئی دے (حق تعالیٰ ہے)

نمی شوم متحمل بدروز وعدہ وصال

بیایما کہ دلم خوار و زار بے تا دے (تیرے بغیر ہے)

گماں مبر کہ بگرد و عشق تو خوشحال

چرا کہ بد رخ خوب تو ڈیر شدادے (بہت شیدا ہے)

جب تک کسی شاعر کو دونوں زبانوں پر کامل دسترس حاصل نہ ہو وہ کسی شعر کا ایک مصرع ایک زبان میں اور دوسرا مصرع دوسری زبان میں لکھنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ خوشحال بابا چونکہ پشتو اور فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ اس لیے انہوں ایسی ہی ایک مرصع غزل اپنے دیوان میں چھوڑی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

- فارسی مصرعہ:- چہ کنم چہ چارہ سازم
 پشتو مصرعہ:- چلہ زړه م شے کنار (جب تم میرے دل سے کنارہ کش ہو جاتی ہو)
 فارسی مصرعہ:- نکلہ بدل سرایت
 پشتو مصرعہ:- که زارے کوم بے شمار (اگر میں بے شمار متیں بھی کروں)
 فارسی مصرعہ:- اگر از فراق میرم
 پشتو مصرعہ:- لاپه خوښې شے لږه کاز (تم اس پر اور بھی خوش ہو جاؤ گی)
 فارسی مصرعہ:- نرو دوزور گئے تو
 پشتو مصرعہ:- که خوشحال شوے سل دواز (اگر تو خوشحال کو سو بار بھی دھتکارے)
 آئیے خوشحال بابا کے فارسی کلام میں سے چیدہ چیدہ اشعار پڑھیں:-
 مے خوری :-

چشم مخمور تو آخر کار کرد

زاد صد ساله را مستخوار کرد

چه شرابست این که روحی را

به یکی جرعه بی خبر کردی

پیار عشق:-

روئے زرد و آہ سرد و چشم تر

عشق کوئی را چنیں پیار کرد

روانی و سلاست :-

لبت از آب حیواں آب برده
زُخت نور از رخ مہتاب برده

سحر انگیزی :-

نہ دامن در دو چشم او چہ جادوست
کہ از پشمان عاشق خواب برده

صبر و بے تابی :-

بتاب زلف و چچا چچ گیسو
صبری از دل بیتاب برده

ظہر :-

نہ تنہا دل ز خوشحال تنگ برده
کہ زہد از دست شیخ و شاب برده

اثرات الم :-

اگر روی ترا در دل الم نیست
چہ از دیدگان خوں میچکانی

اترا:-

بہر فرقت و محنت دیدہ بر خواباں وقت
 باضم سلطان وقت و باضم سلطان وقت

گری عشق:-

حدیث روی او با من بگوئید
 پہ بلبل از گل و گلشن بگوئید
 نہ آں چشم نہ آں مژگاں نہ ابروست
 بلائے دین و جان و تن بگوئید

وقت کی اہمیت کا احساس:-

آہ و دلیلا کہ دیدم بی ثبات و بی بقا
 عمر چوں باد بہار و بخش چوں بیان وقت
 تلاء مرغان ایں گلشن بمن معلوم شد
 آہ و فریاد و فغان دارند درستان وقت

خوشحال و غالب کی فارسی شاعری موازنہ

جہاں فارسی غالب کی نسلی زبان تھی۔ وہاں خوشحال کی مادری زبان پشتو تھی۔ قدرتی امر ہے کہ اپنی نسلی زبان میں غیر مادری زبان کی نسبت بہتر شاعری کی جاسکتی ہے۔ خوشحال اکثر کہا کرتے کہ فارسی میں مجھ سے بہتر شاعر موجود ہیں لیکن پشتو میں میرا ہمسر کوئی نہیں۔ یاد رہے خوشحال کے پشتو اشعار کی تعداد چالیس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ باایں ہمد خوشحال نے تاریخ درست رکھنے کے لیے یہ بھی فرمایا:

”میرا قلم فارسی میں بھی گویا اور روان ہے۔ مگر کیا کروں کہ ہر شخص کو

اپنی مادری زبان پیاری ہوتی ہے“

اور کیوں نہ ہو کیونکہ خوشحال نے اپنی قوم کو جو پیغام دینا چاہا تھا۔ اسکے لیے پشتو زبان ہی سب سے زیادہ موزون تھی۔ لیکن ”الب کی بات اور ہے ان کو فارسی زبان پر کھل دسترس حاصل تھی۔ اور اردو میں جو کلام کہا وہ انکی فارسی شاعری سے زیادہ مقبول ہوا۔ لیکن اس سے غالب کے فارسی کلام کی عظمت پر کوئی آنچیں نہ آئے۔“

ہم غالب کے فارسی کلام (دس ہزار چار سو چوبیس اشعار) کے مقابلے میں خوشحال کے فارسی کلام (وڈھائی سو اشعار) کو رکھتے ہیں۔ تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ غالب کی فارسی شاعری کا کیوں بہت زیادہ وسیع ہے۔ انہوں نے فارسی میں نہ صرف غزل گوئی کی بلکہ رباعی، مثنوی، قصیدہ اور قطع کے ذیل میں بھی اگلے ہزاروں اشعار موجود ہیں۔ دوسری طرف خوشحال کا نامتر فارسی کلام بچیس غزلوں پر مشتمل ہے۔ لیکن ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ خوشحال کے اتنے کم تعداد میں فارسی اشعار معیار کے لحاظ سے فارسی کے کسی بھی اچھے شاعر کے کلام کے مقابلے میں رکھے جاسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر ڈاکٹر سید مرتضیٰ جعفری کہتے ہیں:-

”خوشحال خان خلک کے ضخیم دیوان میں صرف بچیس فارسی غزلیں دستیاب ہوئی ہیں۔ جن میں اشعار کی مجموعی تعداد وڈھائی سو کے لگ بھگ بنتی ہے۔ لیکن اس قدر کم شعر کہہ کر بھی خان نے فارسی ادب میں اپنے لیے ایک ایسا مقام پیدا کیا جس کی ایرانی ناقد بھی تائید کرتے ہیں“

(پروفیسر ڈاکٹر سید مرتضیٰ جعفری ”خوشحال بابا کی فارسی شاعری“)

جہاں غالب کی فارسی شاعری میں مشکل پسندی، مسئلہ توحید، تصوف، فلسفہ عشق، حسن پرستی اور حقیقت کو پانے کے لیے جی تلاش کے جذبے جیسے مضامین پائے جاتے ہیں۔ وہاں خوشحال کی فارسی شاعری میں ایران کا ہمہ گیر فرہنگ و ہنر، فلسفہ اخلاق و تصوف اور ان کا

ادب اور آرٹ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے دونوں نابغہ شعراء کا لب و لہجہ شیریں اور مترنم ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ جہاں خوشحال نے اپنے فارسی کلام میں حسن و عشق کے مضامین کو زیادہ برتا ہے۔ وہاں غالب کے کلام فارسی میں معنی افرینی، عالی ظرفی، حسرت، ویاس، ذوق و شوق، حرکت و سفر، امیر، منزل، تولیدی، جاوید، نازک، دماغی، راہ عشق اور درود و فراق کے نادر مضامین پائے جاتے ہیں۔ دونوں کے فارسی کلام میں شوخی بیاں اور عذرت خیال بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اس پر اتنا اضافہ یہ کہ خوشحال نے اپنے محدود فارسی کلام میں بھی فارسی اور پشتو کی آمیزش سے ایک نیا رنگ پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔

خوشحال وغالب

جرات اظہار اور بے باکی

شاعری کے میدان میں جرأت اظہار اور بے باکی متنوع الفاظ ہیں۔ ان کے نتیجے میں حق گوئی، صاف گوئی، نگین بیانی، بہادری اور غیرت جیسے عناصر سامنے آتے ہیں۔ تو دوسری طرف لب و لہجہ میں شہدی، تیزی، یقین، توانائی اور بے نیازی کا ظہور ہوتا ہے۔ بعض اوقات جرات اظہار اور بے باکی جنسی شاعری کو جنم دیتے ہیں۔ خوشحال وغالب کے کلام میں جرات اظہار اور بے باکی کا اندازہ لگاتے وقت ہمیں علامہ اقبال کا یہ شعر سامنے رکھنا ہوگا:-

آئین جواں مرداں، حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

خوشحال۔ جرات اظہار اور بے باکی

رہا زید نہ دہ اور دہ گذاروند د توپک کا
ترجمہ:- میری زبان میں آگ ہے۔ ہندو کی طرح دار کرتی ہے۔

خوشحال کا یہ شعر اسکی جرات اظہار پر دلالت کرتا ہے۔ کسی بھی شاعر کے کلام کے لب و لہجہ کو سمجھنے کے لئے اس کے معروضی حالات اور ماحول کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جب ہم خوشحال جیسے نابغہ شاعر کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارے دماغ کے پچھلے حصہ میں بار بار انکے مغللوں کے ساتھ اچھے اور برے دونوں قسم کے تعلقات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ انکے اپنے خاندانی حالات و تعلقات نے بھی انکی شاعری اور اس شاعری کے لب و لہجہ کو متاثر کیا ہے۔ اس ضمن میں انکی علیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان سب کے علاوہ ایک انسان ہونے کے ناطے خالق نے انکی فطرت میں جو عادات اور لب و لہجہ ودیعت کر دیئے تھے۔ انہیں بھی مد نظر رکھنا ہوگا۔ جناب فضل حق شیدائے خوشحال کے ماحول پر یوں نظر ڈالی ہے:-

”پشتو زبان میں کافی بڑے اور مشہور شاعر گزرے ہیں۔ لیکن میرے خیال میں تنوخ‘ رنگین، بیانی‘ شوخی‘ مضمون آفرینی‘ جدت پسندی‘ عمیق مطالعہ‘ باریک مشاہدات اور مختلف علوم کے مطالعہ کے حصول کے لحاظ سے جو عظمت خوشحال خان کو حاصل ہے وہ پشتو کے کسی دوسرے شاعر کو حاصل نہیں ہے۔ بلکہ دوسری زبانوں کے بھی بہت کم شعراء انکے ہمرہو کہتے ہیں۔ جیسے کہ اسکی شخصیت باغ و بہار ہے ویسی ہی اس کی شاعری بھی نہایت پہلدار ہے اگر ایک طرف وہ سپاہی‘ سالار اور سردار ہے جنگجو ہے اور تگوار کا وطنی ہے فقیاب ہے تو دوسری طرف انکے کلام میں پازیبوں کی جھنکار۔۔۔ کی کات۔۔۔ لڑوں۔۔۔

سیاسیات‘ وحیات‘ دنیاوی معاملات‘ ذاتی مشکلات‘ قدرتی آفات‘ نباتات‘ پشتون روایات

جہاں لیاقت، اخلاقیات، جنسیات، نئی اصطلاحات، نازک احساسات اور دوسرے موضوعات شکار باز بھنوروں، مورچوں اور زخموں کا بیان ملتا ہے۔ اسکے کلام کا مطالعہ کرنے والے حیران ہوتے ہیں کہ خوشحال کا دامن کتنا وسیع ہے کہ اس میں یہ سب کچھ سما یا ہوا ہے۔ اسکے ذہن میں کتنی وسعت ہے کہ اس سرخشنے سے بے شمار ندیاں بہہ رہی ہیں۔ اپنے زمانے کا یہ اونچا انسان اور عظیم شاعر مجموعہٴ امجد او ہے۔ کہتے ہیں کہ جو شعراء پہاڑی علاقے میں پیدا ہوتے ہیں انکی زبان خروش، لہجہ سخت اور کہانا آشنا ہوتا ہے۔

اگرچہ خوشحال کی جائے پیدائش اکوڑہ کے شمال مغربی سمت میں چڑسہاک اور نوشہرہ کے درمیان واقع پہاڑیوں میں ہے۔ اسکے جنوب میں خٹلوں کے پہاڑ ہیں۔ اور خوشحال نے افریدیوں، مہمندوں اور سوات کے پہاڑوں اور دروں پر باز کی مانند پرواز کی ہے مگر اسکی زبان کھڑی اور کرخت نہیں ہے۔ نرم اور لطیف ہے۔ رواں اور شیریں ہے۔ اس میں اگر ایک طرف لنڈے (دریائے کاہل) کی خوش رفتاری اور آہستہ خرابی جھلکتی ہے۔ تو دوسری طرف اباسین (دریائے سندھ) کی بے قابو لہروں کا شور سنائی دیتا ہے۔ اسکی زبان کا آہنگ ان دونوں دریائوں کے حکم کا مزاج دان ہے۔ وہ ایک طرف خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ اٹھکلیاں، حسن، چمک اور کالی زلفوں کے سائے میں آرام ڈھونڈتا ہے تو دوسری طرف جنگ،

نک 'تنگ اور خنجر خوں رنگ کی باتیں کرتا ہے۔ چوڑیوں کی باتیں
اور بیڑیوں کی باتیں بھی"

(فضل حق شیدا "خوشحال کی حماسی شاعری")

خاندانی وجاہت کا جرات اظہار پر اثر انداز ہونا لازمی امر ہے۔ خوشحال کے باپ دادا اور
وہ خود اپنے قبیلے کے سردار تھے۔ خوشحال نے اپنے کلام میں اپنے والد شہباز خان کو حاتم کی
طرح نخی شیر دل اور رستم سے زیادہ تلووار کا دھنی 'شرع پر قائم اور سچا' دادا بچی خان کو سرتاپا
یوسف کی طرح خوبصورت اور قد میں اتنا دراز کہ اگر دوسرا شخص گھوڑے پر سوار ہو تو بچی
خان اسکے ساتھ پیدل چلتے ہوئے بھی قد و قامت میں برابر ہوتا تھا۔ پر دادا ملک اکوڑ کو
خاندان کے لیے بڑا مقدم حصہ حاصل کرنے والا کہا ہے۔ خوشحال نے ایک شعر میں اپنے
باپ دادا کی میدان جنگ میں شہادت کو یوں اجاگر کیا ہے:-

پلار نیكٔ مي شهيديان و گور ته تللي

پشت په پشت مي هنر دادنه آل په آل

ترجمہ:- میرے والد دادا اور پر دادا شہید ہو کر اپنی قبروں میں دفن ہوئے ہیں۔

پشت در پشت اور آل در آل میرا بھئی ہنر ہے۔

بخره ني د تيغ را كره په اصل كنښي پښتون يم

پلار په نيكٔ نه يم بي دولته بي حشمه

ترجمہ:- قدرت نے میرے حصے میں تلووار لکھی ہے کہ میں اصل سے پشتون ہوں۔ میں

اپنے باپ دادا کی طرف سے بھی بے دولت اور بے حشم نہیں ہوں۔
محترمہ چاند بی بی سلطانہ حیدر آباد سندھ سے خوشحال خان خٹک کی تین سو سالہ برسی کے موقع پر پٹاؤر تشریف لائیں۔ اور باسین آئرس کونسل کے زیر اہتمام قومی مجلس مذاکرہ (۲۹ تا ۳۱ مارچ ۱۹۸۰ء) میں اپنا پر خیال مقالہ پیش کیا۔ اس مقالہ سے ایک حسب حال اقتباس ملاحظہ ہو:-

”خوشحال کا قلم آتش نوا تھا۔ اس نے واقعات، حقائق اور تجربات کو بڑی صداقت اور جوش کے ساتھ شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے نظمیں بھی لکھی ہیں۔ مثنویاں بھی لیکن غزل میں ان کی شاعرانہ شخصیت کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ غرض یہ کہ ان کی نظم ہو یا غزل وہ ہر مقام پر ایک غیر متندانہ نظر آتے ہیں“

(چاند بی بی سلطانہ ”خوشحال۔ ایک شاعر غیر متند“)

شاعری زندگی کے تجربات اسکی شاعری کی اساس بنتے ہیں۔ تعبیری شاعری کو جنم دیتے ہیں۔ بلکہ میں تو اسے تعبیری شاعری کے زمرے میں شمار کرتا ہوں۔ ہم خوشحال کی شاعری کو اس لیے تعبیری شاعری سمجھتے ہیں کہ اس میں اپنی زندگی کے تجربات کا انچوڑ اپنی قوم کے تناظر میں دیکھتے تو خوشحال کی پوری شاعری کا مقصد مکمل کر سامنے آ جاتا ہے۔ ایسی شاعری میں لذت و آزار، مسرت و غم اور وہ تمام چیزیں پائی جاتی ہیں جو زندگی سے وابستہ ہیں۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللطیف جس قدر شاعری زندگی کے تجربات وسیع اور مختلف النوع ہو گئے

اسی قدراں کے مجموعی معافی کی ہم آہنگی بڑی ہوتی جائے گی۔ اور اسی قدراں کی شاعری بھی بڑے درجے کی ہوگی۔

خوشحال بابا کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ گفتار اور کردار دونوں کے غازی تھے۔ جہاں تک بے باکی کا تعلق ہے تو صرف گفتار میں بھی بے باکی آ سکتی ہے۔ مگر کردار یا عمل میں بے باکی ”چیزے دگراست“ ایسا کرنے کے لیے شیر کا دل چاہیے۔ روحان یوسٹرے یہی بات ان الفاظ میں کہتے ہیں:-

”محترم قلندر صاحب نے اوپر جو کچھ فرمایا ہے اسکی موافقت اور تناظر میں یہ بات بڑے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ معلوم ادبی تاریخ میں اکیلے خوشحال بابا وہ شاعر اور تابع ہیں جنہوں نے جو کچھ کہا ہے اس پر عمل بھی کیا ہے۔ اور جو کچھ کیا تو بعد میں وہ کہا بھی ہے اور اس سلسلہ میں انہوں نے کسی قسم کا سیاسی سماجی اور مذہبی دباؤ، مصلحت یا کسی اور جوڑ توڑ کی پروا نہیں کی اور بڑی بہادری اور مردانگی کے ساتھ ایسی باتوں اور حقیقتوں کا اظہار اپنی شاعری میں کیا ہے۔ ایسی باتیں اور حقیقتیں کہ جن کا اظہار انکے دور میں تو کیا آج بھی ہماری تہذیب میں کرنا ایک جرم عظیم گردانا جاتا ہے۔ پر یہ صرف ایک خوشحال ہی تھا جس نے کسی کی پروا نہیں کی کیونکہ:-

دروغ و ٹیل ہفہ کا چپی ٹی ویرہ وی لا طمع
خوشحال پہ دا ار نہ دے حق بہ وائی خو ٹی سرشتہ
ترجمہ:- جھوٹ تو وہ شخص ہوتا ہے جسے کوئی ڈر یا طمع ہو۔ خوشحال کے لیے ایسی کوئی
رکاوٹ نہیں ہے۔ جب تک اس کا سر باقی ہے وہ حق بات کہتا رہے گا۔

اور اسی دعویٰ اور دلیل کی بنیاد پر ہم خوشحال کو گفتار اور کردار کا حامل شاعر کہتے ہیں
(روحان پوسٹوے "گفتار اور کردار کا شاعر")
بدی کو دنیا کی تمام اقوام نے برا جانا ہے۔ اور نیکی کو اچھا۔ اسلام ہمیں بدی کو ہاتھوں سے
روکنے یا زبان سے روکنے اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو دل میں اسے برا جاننے کی تلقین کرتا
ہے۔ مگر خوشحال ان سب سے ایک قدم اور آگے جاتے ہوئے فرماتے ہیں:-

وبال ٹی تول زما پہ غارہ
فتوئے د عدل ده خو چپی بدان وژنی
ترجمہ:- (بے شک) جتنے بدوں کو مار سکو مارو۔ ایسا کرنے کا سارا وبال میری گردن پر
کیونکہ یہ عدل کا فتوے ہے۔

خوشحال نے مظلوم کی قید کے دوران رخصتور (بے پور) کے بندی خانے میں وطن کی یاد
میں ایک شعر کہا ہے:-

بہتینی جونہ د زلفی باد تہ نیسی
چپی شمال ٹی بوئی راڈری رتنہ پور کبھی

اس شعر کی نوعیت سے پہلو ہے۔ اس کے کہنے سے ایک تو یہ مقصود ہے کہ شاعر اپنے وطن سے ہزاروں میل دور دیار غیر میں محبوس ہے۔ دوسرا تاثر جو شاعر اس شعر سے دینا چاہتا ہے وہ حب وطن کا ہے۔ لیکن ایک تیسری بات اس شعر کے باطن میں چھپی ہوئی وہ بے باکی ہے جو خوشحال ہی کا حصہ تھا۔ آج سے لگ بھگ ساڑھے تین صدیاں پہلے اس بندہ خدا خوشحال میں اتنی ہمت تھی کہ وہ ایسے نامساعد حالات میں بھی اپنے وطن کی حسیناؤں کو کہتا ہے کہ اپنی زلفیں کھول کر کھڑی ہو جاؤ تاکہ بادِ شمال تمہاری زلفوں کی خوشبو دیکھو۔ اڑالائے۔

خوشحال جب مغلوں کی پانچ سالہ قید و نظر بندی سے آزاد ہو کر اپنے وطن لوٹا تو اسکی زندگی میں دو بڑی تبدیلیاں ظہور پذیر ہوئیں۔ اس نے نہ صرف مغلوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا کہ مغل سلطنت بہر حال ایک غیر ملکی اور بیرونی طاقت نے قائم کی ہوئی تھی بلکہ اسکی اپنی اولاد اور دوسرے رشتہ دار (پچا و فیروہ) مغلوں کے ساتھ مل کر خوشحال کی مخالفت پر اتر آئے تھے۔ خوشحال نے اپنے ناخلف بیٹے بہرام اور اسکی ماں کے متعلق خصوصاً اور دوسرے بیٹوں کے خلاف عموماً جو کچھ لکھا ہے وہ نہ صرف تاریخ کا حصہ ہے بلکہ خوشحال کی بے باکی اور حق گوئی پر بھی دلالت ہے۔ بیٹے دیکھیں کہ خوشحال نے اپنے ناخلف بیٹے بہرام کے متعلق کیا کچھ کہا ہے جناب ایوب صابر مرحوم نے اس قبیل کے اشعار کا یوں ترجمہ کیا ہے:-

”یہ اچھا ہے کہ ایک حاملہ کے وطن سے سانپ پیدا ہو جائے نہ یہ کہ کوئی ناہموار بیٹا پیدا ہو“

”صداعت ہے اس نطن پر جس سے بہرام جیسے پوت پیدا ہوں“

”مالا نکتی بیٹا ماں کے پیٹ سے پیدا نہ ہو۔ اس سے بہتر ہے کہ اس کے نطن سے خنزیر پیدا ہو“

”وہ شخص ایک لمحے کے لیے بھی عذاب سے محفوظ نہ ہوگا جس کے لیے اپنا بیٹا دوزخ بن جائے“

”ناخلف اولاد کسی کی بھی بڑی نہ ہو کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ قسم قسم کے فساد کرتی ہے“

”اکوڑ خان“ بچی خان اور شہباز خان سب سونا تھے۔ ان سب نے اپنے اودار بڑی شان سے گزارے۔ اب جبکہ بہرام خان کی باری آئی ہے تو خود کچھ لو اس نے ان نامداروں کی مٹی کس طرح پلید کر دی ہے“

”اے بہرام تمہیں سرداری کا ہنر نہیں آتا۔ تم نے اپنے دور میں سردار کو بدنام کر دیا ہے“

”جو دیکھو تو یہ بھی تعجب کی جا ہے کہ بہرام لشکر کشی کر رہا ہے۔ اولوالعزم خوشحال خان پر“

”میرا یہ ایک عیب میری سوخویوں پر بھاری ہے کہ بہرام میرا بیٹا ہے اور میں اس کا باپ ہوں“

”اچھا فرزند باپ کے گھر کی روشنی ہوتا ہے اور بُرا فرزند ظلمت ہوتا ہے۔ جب ایسے کتے اس سے پیدا ہوئے ہیں تو مجھے شک گزرتا ہے کہ خوشحال کب انسان تھا“

(ایوب صابر ”خوشحال خان خٹک کا المیہ“)

یہی نہیں خوشحال خان کی بے باکی نے اپنے ناخلف بیٹے بہرام کی ماں کو بھی بہرام کے پیدا

کرنے پر مورد الزام ٹھہرایا۔ خوشحال کا کہنا تھا کہ ایک بد ذات اور چھوٹے خاندان کی عورت بد ذات اور کمینہٴ اولاد کو جنم دیتی ہے۔

خوشحال نے جرات اٹھا کر اور بے باکی کے سلسلے میں اپنے آپ کو بھی نہیں بخشا:-

کہ مازدہ ویسے چمپ د زویو ہسے کار دے

ما بد زنا کا وہ نہ کور د کور روزگار

ترجمہ:- اگر مجھے (ان) بیٹوں کے کڑوت پہلے سے معلوم ہو جاتے تو میں زنا کر لیتا مگر گھر گھر بست کے دھندے میں کبھی نہ پڑتا۔

خوشحال حق گوئی میں اپنی مثال آپ ہے۔ زندگی میں اسے جن لوگوں سے واسطہ پڑا۔ ان کا خوشحال نے بغور مطالعہ کیا۔ اور جب ان کے متعلق اسے سب حقائق معلوم ہو گئے تب اس نے ہر ایک کو اپنی حق گوئی کے ذریعے آڑے ہاتھوں لیا۔ چاہے وہ مغل تھے۔ یوسفزئی تھے مہند تھے افریدی تھے حتیٰ کہ اپنے قبیلے خٹک کو بھی خوب لڑا ہے۔ اپنے کلام میں ایک موقع پر پوری افغان قوم کی خامیوں کو اجاگر کیا ہے۔ یوں خوشحال خان نے حق کو ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو شاعر افغان شناس بھی ثابت کر دیا:-

”اس پہاڑی ملک میں اگر آج کوئی اچھے پشتون کے نام سے یاد کئے

جاتے ہیں تو وہ مہند، نگلش اور ک زئی اور آفریدی ہیں۔

مہندوں کے کئے نگلش لوگوں سے بہتر ہیں

اگرچہ مہند کتوں سے ہزار گنا بدتر ہیں

اور کڑائی چوہڑے ہیں آفریدیوں کے
 گوکہ افریدی خود سب کے سب چوہڑے ہیں
 یہ سب پختونخوا کے اچھوں میں شمار ہوتے ہیں
 تو جو بُرے ہیں انہیں کون انسان کہے گا
 زندہ پشتونوں سے کوئی فائدہ نہیں ہے
 جو اچھے تھے وہ گور کے نیچے دبے ہوئے ہیں“

اپنے اہل قبیلہ (خٹکوں) کو یوں سخت دست کہا ہے:-

”خٹکوں کے کتے بہتر ہیں یوسٹریوں سے

اگرچہ خود خٹک اپنی عادات میں کتے کی طرح بیکار ہیں
 ہزاروں خٹکوں نے میرے سامنے لاف زنی کی تھی آج ایک بھی نہیں ہے
 کسی بھی دوسرے کی دوستی خٹکوں سے بہتر ہے۔

اے خوشحال ہر اس شخص سے یاری اور مردت کے آرزو مند نہ ہونا

جس نے دریائے انک کا پانی پیا ہو

خٹک لوگوں کی دوستی سے توبہ بہ توبہ

کیونکہ ان میں ایک بھی ایسا نہیں جو میرا دل رکھ سکے

میرا دل خٹکوں سے اتنا خوش ہے

کہ پوری خٹک قوم کے نام سے بھی توبہ ہے

پشتون ہیں تو آدم زاد

لیکن عادات میں ہیں ہٹاؤ

نہ یہ حکمت رکھتے ہیں نہ عقل

خوش رہتے ہیں آمادہ بفساد

ایک دوسرے کی گروں پر سوار ہے

اسی لیے ان کو بلا کے نام سے پکارا گیا ہے

اے خوشحال وہ تو شکر کرو

کہ محکوم نہیں ہیں آزاد ہیں

یہ (افغان) عفریت کی اولاد ہیں یا دیوزاد ہیں یا دندوں کے بچے ہیں

میں افغانوں کو آدم کی نسل میں شمار نہیں کرتا

ان کو جتنی بھی پسند و نصیحت کرو

ان کو اپنے باپ کی نصیحت بھی اچھی نہیں لگتی

گو کہ خوشحال بابا و اہل عمر میں مغلوں کی ملازمت میں خوش تھے۔ اور اپنی پوری صلاحیتوں کو

برائے کار لا کر اپنے فرائض منصبی سرانجام دیتے رہے۔ لیکن بے گناہی کے باوجود انہیں

مغلوں کی قید کاٹنی پڑی تو وہ سراسر مغلوں کے خلاف ہو گئے۔ قید کے دوران انہوں نے

مغلوں کے خلاف اپنا بہترین کلام لکھا۔ شہنشاہ وقت اورنگزیب کے خلاف خصوصاً اور

مغلوں کے خلاف عموماً ایسی آگ برسائی جو روز بروز فزوں تر ہوتی گئی۔ جہاں شعراء

بادشاہ وقت کے دربار میں حاضری اور تعریف شاہ میں اپنا قصیدہ پیش کرنے کو عین سعادت سمجھتے ہیں وہاں خوشحال نے اپنے قصیدوں میں شہنشاہی وقت اور اسکے درباریوں اور حواریوں کو خوب برا بھلا کہا ہے۔ اور ان کو ان کے کرتوتوں کا صحیح عکس اپنے کلام کے آئینے میں دکھایا ہے:-

”اگر دیکھو تو اورنگ بادشاہ گمراہ ہے
 کیونکہ اس کو اپنے پرائے کی پہچان نہیں ہے
 اورنگ بادشاہ کے دور میں آرام نہیں
 کون کہتا ہے کہ یہ جہان آرام کی جا ہے
 جیسا کہ چہرے سے سیاہ نظر آتا ہے
 (اورنگزیب) اندرون سے بھی اتنا ہی سیاہ ہے
 اگر اسکی نیت کو دیکھو تو ایک یزید ہے
 لیکن اسکی طاقت کو دیکھو تو اہل اللہ ہے
 مجھے اورنگزیب کا عدل و انصاف خوب معلوم ہو گیا ہے
 اس کی اچھی مسلمانی بھی اور اس کا اعتکاف بھی
 اپنے سگے بھائیوں کو باری باری قتل کرنے والا
 اور اپنے باپ کو نظر بند کرنے والا
 کوئی ہزار بار زمین پر اپنا سر مارے

یا جھک جھک کر نمازیں پڑھے
جب تک اچھے عمل کے ساتھ ساتھ نیت بھی ٹھیک نہ ہو
تو ساری عبادت اور اطاعت فضول ہے
جسکی زبان اور دل کے راستے الگ الگ ہوں
تو اس کا جگر خنجر سے شکاف شکاف ہو جائے
سانپ کا بدن باہر سے جتنا خوبصورت نظر آتا ہے
اندر سے اتنا ہی نا صاف ہوتا ہے

بہادوروں کا عمل زیادہ اور کہا کم ہوتا ہے
مگر نامردوں کا عمل کم اور لائیں زیادہ ہوتی ہیں
اگر یہاں (اس دنیا میں) خوشحال کا ہاتھ ظالم کے گریبان تک نہیں پہنچ سکتا
تو قیامت کے دن خدا میرے دشمن (اور غریب) کو معاف نہ کرے۔“

تعارف میں بے باکی اور جنسی کلام کے باہمی تعلق کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ اب وہ مقام
آ گیا ہے کہ خوشحال کی اس بے باکی کو بھی تعارف کرایا جائے۔ مقصد وہی جرات انگیز
ہے۔ جو بہت کم شعراء میں پائی جاتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ خوشحال کا جنسی کلام اس لیے بھی
پیش کیا جانا چاہیے کہ جنسیات سے کسی کو بھی مفر نہیں اور اگر یہ ہماری حیات کا اتنا ضروری
امر ہے تو پھر اسے وہی اہمیت دی جائے جس کی یہ مستحق ہے۔ خوشحال کی جنسی شاعری سے
کچھ اشعار پیش خدمت ہیں:-

ترجمہ:- ”اگر سفید ریش آدمی اپنی ڈاڑھی خضاب کے ساتھ کالی کرے
اور اپنے آپ کو اپنی جوان بیوی کے سامنے جوان سمجھے
تو (یاد رکھو) جوان بیوی کا دل بوڑھے خاوند سے بے زار رہتا ہے
اگر چہ وہ اپنی جوان بیوی کو بڑے ناز و نعم سے رکھے“
”شکر لیوں کے بوسے بوڑھے کو جوان کر دیتے ہیں
یہ بات خوشحال کی آزمائی ہوئی ہے“
”عشاق جب اپنے سروں کی بازی لگا دیتے ہیں
تب جا کر دلبروں کے نرم اور نعلی ہونٹوں کو چومنا نصیب ہوتا ہے“
”وہ اپنا سفید منہ میرے کانوں کے پاس لائی
اور نہایت نرمی سے کہا کہ
میں تو اپنی زلفیں کھول کر تیرے چنگ کے پاس آئی ہوں
پر میری جان تم ابھی تک سوئے ہوئے ہو“
”اگر کبھی بھی میرا ہاتھ تجھے تک پہنچ سکے
تو تیرے سفید چہرے پر اپنے دانتوں کے سیاہ نشان چھوڑ دوں گا“
”اپنے دونوں ہونٹ خوشحال کے ہونٹوں پر رکھ دے
کہ لوگ طوطوں کو شکر ہی کھلاتے ہیں“
”کوئی بھی اس بے پردہ زمانے کو مطلع نہ کرے“

کیونکہ آج محبوب نے خوشحال کو چھپا کر بوسہ دیا ہے۔
 ”یا اپنا سرا اپنی گردن کے خون سے رنگ دوں گا
 یا پھر تیرے خوبصورت ہونٹ چوم لوں گا۔“

غرض یہ کہ خوشحال میں انسان کی جنسی ضروریات کا احساس صاف نظر آتا ہے۔ یہ چند اشعار وہ سب کچھ نہیں جو خوشحال کے جنسی کلام میں پایا جاتا ہے۔ بہر حال یہ خوشحال کا اپنے شہوانی جذبات پر جرات اظہار اور بے باکی کا زندہ ثبوت ہیں۔ اسی سلسلے میں خوشحال کی یہ نمائندہ غزل دیکھیں جو ایک نو خیز لڑکی کو دیکھ کر لکھی گئی ہوگی:-

ترجمہ:- ”آج میری محبوبہ وہی ہے جو علاتے بھر میں آشکارا ہے
 ابھی کم عمر لڑکی ہے سر کے بال کٹے ہوئے

جیسے ابھی اپنے باپ بھائی سے بھی شرم و حجاب نہیں
 سونے کا ایک چھوٹا سا لال رنگ کا بلاق ناک میں پڑا ہوا
 اور ریشم چھوٹی چھوٹی سی، نسترن چہرے والی، مرجین
 سنبل کی طرح بالوں والی پری

ہونٹ جیسے شکر، خوش خوش (رہنے والی) بہرنی کی سی آنکھوں والی
 پھول سے گالوں والی“

قد میں عمر کا چیز، کمر بال کی طرح پتلی، سر سے پاؤں تک ایک قلمی تصویر
 دل کی چتر، شوخ چٹیل، ظلم کی عادی، دل دکھانے والی

میں تو اس کی ایک ایک نگاہ پر جان دیتا ہوں
 اور اسے میری پرواہ بھی نہیں ہے
 جب اسکے آگے کوئی میرا نام لیتا ہے
 تو گالیوں پر اترا آتی ہے
 کیا کروں اس کا کیا علاج اور کیا تدبیر کروں
 ڈر کے مارے دم نہیں مارا جاتا
 ادھر تو اس کی خوبواہی ہے
 اور ادھر مجھے اس سے بے حد محبت ہے
 خدا را مجھ غریب پر یہ کیا بلا آ پڑی
 در پردہ راز و نیاز چاہوں تو اسے ان باتوں کا علم ہی نہیں
 اگر زور زبردستی چلاؤں تو اس کے گھرانے والے بڑے خونخوار ہیں
 دولت کے عوض مانگتا ہوں تو وہ بے حساب دولت طلب کرتے ہیں
 یہاں نہ زور سے کام لگتا ہے نہ زور سے
 اور دنیا میں یہی دو وسیلے ہیں
 خوشحال کو بھروسہ خدا پر ہے اور اسے شیخ رحمکار یا پھر تم پر ہے۔“
 آئیے خوشحال کی حق گوئی اور بے باکی کو ایک اور مذاویہ سے دیکھتے ہیں:-
 واکثر اقبال کا ایک شعر ہے:-

آئین جواں مرداں حق گوئی و پیما کی

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روپائی

خوشحال خان خٹک اور ڈاکٹر اقبال اس شعر کی زندہ مثالیں ہیں۔

خوشحال کی حق گوئی اور پیما کی ان کی کلیات سے واضح ہے اور انکی

جو انفرادی انکے کردار سے ظاہر ہے۔ خوشحال خان کے کردار شیر اور

شاہین ہیں اور انکی شاعری شیر اور شاہین کے کردار کی ترجمان ہے۔

خوشحال خان کی شاعری میں جتنی حق گوئی اور پیما کی ہے میں نہیں کہہ

سکتا کہ کسی اور شاعر کی شاعری میں یہ صفت اتنی شدت کے ساتھ پائی

جاتی ہو۔ اسی طرح ہمارے زمانے میں ڈاکٹر اقبال کی حق گوئی اور

پیما کی ایک ایسا نادر نمونہ ہے کہ خوشحال خان کے علاوہ شاید ہی کسی

دوسرے شاعر کی شاعری میں یہ صفت اتنی شدت سے پائی جاتی ہو۔

(میاں سید رسول دسا "خوشحال خان اور اقبال میں حق گوئی اور پیما کی")

اسی لیے تو علامہ اقبال نے خوشحال کے متعلق کہا تھا:-

خوش سرود آں شاعر افغاں شناس

ہر کہ ہند، باز گوید بی ہر اس

راز قوسے دید و بے باکانہ گفت

حرف حق با شوخی رندانہ گفت

خوشحال کے کلام سے چند اشعار جن میں حراتِ اظہار کا عنصر بدچاہتم موجود ہے:-

مست یم مئے پرست یم رندی کر مہ کر مہ کر مہ
 وآورہ محتسبہ باذہ خور مہ خور مہ خور مہ
 ترجمہ:- میں مست ہوں، مئے پرست ہوں رندی کرتا ہوں کرتا ہوں کرتا ہوں۔

سن اے تختب میں شراب پیتا ہوں پیتا ہوں پیتا ہوں۔

سر پہ دار لک شوے بنہ دے

نہ لک شوے پہ پیغور

ترجمہ:- طعنے کے بوجھ تلے سر جھکانے سے دار پر

سر کا لنگ جانا بہتر ہے۔

خو وان خلی لہ غلیمہ انتقام

مرد نہ خوب کا نہ خوراک کا نہ آرام

ترجمہ:- مرد جب تک اپنے دشمن سے انتقام نہ لے لے

اس وقت تک نہ سوتا ہے نہ کھاتا ہے اور نہ ہی آرام سے بیٹھتا ہے۔

د پیسلو پانی خورہ پہ غرہ کبھی اوسہ

نہ چپی پان د ہندوستان خوری زما جندہ

ترجمہ:- اے میرے نوجوان چمیل کے بچے کھا اور پہاڑوں میں رہ

نہ کہ ہندوستان کے پان کھاتا پھرے

د منت دارو کہ سرم پکار می نہ دی
 کہ علاج لرہ می راشی مسیحاحام
 ترجمہ:- اگر میرے علاج کے لئے مسیحا بذات خود بھی آ جائے تب بھی مجھے منت کی ودا
 قبول نہیں ہے چاہے میں مری جاؤں۔

غالب

جرات ' اظہار اور بے باکی

جب ہم غالب کے ذاتی اور معروضی حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو انکی خود پرستی کا
 عنصر انکی پوری زندگی اور انکی شاعری پر اثر انداز ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ غالب کی شخصیت پر
 بحث کرتے ہوئے اسی کتاب میں غالب کی خود پرستی اور اسکے اثرات کے بارے میں
 ڈاکٹر وزیر آغا کے مقالے ”غالب کی شخصیت“ سے جو اقتباس پیش کیا گیا تھا وہ اس پوری
 صورت حال کو سمیٹنے کے لئے کافی ہوگا۔ اس اقتباس کا ایک ٹکڑا ملاحظہ کیجئے:-

”غالب کی عام زندگی میں خود پرستی کا جذبہ بالکل معمولی باتوں سے

وجود میں آیا ہے۔ مثلاً خاندانی وجاہت پوچھ آ با پنشن ’نصب‘ خلعت‘

ور بار تک رسائی وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔۔ (چنانچہ) دوسرے لفظوں میں

غالب اپنے شعر میں خود کو احساسی اور جذباتی طور پر لوگوں کی سطح سے اونچا تصور کرتا ہے۔

یہاں خاندان و جاہت اور پیٹھ آباء کو غالب کی خود پرستی کی وجوہات میں شامل کیا گیا ہے۔ دونوں وجوہات پر بھی غالب کی شخصیت پر بحث کے دوران سیر حاصل گفتگو ہو چکی یہاں صرف اتنا عرض کرتا ہے کہ غالب کے مزاج کی تشکیل میں ان عناصر کا ایک اہم حصہ رہا ہے۔ اسی وجہ سے غالب کے اندر زندگی کی رتی کچھ زیادہ ہی توانا تھی اور ظاہر ہے کہ اس کا اثر ان کی زندگی کے آخر تک رہا۔ اگلے آخری زمانے کے مکاتیب اس امر کا بین ثبوت ہیں۔ آئیے دیکھیں کہ خاندانی و جاہت اور پیٹھ آباء غالب کی شخصیت پر اثر ڈالتے ڈالتے ان کی جرات اظہار اور بے باکی پر کس حد تک اثر انداز ہوئے ہیں:-

پروفیسر یوسف زاہد غالب کی خاندانی و جاہت اور پیٹھ آباء کے بارے میں فرماتے ہیں:-

”یعنی وہی حسب و نسب پر فخر، حد سے بڑھا ہوا احساس برتری“

خود نگری، اپنی ذات کو دوسروں سے بلند سمجھنا، وہی سپاہیانہ لب و لہجہ، قوت مردانگی، مزاج کا جوشیلا پن، اپنی ہی بات کو صحیح خیال کرنا، کسی کے آگے سر نہ خم کرنا، وضعداری کی سختی سے پابندی اور اپنی آن پر حرف نہ آنے دینا، یہ وہ خصوصیات تھیں جو غالب کو ورثے میں ملی تھیں اور جن کا اظہار ان کی شاعری میں جا بجا ملتا ہے۔ بلکہ اکثر وہ خود اس پر بڑے فخر و ناز کا اظہار کرتے ہیں۔ غالب کی شخصیت کے

اس پہلو نے بھی ان کے لب و لہجے کی توانائی اور تندی و تیزی میں
نمایاں حصہ لیا ہے۔

غالب از خاک پاک تو را نیم
لا جرم در لب فرہ مندیم
ترک ز اویم و در نزد ہے
بسترگان قوم پیوندیم
ایکم از جملہ اتراک
در تمامی زمانہ در چندیم
سوشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گیری
کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

(پروفیسر یوسف زاہد "غالب کا شاعرانہ لب و لہجہ")

غالب کی خود پرستی ہی ان کے لہجے کی قوت و جوش کی واحد وجہ نہیں تھی۔ غالب کے زمانے
میں بدلتی تہذیبی فضا نے بھی ان کے لب و لہجے کی تیزی میں اپنا کردار ادا کیا تھا۔ مغلیہ
حکومت کے جاگیرداری نظام سے منسلک معاشرتی حالات کے زیر اثر اردو شاعری کے
لب و لہجے میں تیزی نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ غالب سے پہلے اردو شعراء ہندوستان
کی پرانی تہذیب سے چپے رہنے اور ولی دکنی کی بے پروی کرتے کرتے اردو شاعری کو بے بسی
اور محرومی کے سوا کچھ بھی نہ دے سکے۔ ظاہر ہے اس سے اردو شاعری کے لب و لہجے میں

زندگی اور توانائی کی آخری رمق بھی مفقود ہو کر رہ گئی حتیٰ کہ غالب ایک منفرد اور توانا لب و لہجہ کے ساتھ ہندوستان کے ادبی افق پر نمودار ہوئے۔

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم
میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہ آفتابیں سے بال عناقا جل گیا

چونکہ غالب میں ذوقِ تجسس بدرجہ اتم موجود تھا۔ اس لیے وہ نت نئے حقائق کی تلاش کر کے ان پر اظہارِ خیال کرتے۔ انہوں نے قیس کی صحرانوردی میں حرکی توانائی دیکھی اور اسے تسلیم کر لیا لیکن فرہاد اور منصور حلاج کی قربانیوں سے متاثر نہیں ہوئے۔ اس سے انکی شاعری کے لب و لہجہ کو ایک اور سمت بھی مل گئی۔

آئیے غالب کے ان اشعار کا لطف اٹھاتے ہیں جن میں غالب نے فرہاد اور منصور حلاج کے بارے میں اپنا فیصلہ سنایا ہے:-

تیشے بغیر مرنہ سکا کو بہکن اسد
سرکشۂ خمار رسوم و قیود تھا
عشق و مزدوری عشرت کہ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامی فرہاد نہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تک ظرفنی منصور نہیں

غالب کے کلام کا مطالعہ کرنے پر یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہیں انسانی نفسیات سے دلچسپی تھی اسکی دو صورتیں تھیں۔ ایک تو دوسروں کی نفسیات کو پرکھنے کا عمل اور دوسرے خود اپنی ذات کے معنوی وجود کا احساس۔ اسے احساس ذات کہہ لیجئے یا عرفان ذات اسکے نتیجے میں اپنا آپ ہمارے سامنے آ موجود ہوتا ہے۔ آپ اسکی اچھائیاں دیکھ لیں اور چاہیں تو اپنی شخصیت کی کمزوریاں اور بد وضع گوشے:-

ہنگمہ زبونی ہمت ہے انفعال

حاصل نہ کیجئے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

اگر جذبے، فکر اور تخیل کے احتراز سے الفاظ میں موسیقیت پیدا کی جاسکتی ہے تو ترکیبوں، تشبیہوں اور استعاروں سے شعر میں اس سے بھی زیادہ جادو جگایا جاسکتا ہے۔ غالب نے اس صفت گری میں بھی کمال پیدا کر کے اپنی شاعری کے لب و لہجے کو سنوارا:

”غالب کے ہاں جو تازہ نگلفہ استعاروں، تشبیہوں اور خصوصیات سے

ترکیبوں کی فراوانی نظر آتی ہے اس میں بھی دراصل یہی انفرادی ایج

دکھانے کی کوشش کا فرما ہے۔ اس کے تجربات ایک انفرادی شان رکھتے

ہیں۔ اس لیے اس نے انہیں شعر کے قالب میں ڈھالنے کے لئے بڑی

تادد اور منفرد تشبیہات، استعارے اور ترکیبیں استعمال کی ہیں۔ اس نے

اسلوب کی مروجہ عام پسند اور پیش پا افتادہ صفتوں سے کام نہیں لیا۔ اس کے انداز بیاں میں جوتازگی اور نیا پن ہے وہ اس کی انفرادیت کا عکس ہے۔ اس نے اپنے اظہار مطلب کے لیے نئے سے نئے حیرائے تلاش کئے ہیں۔ ہیئت میں کسی نمایاں تبدیلی کی صورت میں نہیں بلکہ لفظوں کے اثر انگیز اور معنی خیز مرکبوں کی صورت میں۔“

(آفتاب احمد ”اردو شاعری میں غالب کی اہمیت“)

عرض کیجئے جو ہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

مجھے اب دیکھ کر ہر شفق آلود یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

جلوہ زار آتش دوزخ ہمارا دل سہی
فتیہ شور قیامت کس کے آب و گل میں ہے

ذموظ ہے اس معنی آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوہ برق فنا مجھے

نکدہ گرم سے اک آگ چلتی ہے اسد

ہے جہانِ خس و خاشاک گلستاں مجھ سے

یوں تو غالب کے اردو دیوان میں بھی تیزی و تندگی 'توانائی' مردانگی اور یقین سے پر اشعار مل جاتے ہیں۔ لیکن غالب کا اصلی رنگ قاہراندہ باغیانہ دیکھنا ہو تو ان کا فارسی کلام ایسے اشعار کا آئینہ دار ہے:-

کردہ ام ایمان خود را دست مزد خویش

می تراشم بیکر از سنگ و عبادت می کنم

ضروری نہیں کہ لب و لہجہ سخت ہی ہو۔ نرم لب و لہجہ بھی زندگی کا حصہ ہے۔ بعض انسان یا تو بہت سخت یا بہت نرم لب و لہجہ رکھتے ہیں۔ مگر ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جن کا لب و لہجہ کبھی سخت اور کبھی دھیمہ ہوتا ہے۔ میں غالب کو اس آخری زمرے میں شمار کرتا ہوں پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ غالب کی اردو شاعری میں تیز و تند لب و لہجہ لئے اشعار زیادہ نہیں۔ میری تحقیق کے مطابق ایسے اشعار ساٹھ ستر سے زیادہ نہیں تو پھر ڈیڑھ ہزار اشعار پر مشتمل اردو دیوان میں کے باقی اشعار تیز و تند لب و لہجہ لئے ہوئے نہیں ہیں۔ آئیے ایسے اشعار کا بھی حراٹھا لیں کہ بہر حال ان کا تعلق غالب کی شاعری کے لب و لہجہ سے ہی ہے:-

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں

طاقت بقدر لذت آزار بھی نہیں

اسلوب کی مروجہ عام پسند اور پیش پا افتادہ صفتوں سے کام نہیں لیا۔ اس کے انداز بیاں میں جوتازگی اور نیا پن ہے وہ اس کی انفرادیت کا عکس ہے۔ اس نے اپنے اظہار مطلب کے لیے نئے سے نئے حیرائے تلاش کئے ہیں۔ بحیثیت میں کسی نمایاں تبدیلی کی صورت میں نہیں بلکہ لفظوں کے اثر انگیز اور معنی خیز مرکبوں کی صورت میں۔“

(آفتاب احمد ”اردو شاعری میں غالب کی اہمیت“)

عرض کیجئے جو ہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

مجھے اب دیکھ کر ہر شفق آلود یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

جلوہ زار آتش و دوزخ ہمارا دل سہی
فتنہ شور قیامت کس کے آب و گل میں ہے

دھونڈے ہے اس مفعی آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوہ برق فنا مجھے

گندہ گرم سے اک آگ چلتی ہے اسد

ہے چراغاں خس و خاشاک گلستاں مجھ سے

یوں تو غالب کے اردو دیوان میں بھی تیزی و تندہی 'توانائی' 'مردانگی' اور یقین سے پر اشعار مل جاتے ہیں۔ لیکن غالب کا اصلی رنگ قاہر اندوہناغیانہ دیکھنا ہو تو ان کا فارسی کلام ایسے اشعار کا آئینہ دار ہے:-

کرد و ام ایمان خود را دست مزد خوشن

ی تراشم بیکر از سنگ و عبادت می کنم

ضروری نہیں کہ لب و لہجہ سخت ہی ہو۔ نرم لب و لہجہ بھی زندگی کا حصہ ہے۔ بعض انسان یا تو بہت سخت یا بہت نرم لب و لہجہ رکھتے ہیں۔ مگر ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جن کا لب و لہجہ کبھی سخت اور کبھی دھیمہ ہوتا ہے۔ میں غالب کو اس آخری زمرے میں شمار کرتا ہوں پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ غالب کی اردو شاعری میں تیز و تند لب و لہجہ لئے اشعار زیادہ نہیں۔ میری تحقیق کے مطابق ایسے اشعار ساٹھ ستر سے زیادہ نہیں تو پھر فیضان ہزار اشعار پر مشتمل اردو دیوان میں کے باقی اشعار تیز و تند لب و لہجہ لئے ہائے نہیں ہیں۔ آئیے ایسے اشعار کا بھی مزہ اٹھائیں کہ بہر حال ان کا تعلق غالب کی شاعری کے لب و لہجہ سے ہی ہے:-

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں

طاقت بقدر لذت آزار بھی نہیں

یہ تعلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ ملے
جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے

ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے
کہ جو شریک ہو میرا شریک غالب ہے

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

سمیٹنے دے مجھے اب ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامن خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے

ہمارے شعر ہیں اب صرف دگی کے اسد
کھلا کہ فائدہ عرض ہنر میں خاک نہیں

لے تولوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

اسد مجھ میں ہے اس کے بوسے پاکی کہاں حرات
کہ میں نے دست و پا باہم بہ شمشیر لوب کاٹے

نہ لڑنا صح سے غالب کیا ہوا اگر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیر بار منت درباں کئے ہوئے

نے حیرت کماں میں ہے نہ صیاد کہیں میں
گوشتے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

غالب سے کشی تو کرتے ہی تھے۔ ان کے سے آلودہ اشعار بھی کچھ کم شمار نہیں رکھتے۔
قارئین کی دلچسپی کے لیے ایسے چند اشعار حاضر ہیں کہ یہ بھی مرزا کا ایک لب و لہجہ ہے:-

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

ساقیا دے ایک ہی ساغر میں سب کو سے کہ آج
آرزوئے بوسے لب ہائے میگوں ہے مجھے

رات کے وقت سے پیئے ساتھ رقیب کو لئے
آئے وہ ہاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

جب سے کدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو ، مدرسہ ہو ، کوئی خانقاہ ہو

رات پناہِ رحم پہ سے اور صبح دم
دھوئے دجے جلد اِ حرام کے

کہاں سے خانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ

پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

غالب کے سفر بنارس و کلکتہ کا بیان پہلے گزر چکا۔ اس سفر سے واپسی پر غالب نے جو غزلیں

لکھیں۔ وہ جنسیات کے زمرے میں تو نہیں آتیں لیکن ان اور ان سے پہلے اپنی ایک

محبوبہ کی موت پر لکھی ہوئی غزل میں غالب کا شعری لب و لہجہ جنسیات اور حسن پرستی کے

بین بین بیٹھتا ہے۔ غالب نے اپنی محبوبہ کی موت پر جو غزل لکھی اسکے چند اشعار:-

عمر بھر کا تو نے بیان وفا باندھا تو کیا

عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے

شرم رسوائی سے جا چھپنا نقاب خاک میں

ختم ہے الفت کی تجھ پہ پردہ داری ہائے ہائے

کس طرح کانٹے کوئی شب ہائے تاریک

ہے نظر خو کردہ اختر شماری ہائے ہائے

عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ

رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوق خواری ہائے ہائے

اس کے کئی سال بعد کلکتہ سے واپسی پر غالب نے یہ اشعار لکھے :-

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نہیں

اک حیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

وہ سبزہ زار ہائے مطر آ کہ ہے غضب

وہ ناز نہیں بتان خود آرا کہ ہائے ہائے

صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حق نظر

طاقت رہا وہ ان کا اشارہ کہ ہائے ہائے

غالب نے نکلکتہ جاتے ہوئے بنارس کی سیر بھی کی۔ واپسی پر بنارس کے متعلق جو مثنوی لکھی

جس میں ”خواہش گیرائی“ کا اظہار بہت صاف صاف ہے:-

زر نگین جلوہ ہا غار نگری ہوش

بہار بستر و نو روز آغوش

پہ تن سرمایہ افزائش دل

سراپا مژدہ آسائش دل

غالب سلیم الخیاں انسان تھے۔ ان کی زیادہ سے زیادہ حد جنسیت یہاں آ کر ختم ہوتی

ہے:-

ز چشم و دل پہ تماشا قمع اندوزیم

ز جان و تن بدارا زیاں مگردانیم

گمے بہ لا بہ سخن با ادا بجا میزیم

گمے بہ بوسہ زباں و در دہاں مگردانیم

اور یہ حسرت بھرا شعر:-

تکلف برطرف لب تھمے بوس و کنار اتم

ذرا ہم باز بھیں دام نوازش پائے پنہاں را

مرزا کے لب و لہجہ کی ایک اور قسم وہ ہے جو وہ خالص اردو زبان استعمال کرتے وقت برہیں۔ اس میں فارسی الفاظ و تراکیب کم ملتی ہیں۔ اور یہ لب و لہجہ اپنا ایک خاص تاثر قائم کرتا ہے۔ اس سلسلے میں غالب کی چھوٹی بحر میں لکھی ہوئی اردو غزلوں کے چند اشعار دیکھئے اور لب و لہجہ پر نظر رکھیئے:-

چاہئے اچھوں کو بتنا چاہئے

یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہئے

کب وہ سنتا ہے کہانی میری

اور پھر وہ بھی زبانی میری

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں

پھر وہی زندگی ہماری ہے

مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا

میں غریب اور تو غریب نواز

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے

ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

کوئی دن گر زندگانی اور ہے

اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

کہتے ہیں کہ غالب کے شاعرانہ لب و لہجہ کے بڑے بڑے عمرک انکی شخصیت میں موجود انانیت 'پُر جوش الفاظ کا استعمال' ان الفاظ کا صوتی آہنگ اور زیر و بم 'موسیقیت' 'شوخی' جنسیات و حسن پرستی اور بعض اوقات فارسی الفاظ و تراکیب سے پاک خالص اردو الفاظ کا استعمال ہیں۔ مجموعی طور پر انکے فارسی کلام میں جوش و ولولہ اور مردانہ وقار نہ رنگ انکے اردو کلام سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ ایک اور خاص بات یہ ہے کہ غالب کا لب و لہجہ انکے اردو کلام میں متوازن سطح پر رہتا ہے۔ ڈاکٹر ایس ایم اکرام کے مطابق ان کے متوازن تحت اشہور کو یہ گوارہ نہ تھا کہ وہ رجز بات سے جس تناسب جاتی رہے۔

مگر غالب کو ہم نابینہ نہ مانتے اگر ان کا یہ شعر ہماری نظروں سے نہ گذرتا۔

میں جنوں میں کی جو اسد التماس رنگ

خون جگر میں ایک ہی غوطہ دیا مجھے

خوشحال و غالب کی شاعری میں حُسن و عشق

”حسن کیا ہے؟ اس سیدھے سے سوال کا جواب مشکل بھی ہے اور
 عجیبہ بھی۔ حسن سرور انگیز بھی ہوتا ہے اور نظر افروز بھی۔ وہ جسم سے
 منزہ بھی ہوتا ہے اور جسم سے وابستہ بھی۔ اس کی پہچان فطری ہے اور
 اس پہچان کی تحلیل نے فلسفہ و فکر کی بے شمار راہیں کھول دی ہیں۔
 سقراط (۳۹۰ ق م۔ ۳۹۹ ق م) کے خیال میں حسن ذات الہی کا
 مظہر ہے اور تناسب و ہم آہنگی اس کے ناگزیر اجزاء ہیں۔ افلاطون کی
 نظر میں یہ ”خیر محض“ کا فیضان ہے اور اس کو محسوس کرنے کے لیے
 ذہن کی رفعتیں ضروری ہیں۔ حسین ترین شے وہ ہے جو رفیع ترین
 ذہن کو اپنی طرف متوجہ کرے۔ ارسطو (۳۸۴ ق م۔ ۳۲۲ ق م)
 افلاطون کے نظریے کو عقلیت کا رنگ دیتا ہے۔ لیکن اس سے بات
 بدلے نہیں۔ حسن پھر بھی ایک مظہر رہ جاتا ہے۔ اور حسین صرف عقل کا
 خدا یا کائنات کی ذات“

(پروفیسر سید محمد تقویم الحق کا کخیل ”خوشحال خان کا تصور جمال“)

حسن کی اس تعریف کے بعد عشق اور حسن و عشق کے باہمی تعلق کو معلوم کئے بغیر بات نہیں بنتی۔ اسلئے آئیے پروفیسر حمید اللہ خان نے اس سلسلے میں جو وضاحت کی ہے اس سے جانکاری حاصل کریں:-

”حسن و عشق کو ہم یہاں بطور ایک ملی جلی حقیقت کے دیکھ رہے ہیں کیونکہ یہ دونوں ایک ہی ذہنی کیفیت کے دو بظاہر مختلف ظہور ہیں۔ عشق وہیں ہوتا ہے جہاں حسن نظر آئے اور جہاں عشق ہو وہاں حسن ضرور نظر آتا ہے۔

شوقی حسن و عشق ہے آئینہ دار ہم و در

خار کو بے نیام جان ہم کو برہنہ پا بچھ

اس یکا گنت کے باوجود ہم حسن و عشق کے درمیان عام گفتگو میں فرق ضرور کرتے ہیں۔ حسن کو ہم ایک بیرونی حقیقت قرار دیتے ہیں یعنی ایک ایسی چیز جو ہمارے ذہن سے علیحدہ ایک مستقل وجود رکھتی ہے۔ اسی بیرونی حقیقت سے ہمارا وہ ذہنی تعلق ہے جو بالعموم خواہش کے رنگ میں پیدا ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر حسن میں نہیں تو عشق میں بھینا ہماری اپنی شخصیت منعکس ہوتی ہے“

(پروفیسر حمید اللہ خان ”غالب کی شاعری میں حسن و عشق“)

اب ہم خوشحال و غالب کی شاعری میں حسن و عشق کا جائزہ لیتے ہیں:

خوشحال کی شاعری میں حسن و عشق

حسن

گو کہ حسن و عشق میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ لیکن خوشحال کی شاعری میں حسن و عشق کا جائزہ لیتے وقت اگر ہم ان دونوں کو الگ الگ برتیں اور اسکے بعد (یا اس عمل کے دوران بھی) ان کا باہم ملاپ ہو تو یہ نہ صرف ایک دلچسپ امر ہوگا بلکہ ہم موضوع کے ساتھ بھی پورا پورا انصاف کر پائیں گے۔

تعارفی کلمات میں حسن کی جو تعریف کی گئی ہے اگر اس پر اضافہ کرتے ہوئے یہ کہا جائے کہ بعض انسان پیدا نشی حسن شناس ہوتے ہیں تو کیسا ہو:-

”خونخاں نے جب اس دنیا میں آنکھیں کھولیں تو اپنے ساتھ ایک حسن بین نظر اور حسن شناس مزاج بھی لائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظر نے حسن کے ہر پہلو سے پردہ اٹھایا ہے۔ نباتاتی اور انسانی حسن سے لیکر حسن ازل تک وہ کونسا موضوع رہ جاتا ہے جس پر خوشحال نے اپنے جمالیاتی افکار یا تاثرات کا اظہار نہ کیا ہو“

(ڈاکٹر اقبال صمیم خشک ”خوشحال اور جمالیات“)

خوشحال نے انسانی حسن کے موضوع پر گراں مایہ اشعار چھوڑے ہیں لیکن ان میں سے جس شعر کو حسن کے ضمن میں بار بار دہرایا جاتا ہے اور جسے قبول عام کا درجہ حاصل ہو چکا ہے یہاں بطور خاص پڑھنے کے لائق ہے:-

پہ خان او پہ جہان کنسی نہا دوہ خیزہ دی او کنسلی

پہ خان کنسی دواہ ستر گہی پہ جہان کنسی واہ کنسلی

ترجمہ:- اپنے آپ میں اور اس پورے جہان میں میں نے دو چیزیں پسند کی ہیں۔

اپنے آپ میں دونوں آنکھیں اور جہان میں سارے حسین“

یہ خوشحال کا ایک نہایت ہی پہلو دار اور اثر انگیز شعر ہے۔ ذرا غور کیجئے انہوں نے کس خوبصورتی کے ساتھ حسن اور عشق کو ایک ہی جگہ پر مجتمع کر دیا ہے۔ آنکھوں سے حسن کو دیکھا جاتا ہے یہاں آنکھیں بدوہ عاشق کے سامنے آتی ہیں۔ اور دنیا کے تمام حسین حسن کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ایک ہی شعر میں حسن و عشق اس خوبصورتی سے سمو دیا خوشحال جیسے حسن مین شاعر ہی کا حصہ ہے۔

انسانی حسن میں ایک ایک عضو کی تعریف کر کے انہیں حسن مکرر پیدا کرنے میں بھی خوشحال کو کمال حاصل ہے۔ خوشحال کی جو غزل اب پیش کی جا رہی ہے۔ اس میں پشتو زبان نے جو چاشنی پیدا کی ہے اسکا اردو میں ترجمے سے قدرے متاثر ہونے کا امکان تو بہر حال رہے گا۔ غزل کی طوالت کے باعث اس کا پشتو متن پیش نہیں کیا جا رہا لیکن آپ کو اس کے اردو ترجمے میں خوشحال کی حسن بینی کی خاصی جھلک نظر آئے گی۔ اس غزل میں نہ

صرف اپنی محبوبہ کے حسن بلکہ اس حسن میں ہم آہنگی کی بھی تعریف کی ہے:-
 اور دوسرا حصہ:-

غزل

”تیری کالی چونیاں درخت کے گرد لپٹے ہوئے سانپ ہیں
 تیری زلفیں نو بہار کے سنبل کے تار ہیں
 تیری کالی آنکھیں ملک خطا کی ہر نہیں ہیں
 جو سنبل زاروں میں مست خرام ہیں
 تیرے کالے امروکمان سے مشابہ ہیں
 اور تیری پلکیں تیروں کا کام دیتی ہیں
 عاشق ان دونوں کے وار سے زخمی پڑے ہیں
 تیری مصحف پیشانی بلور کو شرماتی ہے
 اور بیدل لوگ ہزاروں کی تعداد میں اسکے خریدار ہیں
 یہ جو تیرے دونوں امروؤں کے درمیان ایک خال ہے
 اس کو تو دیکھ کر ملک خطا کے اصلی نافر بھی قربان قربان جاتے ہیں
 تیری سفید ناک زنبق کی کلی ہے
 اور اس کے چہار سو گلزار کے پھول کھلے ہوئے ہیں
 اور تیرے دونوں رخسار چنے کے پھولوں سے بہتر ہیں

تیرے سفید دہن کو میں غنچے کے ساتھ نسبت دیتا ہوں
 اس غنچے کی تمام کلیاں شکر بار ہیں
 تیرے دونوں لال ہونٹ سرخ لعلوں کو شرماتے ہیں
 اور تیرے سفید اور بے بہا دانت جیسے در شہوار ہیں
 تیری خوبصورت ٹھوڑی شرقند کے سیب کی مثال ہے
 جسکی مٹھاس نبات کی مٹھاس سے زیادہ ہے
 تیرا سفید گلا چاندی کا بنا ہوا ہے
 اور تیرے سیم آسا کاندھے بھی اسی شمار میں ہیں
 تیرا پورا تن بدن حلب کے شیشے کی طرح صاف ہے
 ایسا کہ درون کے راز اس میں سے نمودار ہوئے جاتے ہیں
 تیرے سفید بازوؤں نے مصری کی ڈلی کی سفیدی کو اندھیرے میں دھکیل دیا ہے
 اسی لیے ان کے گلے پر ہزاروں کا خون ہے
 تیرے سرخ ناخن یا قوت کے نگینے ہیں
 اور یہ تیری مخروملی انگلیوں پر اٹکے ہوئے ہیں
 تیری ناف کی گانٹھ گلاب کا ایک پھول ہے
 اور اسکے ارد گرد پھولوں کی پتیوں کا انبار لگا ہوا ہے
 تیری پنڈلیوں کی تعریف سے قاصر ہوں

مگر یہ سفیدی سے بھی زیادہ سفید ہیں

حیرت انگیز و کے درخت کی مثال ہے

اور جب تم سنگسار کر کے ٹٹکتی ہو تو سر تا پا دیکھنے کی چیز ہو

ایسی حالت میں تو ہندوستان کی تمام رانیاں تم پر قربان جائیں“ (۱)

خوشحال کی حسن شناس طبیعت نے حسن کی باریکیوں کو خوب سمجھا اور پرکھا ہے۔ وہ صرف

خوبصورتی کو حسن کا ورد نہیں دیتے بلکہ انسانی اعضاء اور چہرے کے تاک نقش کی ہم آہنگی

سے حسن کا جو مجموعی تاثر پیدا ہوتا ہے اس سے حسن کا تعین کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال نسیم

خلک کے نزدیک یہی عمومی تاثر دل میں جا بٹاتا ہے خوشحال فرماتے ہیں:-

بنہ صورت خو ہم ہفہ چہ زبہ نہی یورہ

نہ چہ کبرہ ورہ نہی بنہ دی بنہ صورت دے

ترجمہ:- اچھی صورت تو وہی ہے جو دل لے جائے

یہ نہیں کہ بس اچھی صورت ہے۔

خوشحال نے اپنے کلام میں جا بجا آنکھوں اور دل کو بہت اہمیت دی ہے۔ آئیے اس کا سب

ڈاکٹر اقبال نسیم خلک سے جانتے ہیں:-

(۱) خوشحال کا تصور جمال “خوشحال مطالعہ“ ص ۱۶۵ تا ۱۶۷

”خوشحال نے حسن کے مشاہدے کے سلسلہ میں آنکھوں کی اہمیت پر بڑا زور دیا ہے۔ ان کے مطابق اللہ پاک نے ہمیں آنکھیں ایسے بخش دی ہیں کہ کائنات میں بکھرے ہوئے حسن اور خوبصورتی کو دیکھ سکیں:

زفا بہ ولہی دہنہ مخ نندارہ نہ کرم

ننداری لہ نہی زہ یسم پیدا کرے

ترجمہ: میں اچھی صورت کا نظارہ کیوں نہ کروں۔

کہہ دیکھنے ہی کے لیے تو مجھے پیدا کیا گیا ہے۔

ولہی راتہ واتہی چہی بہ ہنکلیو نظر مہ کرہ

سترگہی چہی پیدا دی خو خیل یار لہ گنہ

ترجمہ:- حسینوں پر نظر ڈالنے سے مجھے کیوں منع کرتے ہو۔ آنکھیں تو اپنے محبوب کو دیکھنے ہی کے لیے پیدا کی گئی ہے۔

بہ کالیو سرہ مخ بنائستہ کیہی

ستا بہ مخ بنائستہ ستا د مخ کالی دی

ترجمہ:- زیورات سے تو چہرہ خوبصورت ہو جاتا ہے مگر (میں دیکھتا ہوں کہ) تیرے چہرے کی خوبصورتی نے زیورات کو خوبصورتی بخشی ہے۔

خوشحال خان نے فارسی میں آنکھوں کی تعریف یوں کی ہے:-

چشم مخمور تو آخر کار کرو
 زلف صد سالہ را میخوار کرو
 روئے زود و آہ سرد و چشم تر
 عشق کوئی را چنیں بیمار کرو

جمال کے اور اک میں دل کی بھی ایک خصوصی اہمیت ہے۔ اور خوشحال اس اہمیت کو یوں
 اجاگر کرتے ہیں:

زہرہ مہی خدائے مہین کوی پہ بنائستہ و
 ہسی نہ چہ زہ پہ خیلہ زہرہ مائل کرم
 ترجمہ:- قدرت میرے دل کو حسینوں پر عاشق کرتی ہے۔
 نہ کہ میں خود دل کو ایسا کرنے پر مائل کرتا ہوں۔

(ڈاکٹر اقبال نسیم خٹک ”خوشحال کا تصور جمال“)
 انسانی حسن کے علاوہ خوشحال نے مناظر فطرت یعنی پہاڑوں، دریاؤں، ندی نالوں، چشموں،
 پانی، پتھروں، سبز وادہوں، پھولوں، پرندوں اور نباتات و حیوانات کے حسن کو بھی سراہا ہے۔
 یوں ہم خوشحال کے تصور حسن کو ایک مربوط علم کے طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ پھولوں کی تعریف
 کرتے کرتے خوشحال رنگوں کی دنیا میں کھوجاتے ہیں:

”آگستائن (۲۵۳ء۔ ۴۳۰ء) نے کہا ہے کہ ”ہر مادی چیز کا حسن
 اس کے حصوں کا تناسب، اعتدال اور رنگ کی نظر افزائی ہے“ رنگ

کا یہ تصور خوشحال خان کے ذہن پر بھی چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کے پورے مجموعہ شعری میں کہیں بھی مادی حسن، رنگ کی نظر افروز یوں کے بغیر نہیں پایا جاتا۔ حسن انسانی کا سرو پا ہو یا منظر فطرت کی تصویر۔ خوشحال خان کے ہاں ”رنگ“ کا تذکرہ ضرور ملے گا۔

د گلونو ہار پہ غارہ د دلبرو

شرموی لال و یاقوت او د لالا ہم

ارغوان کہ بنفشہ کنش شقائق دی

زبانی لری یو خائے جدا جدا ہم

ترجمہ:- پھولوں کے ہار حینوں کے گلے میں لعل، یاقوت اور گوہر تابدار کو غیرت دلاتے ہیں۔ ارغوان ہوں یا گل! لہ ہوں مل کر بھی خوبصورت ہیں اور الگ الگ بھی۔

دیکھیے ایک ساتھ تین تین چار چار رنگوں کی ہم آمیزی ہے اور اس

آمیزش سے ہی نہیں خوشحال ان کے باہم احتجاج سے بھی لطف لیتا

ہے۔ بلکہ میدان جنگ میں بھی رنگوں کا حسن اس کے احساسات پر

حادی نظر آتا ہے۔

سپینی توری نہی گلگونہی کروی بہ وینو

پہ اہار کنسہ شگفتہ شو لالہ زار

ترجمہ:- انہوں نے اپنی سفید چمکتی تلواریں کو خون سے سرخ کر لیا ہے۔ اور یوں اسازھ

کے مہینے میں گل لالہ کے کھیت کھل اٹھے ہیں۔

(پروفیسر سید محمد تقویم الحق کا کافیل ”خوشحال کا تصور جمال“)

خوشحال کی شاعری میں حسن کاری بدرجہ اتم موجود ہے۔ حسن کا بیان خوشحال کے ان اشعار پر ختم کرتے ہیں:-

پہ رنگ رنگینہ نہی پہ مخ نسرينہ نہی

پہ لب شیرینہ نہی پہ تن سیمینہ نہی

دوستہ گلزار نہی، ترسرتا پایہ

عیب دی داد ہے پہ زرہ سنگینہ نہی

ترجمہ:- تمہاری رنگت رنگین ہے اور چہرہ سفید گلاب جیسا۔

تمہارے لب قند و نبات کی طرح شریں ہیں اور تمہارا تن چاندی جیسا

تم مکمل گلزار ہو سرتا پا

لیکن تمہارا عیب یہ ہے کہ سنگین دل ہو۔

فارسی میں خوشحال کی حسن کاری قابل دید ہے:-

بتاب زلف و چچا چچا گیسو

صہوری از دل بے تاب بردہ

عشق

اے عشق کے تاج ' اگر تو میرے سر پر رہے
تو مجھے غم کے خراج سے آزادی مل جائے
بے درد تیری قدر کیا جانیں
اے عشق اپنے مالِ غنیمت سے مجھے مالا مال کر دے

یہ خوشحال کی ایک رباعی کا اردو ترجمہ ہے اور انکے کلام میں عشق کا بہترین تعارف بھی۔
خوشحال نے عشق کو بادشاہوں سے بھی اولاد جانا۔ تب ہی تو بیابانِ دہلی عشق کو خراج عقیدت
پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

عشق نہ تر اور نگزید بادشاہ بہتر نہی

چہی خوشحال دی پہ عالم گنہی سر بلند کر

ترجمہ:- اے عشق تو اور نگزید بادشاہ سے (میرے حق میں) بہتر ہے۔ کہ تو نے خوشحال کو
تمام عالم میں سر بلند کر دیا۔

خوشحال کی عشقیہ شاعری میں تین اقسام کے اشعار ملتے ہیں۔ پہلی قسم ان اشعار
کی ہے جن میں شاعر اپنے عشق کا بے دھڑک اور برملا اعلان کرتا ہے۔ دوسری قسم میں وہ
اشعار شامل ہیں جن میں حماسی رنگ پایا جاتا ہے۔ ان میں بازو شاہین میدانِ جنگ کے

مناظر اور جنگ میں استعمال ہونے والے تیر و تلواریں ذکر آتا ہے۔ لیکن وہ سب کچھ عشق اور محبوبہ کی سنگدلی اور تاز و ادا کے تناظر میں پیش کرتے ہیں۔ ان اشعار میں عاشق کی مردانہ وجاہت اور وہد بہکا وقار قائم رہتا ہے۔ گو کہ بعض اوقات عاشق کو محبوبہ کے سامنے اپنے عجز و انکسار کا اظہار کرنے میں بھی مزا آتا ہے۔ تیسری قسم خوشحال کے عشقیہ اشعار کی وہ ہے جو فلسفہ فکر اور حکمت کی چاشنی لئے ہوئے ہیں۔ آئیے خوشحال کی عشقیہ شاعری کے ان تینوں پہلوؤں پر نقادوں کی آراء معلوم کرتے ہیں۔

”خوشحال کے ہاں عشق بزدلوں کا کام نہیں بلکہ عشق تو ان لوگوں کے لیے ہے جو سر کی بھی پرواہ نہ کرتے ہوں:-“

چہی ز رنہی ونیسی ز رنہی بیا پر پردی

خو یو نامرد بہ وی ز رہ بہ نہی رپہ دی

یا دی زلفی بہ لاس کنہی نہ نیسی

یا دی ونیسی سردی بہ کیہ دی

ترجمہ:- جو اس (محبوب) کو جلدی پکڑ لے اور جلدی چھوڑ دے یہ ایک نامرد ہوگا۔ جس کا دل خوف سے کانپ رہا ہوگا۔ محبوب کی زلفوں پر یا تو ہاتھ نہ ڈالے یا اگر ڈالے تو پھر چاہے اس میں عاشق کا سر بھی چلا جائے تو زلف کو ہاتھ سے نہ چھوڑے۔

زہ خوشحال کمزور ہے نہ یم چہی بہ دار شم

بہ بشکارہ نارہی وہم چہی خولہ نہی راکرہ

ترجمہ:- میں خوشحال کمزور نہیں ہوں جو کسی سے ڈروں۔

میں سب کے سامنے بہانگ و اہل کہتا ہوں کہ اس نے مجھے بوسہ دیا۔

کہ نیولے زر کہ باز پر پردی لہ چنگ

زہ بہ ہم لہ لاسہ پر پردم شوخ و شنگ

ترجمہ:- اگر باز اپنے بچوں میں پکڑے ہوئے چکرو کو چھوڑ دیتا ہو۔

تو میں بھی اس شوخ اور طر حدار معشوقہ کو ہاتھ سے جانے دوں گا۔

اور مندرجہ ذیل شعر میں خوشحال اپنے دل کو شہباز اور معشوقہ کو شکاری کہتا ہے:-

زہ مہی ستا بہ زلفو بند شو تا کباب کرو

شو کہ شہباز ہم د کباب دپارہ نیسی

ترجمہ:- میرا دل تری زلفوں کے دام میں گرفتار ہوا اور تو نے اسے کباب کر ڈالا۔

بھلا شہباز کو بھی کہیں کباب بنانے کے لیے پکڑا جاتا ہے۔

(پروفیسر شاہ جہان خان۔ ”خوشحال خان خٹک۔ بابائے پشتو شاعری“)

جناب سید انوار الحق نے منتخبات خوشحال خان خٹک کے صفحہ (۴۷) پر ان کی حماسی شاعری کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:-

”خوشحال خان کے کلام میں اگرچہ ہر نوع اور ہر صنف کا کلام ہے مگر سب پر اس قدر جنگی و

حماسی رنگ چھایا ہوا ہے۔ کہ جیسے ان کی شاعری کی غرض و غایت یا منہا یہی کچھ ہو۔ حتیٰ کہ

حسن و عشق کے رنگین و رومانی جذبات میں بھی جو کنائے اشارے اور تشبیہیں یا

استعارے استعمال کئے ہیں وہ بھی اپنے اسی انوکھے اور نرالے انداز میں، باندھے ہیں۔
جن میں باز، شاہین، شیر، چیتے، تلواریں، نیزے، مخنجر، شکار، میدان جنگ، خون ریزی اور سر بازی
کے سوا عام مثالیں کم ہیں۔ مثلاً معشوق کی آنکھوں، چکوں، بھوؤں، خال اور عارض و کاکل کو
اس طرح بیان کیا ہے:

لکھ پت سوارہ د جنگ، نیزی پہ غارہ
دا اوپردہ بانہ پری پوری ستر گھی ستا
ترجمہ:- جیسے جنگجو مسلح سوار نیزے لئے گھات میں بیٹھے ہوں
ایسی ہی تیری آنکھیں اور ان کی یہ لمبی لمبی پلکیں ہیں۔

توری ستر گھی تھی تور باز بانہ تھی نوکھی
چھی زما خاطر تھی یورو پہ نوکارو
ترجمہ:- اس کی کالی آنکھیں کالے باز ہیں اور پلکیں انکے نیچے ہیں۔
جنہوں نے میرے دل کو کھر وچ کھر وچ کے قسم کر ڈالا۔

ستا د مخ سپا بیان ہمہ توری پری باسی
ولہی دوہ ستر گھی دی لا دی جنگیالی
ترجمہ:- یوں تو تیرے چہرے کے سارے ہی سپاہی تیغ زن واقع ہوئے ہیں۔
مگر تیری یہ دو آنکھیں تو بلا کی لڑاکا ہیں۔

تورے تورے زلفی ' کبود خال پگنہ کوترہ

راشہ کہ نہ گوری ' پری بندی یو خہ شہباز دے

ترجمہ:- کالی کالی زلفوں (کے دام) میں نیلا خال جیسے کبوتر

ایکنا اس کبوتر کے پیچھے ایک کیسا شہباز آ کے پھنسا ہے۔

معشوقہ کے تکبر اور تمکنت کے ساتھ ساتھ اپنی شان و شوکت بھی جتلاتا چاہتا ہے۔ کس قدر اونچا اور اچھوتا خیال ہے:-

مرگ لره نہی وارہ ددہلی لشکرے راغلی

تہ لاد خوشحال پہ مرگ خان روغ نہ گنہ ننگ کری

ترجمہ:- خوشحال کے قتل کرنے کو تو دہلی سے ساری فوج آئی ہوئی ہے۔ اور ایک تم ہو کہ ابھی تک تمہیں اس کے قتل کرنے میں عار ہے۔

(ڈاکٹر سید انوار الحق۔ ”منتخبات خوشحال خان خٹک“)

خوشحال کے فلسفہ و فکر اور حکمت کی چاشنی لیے ہوئے عشقیہ اشعار کو پروفیسر شاہ جہان خان نے یوں قلمبند کیا ہے:-

”خوشحال خان تو عشق ہی کو حیات جاوداں سمجھتا ہے:-

جی زہ ژوندی لری د عشق پہ مینہ

ہفہ کہ و مہری گنہ نہ مرینہ

فرہاد کہ مرے مجنون کہ مرے

نوم بد نہی ہر کلمہ پہ جہان وینہ

ترجمہ:- جس کا دل عشق کی چاہت میں زندہ ہو۔ وہ مر کر بھی نہیں مرے۔ فرہاد اور مجنون
مگر چہ اس دنیا سے کوچ کر گئے ہیں لیکن دونوں کے نام اس دنیا میں باقی رہیں گے۔

چہی پہ عشق سرہ ژوندی وی ہفہ نہ مری

چہی بی عشقہ ژوندی گر خٹی مرہ ہفہ

ترجمہ:- جو لوگ عشق میں زندہ ہیں وہ مر نہیں سکتے۔ مردہ تو وہی ہیں جو بغیر عشق کے زندہ
ہیں۔

چہی خٹہ درد لری د عشق تری بہ زار سپم

کہ مومن دے کہ کافر دے کہ یہود دے

ترجمہ:- میں اس شخص پر قربان ہوتا رہوں گا۔ جو عشق کا کچھ نہ کچھ درد رکھتا ہو۔ خواہ وہ
مومن ہے یا کافر ہے یا یہود ہے۔

پہ بل ٹھانیے مہی پسرزو نہ نہی د یار غمہ

تہ زما د زرہ د مات گودی ریحان نہی

ترجمہ:- اے غم یار میں نہیں چاہتا کہ تو کسی اور جگہ رہے۔ تو تو میرے دل کے سفال شکستہ
کا ریحان ہے۔ (اسی میں رہ)

د خانی۔ د توری کار نشته په عشق کښې
معشوقې وټه مرنۍ اوسه خوشحال
ترجمہ:- عشق میں خان کی تلواری کا کوئی کام نہیں۔
اے خوشحال یہاں تو معشوق کا غلام بن کر رہ۔

(پروفیسر شاہ جہان خان ”خوشحال خان خٹک۔ بابائے پشتو شاعری“)
عشق اور عشاق کو ایک ہی شعر میں سموتے ہوئے خوشحال نے فارسی میں فرمایا ہے:-

در درون سینہ راز عاشقان

عشق اندر کوچہ ہا اظہار کرد

خوشحال نے ایک موقع پر کہا تھا کہ زندگی میں انکے تین مشاغل رہے ہیں۔ ایک
تو شکار جس کی خاطر بچپن میں اگر ایک گھنٹہ کتب میں گزارتے تو دس گھنٹے شکار میں
گزارتے۔ اور اس پر بھی ان کو یہ کہنے میں عار نہ تھا کہ اگر وہ شکار میں کم اور تعلیم پر زیادہ
توجہ دیتے تو دنیا بھر کے علوم حاصل کر کے دکھاتے۔ خوشحال کے لئے دوسری محبوب چیز
کتاب کا مطالعہ ہے۔ دنیا نے دیکھا کہ اسی خوشحال نے اپنے وقت کی عربی اور فارسی
کتابیں چاٹ ڈالیں۔ اور نہ صرف یہ کہ ایک عالم کا درجہ حاصل کیا بلکہ کتابیں تصنیف بھی
کیں اور ترجمہ بھی کیا۔ تیسری چیز جس میں خوشحال کو کمال حاصل ہوا وہ دلبروں کی دلبری
اور حسن و عشق کے معاملات پر پوری گرفت ہے۔ اپنے ان تینوں مشاغل کا ذکر خوشحال نے
یوں کیا ہے:-

یو د بنکار بل د کتاب بل د دلبرو

پہ جهان گنہی نورې نه شوې دا درې مینې

ترجمہ:- ایک فنکار دوسرے کتاب اور تیسرے دلبروں سے لگن دنیا میں ان تینوں محبتوں کے سوا اور کوئی محبت نہیں۔

اور خوشحال بابا نے جو کہا اسے سچ کر دکھایا۔ جوانی میں بڑھاپے میں اور موت کے وقت تک انکی زبان پر حسن و عشق کی باتیں موجود ہیں۔ بڑھاپے میں حسن پرستی جاری رہی:-

کہ خوشحال پہ عمر لار تر اوسا تیر شو

لا پہ ذرۂ گنہی نې د گنیلو اشنانی شته

ترجمہ:- اگرچہ خوشحال کی عمر ستر سال سے تجاوز کر گئی ہے۔ مگر اسکا دل ابھی تک حسینوں سے آشنائی چاہتا ہے۔

اور دنیا سے رخصتی کے وقت صرف اور صرف حسینوں کا ارمان دل میں لئے ہوئے ہیں:-

ذرۂ مینہ نې پہ بنکلو ماته نه کړه

خوار خوشحال به له دنیا نه دا ارمان وړی

ترجمہ:- اپنی زندگی میں حسینوں سے محبت کا ارمان پورا نہ کر سکا۔ بچا رہ خوشحال دنیا سے یہی ارمان لے کر رخصت ہوگا۔

خوشحال کی حسن کاری اور عشق کے دالہانہ اظہار نے انگریز مستشرقین کو بہت متاثر کیا ہے۔ سروالاف کیرو نے خوشحال کی چھوٹی بھرتی ایک غزل اپنی کتاب ”دی پوینٹس“

آف خوشحال خان خٹک“ کے لیے منتخب کر کے اس کا انگریزی میں بڑا اول پذیر ترجمہ کیا ہے۔ اور اسے Love in a Garden کے عنوان تلے اپنی تاریخی کتاب میں جگہ دی ہے۔ آپ محسوس کریں گے کہ ان چند اشعار میں سے ہر ایک شعر میں حسن اور عشق دونوں کی واردات موجود ہے۔ یہاں اس غزل کے پہلے تین اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ خوشحال کی شاعری میں حسن و عشق کا موضوع بھی اختتام کو پہنچتا ہے:-

ترجمہ:-

دوارہ شونہی کرہ پہ بیارتہ	اے محبوب اپنے دونوں ہونٹ ایک دوسرے سے جدا کر
درِ ریزی و گہرہ خیل یارتہ	اور اپنے یار کے سامنے درِ ریزی کر
زہ چہ ستا و مخ تہ گورم	میں جب تیرے خوبصورت چہرے کو دیکھتا ہوں
زہ مہ نہ کیہی گلزار تہ	تو میرا ہی گلشن میں جانے کو نہیں چاہتا
گل لہ شرمہ خولہی ہر پدی	پھول شرم کے مارے پیسے پیسے ہو جاتے ہیں
چہی نظر کا ستار خسارتہ	جب ان کی نظر تیرے (گلابی) رخسار پر پڑتی ہے

"When her petalled lips are parting whitest pearls do lose their luster. When her glance to me is darting, Fades the Fairest flower cluster, Roses shamed forget to blossom Brighter radiance to discover, In the budding of a bosom"

Sir Olaf Caroe

غالب کی شاعری میں حسن و عشق

جیسا کہ گذر چکا شاعری میں حسن و عشق ایک ہی ذہنی کیفیت کے بظاہر دو مختلف ظہور ہیں۔ اور ان دونوں میں شاعر کی شخصیت جھلکتی ہے۔ دیکھا جائے تو کسی شاعر کو اس کلیئے سے کوئی استثناء حاصل نہیں ہے کیونکہ:-

”جیسے ہم خود ہیں ویسے ہی ہمارا عشق ہے لیکن ذرا سا غور کیجئے تو حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ہمارا حسن کا تصور بھی ہماری اپنی شخصیت سے محصور ہے۔ حسن کی کوئی ادا کو آپ خاطر میں لاتے ہیں۔ اور کس کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ خود آپ کی افتاد طبع کا کرشمہ ہے۔ انسان کی شخصیت کے الگ الگ ٹکڑے نہیں کئے جاسکتے۔ ہمارے عمل اور خیال کی ہر سرگرمی ہماری خود فروشی و خود داری ہماری محبت و نفرت ایک ہی ناقابل تقسیم شخصیت کے مختلف مظاہر ہیں۔ غالب کا تصور حسن و عشق کیا تھا؟ یہ دراصل غالب کی شخصیت کا مسئلہ ہے“

(پروفیسر حمید احمد خاں غالب کی شاعری میں حسن و عشق)

غالب کے واقعات زندگی پڑھ ڈالئے۔ آپکو ہر دم ان کی شخصیت کی انفرادیت اور اسکے

نتیجے میں پیدا ہونے والی عیش پسندی اور اچھی چیزوں سے محبت کی موجودگی کا احساس ہوگا۔ اس محبت کے ڈانڈے ان کے بچپن اور جوانی کے عیش و عشرت کی فضا سے جاملتے ہیں۔ غالب کا نظریہ محبت کیا تھا؟

کہتے ہیں کہ غالب کے کلام میں حسن پر کم اور عشق سے متعلق اشعار زیادہ ہیں۔ اور یہ بھی کہ انہوں نے حسن کی تفصیلی تصویر کشی کہیں نہیں کی۔ پروفیسر حمید احمد خاں کے مطابق غالب کی حسن کاری میں کوئی واضح انسانی صورت سامنے نہیں آئی حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی صورت گری غالب کی شاعری کا موضوع ہی نہیں ہے۔

اب ہم غالب کی شاعری میں حسن کی تلاش میں اوپر دیئے ہوئے حالات کی روشنی میں آگے بڑھتے ہیں۔ تو دو نئے حقائق سامنے آتے ہیں۔ کہ غالب کو حسن کی تصویر سے نہیں اس کی تاثیر سے سروکار ہے اور یہ کہ حسن کی مصوری اجاگر کرنے کے لیے غالب اشارات سے کام لیتے ہیں۔ اور بہت کچھ پڑھنے والے کے تخیل پر چھوڑ دیتے ہیں۔

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں

زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

ہم ان حالات میں بھی غالب کے ہمراہ چلنے میں خوش ہیں کہ اگر اس شوخ کا منہ دیکھ بھی لیتے تو ایک عارضی مسرت کے سوا اور کچھ بھی نہ ہوتا۔ مگر غالب کی ہمراہی کے دوران ہمارے دلوں میں جو خلش پیدا ہوتی جاتی ہے اس کا مزاحیہ کچھ اور ہے۔

”نسوانی حسن کے تین عنصر ایسے ہیں جنہیں غالب کے تخیل میں مستقل

جگہ ملی ہے۔ ایک خاص کیفیت جو اس زمانے میں اور اس کے بعد بھی
توجہ کو بدستور دعوت نظر دیتی رہی۔ قامت یار کی رعنائی ہے:

اگر وہ سر و قد گرم خرام ناز آ جاوے
کف ہر خاک گلشن شکل قمری تلاء فرسا ہو

معلوم ہوتا ہے عورت کے بدن میں لپک اور موسیقیت یعنی پورے پیکر کی شوخی و رعنائی پر
غالب کی نظر بار بار اٹھتی ہے۔

ہے صاعقہ و شعلہ و سیلاب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آنا نہیں گوائے

اسد انصاف قیامت قامتوں کا وقت آرائش
لباس نظم میں بالیدن مضمون عالی ہے

جوش صفائے تن کے بعد غالب ہمیں جوش صفائے زلف کی طرف
رجوع کرتا ہے۔۔۔ غالب کے لیے جو تین عناصر حسن بنیادی
حیثیت رکھتے ہیں ان میں سے تیسرا اور سب سے بڑا جز ”نگاہ“ ہے
۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کے نزدیک محبوب کی چشم و نگاہ کی
لذتیں حسن کے سب سے بڑے انعامات میں داخل ہیں۔^۱

(پروفیسر حمید احمد خاں ”غالب کی شاعری میں حسن و عشق“)

تو معلوم ہوا کہ غالب کے نظریہ حسن انسان میں تین عوامل کا دخل تھا۔ قد و قامت یار زلف اور چشم و نگاہ اسلئے اب ہم کلام غالب کا جائزہ لیتے ہیں۔ تاکہ ان موضوعات سے متعلق غالب کے شاعرانہ خیالات جان سکیں۔ انکے اردو و ہون ان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان تینوں موضوعات میں سے قد و قامت یار پر چند گئے چنے اشعار ملتے ہیں۔ سب سے زیادہ اشعار چشم و نگاہ اور زلف پر کہے گئے ہیں۔ پھر ہمیں یہ حقیقت بھی یاد رکھنی ہے کہ اول تو مرزا کے حسن پر کہے گئے اشعار عشق پر کہے گئے اشعار سے کم ہیں دوسری بات یہ ہے کہ اردو کلام کے مقابلے میں ان کے فارسی کلام میں عشقیہ اشعار و افتاد میں موجود ہیں۔

قد و قامت یار پر غالب کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:-

تا در آب افتادہ عکس قد دل جویش
چشمہ بچو آئینہ فارغ از روانی ہاست

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم
میں معتقد فتنہ محشر نہ ہوا تھا

ترے سر و قامت سے اک قد آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قد و کش سے جو گلزار میں آوے

غالب کے نظریہ محبت کے ضمن میں انکی نفسیات محبت پر بھی ایک نظر ڈالتے جاتے ہیں۔
غالب کے کئی اشعار ایسے ہیں۔ جن میں شاعر نے اپنی قلبی کیفیت تو خاص طور پر نمایاں
نہیں کی لیکن نفسیات محبت کے بعض نئے یا اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ایک شعر نہایت
بلغ ہے:

بجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بد خوا ہوگا
نبض خس سے تپش شعلہ سوزاں سمجھا

غالب نے حسن انساں کے بارے میں زلف کو جو اہمیت دی ہے وہ انتہائی خاصی ہے۔ اردو
دیوان میں ہر دو تین غزلوں کے بعد زلف کا بیان ضرور ملتا ہے۔ سیاہ لمبے چمکدار بال آخر
تک مرزا کی کمزوری رہے۔ شاید ان کا یہ شعر کچھ صورت حال بتا پائے۔

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوں
زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے

زلف کیرہ گیر نے غالب کو کس طور اُلجھائے رکھا۔ ذیل کے چند اشعار سے ظاہر ہے:-

خانہ داؤد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتار دقا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

قید میں تھی تیرے وحشی کو وہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنج گرا جباری زنجیر بھی تھا

وہ حلقہ ہائے زلف کہیں میں ہیں اے خدا
رکھ لہجہ میرے دعوئے وارنگی کی شرم

حلقے ہیں چشم ہائے کشودہ بسوئے دل
ہر تار زلف کو نگہ سرمہ سا کہوں

کئے تو شب کہیں 'کائے تو سانپ کھلا دے
کوئی بتاؤ کہ وہ زلف خم پہ خم کیا ہے

پڑا رہ اے دل وابستہ بے تاب سے کیا حاصل
مگر پھر تاب زلف پر شکن کی آزمائش ہے

مگر یہ سنبل کدۂ تروضہ رضواں رقت
ہوں زلف ترا سلسلہ جہاں رقت

غالب کی الفت چشم و نگاہ بھی ایک خاصے کی چیز ہے۔ اس سے انکی حسن کاری اور چشم خواباں سے گلن کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کے لیے حسن کا سب سے بڑا انعام یہی چشم و نگاہ کی لذت ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ جیسے زلف سیاہ پر مرتے تھے ویسے ہی چشم سیاہ کے بھی دلدادہ تھے:

اہو سے ہے کیا اس نگہ تار کو بچوند
ہے حیر مقرر مگر اس کی ہے کہاں اور

چشم خواباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سرمہ تو کہوے کہ دود شعلہ آواز ہے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمہ سے تیز دھندل شگاہاں کئے ہوئے

حلقے ہیں چشم ہائے کشودہ بسوئے دل
ہر تار زلف کو نگہ سرمہ سا کہوں

عشق

رواق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے مگر برق خرمن میں نہیں
غالب نے عشقیہ شاعری میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ ان کے لئے عشق زندگی تھی اور
زندگی عشق۔

عشق نے غالب کی طبیعت میں ایک خاص مقام یوں بھی حاصل کیا۔ کہ انہوں نے بذات
خود عشق کی چاشنی چکھی تھی۔ تیرہ برس کی عمر میں انکی شادی ہوئی اور بیس برس کی عمر میں
شادی شدہ زندگی کی نا آسودگی نے انہیں گھر سے باہر عشق کرنے کی راہ دکھائی مگر محبوبہ کی
بے وقت موت کی وجہ سے غالب کے پہلے اور آخری عشق کا باب بند ہوا۔ مطلب یہ کہ
چونکہ غالب نے عشق کیا تھا اسلئے انہیں عشق کے رموز سے جو واقفیت حاصل ہوئی اس نے
انکی عشقیہ شاعری پر اپنا کس ضرور ڈالا ہوگا۔

ڈاکٹر ایس ایم اکرام نے کہا ہے کہ ”محبت کے متعلق غالب کے اشعار کئی طرح کے ہیں۔
زیادہ تعداد میں ان اشعاروں کی ہے جنہیں مضمون افربنی اور خیال آرائی کی مثالیں سمجھنا
چاہیے۔ (اس پر اضافہ یہ ہے کہ اس قسم کے اشعار مرزا کی جوانی کی تخلیق ہیں۔) اور بچنی
مشتق کی مثالیں ہیں۔ ان میں خیال بندی اور مبالغہ یا شوخی سے نئے مضامین پیدا کئے گئے

ہیں“

پھر بے خودی میں بھول گیا راہ کوئے یار
جاتا وگر نہ ایک دن اپنی خبر کو میں
شب کو کسی کے خواب میں آیا ہے وہ کہیں
دکھتے ہیں آج اس بت نازک بدن کے پاؤں
کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

غالب کی شاعری کے ابتدائی دور میں اس قسم کے اشعار کی بہتات تھی کہ یہ انکی خیال
آخرینی کے نمونے ہیں۔ اسکے بعد غالب کے عشقیہ کلام میں گھٹنا اور شوخ اشعار بھی ملتے
ہیں لیکن ان اشعار میں دلی جذبات کا بیان نہیں بلکہ بقول ڈاکٹر اکرام ”خیالی تصویر بنا کر
اسی سے ناظرین کی ضیافت طبع کا سامان کیا جاتا ہے“ ان میں رشک بھی موجود ہے۔

ابھرا ہوا نقاب میں ان کے ہے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

مگر نکسوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے نکسوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

غالب کی عشقیہ شاعری سے تین مثالیں دی جاتی ہیں۔ ان سے ان کی عشقیہ شاعری کے

خدا و خال نمایاں ہوئیں گے۔ غالب نے نو جوانی ہی میں اپنے عشق کو اپنی نگاہوں کے سامنے اپنے معشوق کے پہلو میں دفن ہوتے دیکھا تو نو زہد بات میں سر تا پا احتجاج بنے ہوئے اپنی محبوب سے یوں گویا ہوئے۔

شرم رسوائی سے جا چھپنا نقاب خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے
گر مصیبت تھی تو غربت میں اٹھا لیتے اسد
میری دہلی میں ہی ہونی تھی یہ خواری ہائے ہائے

بعد میں تیس تیس سال کی عمر میں جب غالب کو سفر کلکتہ درپیش ہوا۔ تو کلکتہ جاتے ہوئے انہیں بنارس کا شہر دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا:

”بنارس میں نسوانی حسن و جمال کے نظاروں نے اسے چٹاب
کروایا۔ کوچہ بازار و دروہام‘ کنار دریا‘ جدھر نظر اٹھتی شاعر کی آنکھ
کھلی کی کھلی رہ جاتی۔ مثنوی ”چراغ دیر“ اسی زمانے کی یادگار ہے۔
مسلل قلم اور پھر عورت کے حسن کا پُر جوش بیان‘ جزئیات حسن کی
مرقع کاری کی کوئی تقریب اگر ہو سکتی تھی تو یہ تھی۔“

(پروفیسر حمید احمد خاں ”غالب کی شاعری میں حسن و عشق“)

بنارس کی حسین عورتوں کو دیکھ کر غالب نے اثرات قبول کئے وہ بعد میں ان اشعار کی صورت میں سامنے آئے:

میانہا نازک و دلہا توانا

زنا دانی بکار خویش دانا

ادائے یک گلستاں جلوہ سرشار

خرامے صد قیامت فتنہ در بار

قیامت قامتیں مڑگاں درازاں

ز مڑگاں بر صف دل نیزہ بازاں

ادھر غالب کے دل پر کلکتے کے دوران قیام دوران بنگال کا امنٹ نقش بھی موجود تھا۔ جس نے انہیں یہ کہنے پر آمادہ کر دیا:

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں

اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

اگر غالب کی عشقیہ شاعری کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو کھلے گا کہ انہوں نے جوانی میں جو کچھ کہا اسکے عوامل ان عوامل سے مختلف تھے جن کے تحت انہوں نے اپنے دور بچپن میں لکھا۔

ایک اور ضروری بات جو غالب کی عشقیہ شاعری کے ضمن میں یاد رکھنے کی ہے وہ یہ کہ بعض نقادوں نے اس شاعری میں سے کچھ کو دنیا کی بہترین عشقیہ شاعری کے مقابل رکھنے کا کہا ہے لیکن انہی نے غالب کی عشقیہ شاعری پر یوجہ انگلیاں بھی اٹھائی ہیں۔ وہ کہتے ہیں:-

”بہر کیف غالب کے یہاں عشق کے نہ جانے کتنے مختلف جذبات

نظم ہوئے ہیں۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ ان میں سے کچھ کو دنیا کی
بہترین عشقیہ شاعری کے مقابلے میں رکھا جاسکتا ہے۔ اس کے
باوصف غالب کی عشقیہ شاعری کے کچھ پہلو ایسے بھی ہیں جو آج کے
بدلے سماج اور مذاق میں ہمیں مضحکہ خیز محسوس ہوں گے۔

گلیوں میں میری لاش کو کھینچے پھر وہ کہ میں
جاں داد ہوا ہوں سر رہگوار تھا
اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعد قتل
میرے بچے سے خلیق کو کیوں تیرا گھر ملے

(راجندر ناتھ شیدا "غالب کا شعور۔۔۔ ایک مطالعہ")

گو کہ مجموعی طور پر غالب کے عشقیہ اشعار میں عشق کی گونا گوں کیفیات اور وارداتوں کو برتا
گیا ہے لیکن ان کے کچھ ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن سے عشق کے متعلق مایوسی نکلتی ہے۔

عشق نے غالب نکلا کر دیا

ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

جب ہم غالب کی عشقیہ شاعری کا ان کی جوانی اور دور پختگی میں جائزہ لیتے ہیں تو بحیثیت
مجموعی وہ ایک مشاق عشقی ماہر بن کر ابھرتے ہیں۔ جن کے کلام میں جذبہ عشق بدرجہ اتم

موجود ہے اور یہ کلام ہجر و وصال کے امنٹ تاثرات سے لبریز ہے۔

چہ دید جان من از چشم پر خمار بگو

چہ رفت بر سرم از زلف پر شکن یاد آر

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب

کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

غم اگر چہ جاںکسل ہے پہنچیں کہاں کدل ہے

غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے

یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

شوق خریدہ رقم آرزوئے ہوس

ذوق قلمرو ہوس مرثوہ کنار

رہے اس شوخ سے آزر وہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف ' تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وقا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

واں وہ غرور عز و تازیان یہ حجاب پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

خوشحال وغالب کے ہاں طنز و مزاح اور شوخی و ظرافت

ان شعراء و ادباء کے سوا جنہوں نے غم و حزن کو اپنے لوہے طاری کئے رکھا ادب کے بیشتر لکھنے والوں نے کسی نہ کسی درجے پر طنز و مزاح اور شوخی و ظرافت کو اپنی تخلیقات میں جگہ دی ہے۔ خوشحال و غالب بھی اس دوسری قسم کے ادیبوں میں شامل ہیں۔ طنز و مزاح کے یہ عناصر جہاں خوشحال کی شاعری میں جا بجا اپنی برکتوں دکھاتے ہیں وہاں غالب کی نظم و نثر دونوں میں طنز و مزاح اور شوخی و ظرافت کے وافر اور بلیغ نمونے ملتے ہیں۔

”انگریزی ادب کا سب سے بڑا مزاح نگار ہیکسٹر ہوگزارا ہے جس کے ذراے مزاح و ظرافت کی بنیادوں پر استوار ہیں۔ ”مکمل حیوان طریف کیا ہوتا ہے“ اس کا اندازہ لگانے کے لیے ہیکسٹر سے شروع کیجئے۔ ہیکسٹر کی سب سے عظیم تصنیف جو تمام یورپ کی بھی عظیم ترین تصنیف ہے ”کنگ لیر“ ہے۔ اس تصنیف میں الیہ نگاری اپنے کمال پر پہنچی ہے مگر لیر کا الیہ کچھ نہیں رہ جاتا اگر

اس میں سے اس کے فول کے مزاج کو نکال لیجئے کلاسیکی نقاد
 آٹھارویں صدی تک فیکسچر کو طرہ یہ نگاری مانتے رہے۔ اور اس کی
 ایہ نگاری سے انکار کرتے رہے۔۔۔۔۔ فیکسچر نشاۃ الثانیہ کی روح
 تھا جو بنیادی طور پر ظریف تھی مگر جس کی ظرافت کے دائرے میں ہر
 قسم کے تاثرات آ جاتے تھے۔ لیر کی تکالیف کے ساتھ آسمان و
 زمین متزلزل ہیں مگر اس حد سے زیادہ تاریک عالم میں فول ہر جگہ اور
 ہر وقت اپنی مزاج کی پھلجھڑیاں بھی چھوڑ رہا ہے۔“

(ڈاکٹر احسن فاروقی - ”حیوان ظریف“)

ڈاکٹر عبادت بریلوی کے مطابق اردو ادب میں غالب کی طرح سودا، انشا اور اکبر کی
 شخصیتوں کی بنیاد بھی شوخی و کھٹکتی پر تھی۔ مگر ان کی شوخی کی تہہ میں کسی سے الجھنے کسی سے
 دست و گریباں ہونے اور کسی کی لٹی کرنے کا ہاتھ ضرور کام کرتا نظر آتا ہے۔ سودا چلتے چلتے
 لوگوں کو دھکا دیتے ہیں اور ان کا منہ چراتے ہیں پھبتیاں کہتے ہیں کہ وہ ان باتوں کے بغیر
 آگے بڑھ ہی نہیں سکتے۔ وہ ہنستے ضرور ہیں لیکن ان کی ہنسی زہر خند بن جاتی ہے۔ کم و بیش
 یہی حال انشاء کا ہے گو کہ وہ زیادہ کھٹکتے مزاج ہیں مگر وہ بھی افراد کو ہدف بناتے ہیں۔ اکبر
 ان دونوں سے آگے ہیں۔ ان کی شوخی میں زمانے کا ردنا ہے۔ ان کے ہنسنے کی بنیاد یہ ہے
 کہ وہ زمانے کو آگے بڑھنے سے روک دینا چاہتے ہیں۔

پشتو ادب میں خوشحال سے پہلے کسی قابل ذکر طنز و مزاح نگار کا پتہ نہیں چلتا۔ خوشحال جدید

پشتو ادب کے بانی تھے۔ ان کے ہاں جا بجا طنز کے زیادہ اور مزاح کے کم نمونے دستیاب ہوتے ہیں۔ آگے اس کی تفصیل آتی ہے۔

مناسب لگتا ہے کہ اس مقام پر طنز و مزاح کی تعریف پر روشنی ڈال لی جائے جس کے بعد خوشحال و غالب کے ہاں طنز و مزاح اور شوخی و طراوت کا مطالعہ کیا جائے گا۔

”طنز جسے انگریزی زبان میں (Satire) کہتے ہیں وہ تحریر ہے جس میں طنز نگار مذاق کے پردہ میں ایک فرد، گروہ، قوم، نظریے یا اورے پر بڑی تندگی اور بے رحمی کے انداز میں تنقید کرتا ہے۔ اور اس چیز کے مختلف پہلو اجاگر کرتا ہے۔ جو اس کی طنز کا نشانہ بنتا ہے۔

طنز کے بہت سے درجے ہیں۔ طنز کبھی کسی انسان کی کم مائیگیوں اور کمزوریوں کی غمی اڑاتا ہے کبھی ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں وہ انسان و سماج کی مستقل حماقتوں اور جاہلگیر ناہمواریوں کو اجاگر کرتا ہے اور انسان کو انسانیت کے نزدیک تر لانے میں مدد ثابت ہوتا ہے۔ بعض مذاہن کے نزدیک طنز اپنی افادیت کی وجہ سے مزاح پر فوقیت رکھتا ہے۔ لیکن اپنے اپنے دائرہ کار میں دونوں انسانیت کی خدمت کرتے ہیں۔۔۔۔۔ اگر طنز نگار ایک ماہر سرجن کی طرح علاج کی خاطر جسم کو چیرتا ہے تو مزاح نگار ایک ماہر فزیشن کی طرح رواجی انداز میں بیمار جسم کا علاج کرتا ہے۔“

(حکیم اللہ جان لکچر شعبہ پشتو پشاور یونیورسٹی)

عبدالوحید لکچر شعبہ پشتو پشاور یونیورسٹی

”عظیم خوشحال۔ عظیم طنز نگار“

آئیے اب خوشحال و غالب کے ہاں طنز و مزاح اور شوخی و طراقت کا مطالعہ کرتے ہیں۔ پہلے خوشحال کے کلام میں طنز و مزاح کے رنگ دیکھیے۔

خوشحال کے ہاں طنز و مزاح اور شوخی و طراقت

کہتے ہیں کہ انسان پر اس تہذیب کا اثر رہتا ہے جس میں وہ بس رہا ہو۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو ہم خوشحال کو تہذیبی لحاظ سے مغلیہ دور کے اس سرے پر کھڑا دیکھتے ہیں جہاں سے اسکا انحطاط شروع ہوا۔ تہذیب کی پختگی اپنے افراد میں خود اعتمادی پیدا کرتی ہے اور انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سکھاتی ہے۔ نتیجتاً حالات کی خرابی یا غم ایسے افراد میں مایوسی نہیں پھیلا پاتی اور وہ غم کو اپنی خود اعتمادی سے فتح کرنے اور اپنی زندگی میں مسرت کے مواقع پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

گوکہ خوشحال کا تعلق مغلیہ دور کی ترقی یافتہ تہذیب کے ساتھ لگ بھگ تیس سال تک رہا۔ جب وہ اپنے قہیلے کے سردار کی حیثیت سے مغلیہ دربار سے منسلک رہے۔ مگر اسکے بعد تقریباً چھبیس سال تک وہ مغلیہ تہذیب سے کٹ کر اپنے پشتون معاشرے میں رہے۔ بڑے نظر آتے ہیں۔ ان سب پر مستزاد وہ پشتونوں کو متحد کرنے اور مغلوں کے خلاف کم و بیش پانچ جنگیں لڑنے میں مصروف رہے۔ ایسے میں انہوں نے شاعری کے لیے بھی

وقت نکالا ہوگا۔ گو کہ وہ مغلوں کی قید کے دوران چند ایک کتابیں تحریر کر چکے تھے۔ مشقِ سخن بھی جاری رکھے رہے۔

”خوشحال خان کی بات چپ میں متانت تھی۔ لیکن ظرافت سے بھی کام لیتے تھے۔۔۔ خان صاف گو حق گو اور حق پرست انسانوں کے دوست تھے۔ یعنی صاف بات کرتے تھے اور صاف گو انسانوں کو پسند کرتے تھے۔۔۔۔۔ بیری میں بھی جوان دل رکھتے تھے اور ظریفانہ باتوں اور اشعار کے ذریعے اپنے دل کو خوش رکھتے تھے“

(میاں سید رسول رسا“ ”مقدمہ ارمغان خوشحال“ ص ۱۱۶ء ۱۱۷ء)

خوشحال کے ہاں طنز و مزاح اور شوخی و ظرافت کی نوعیت کیا تھی۔ آئیے دیکھیں:-

”خوشحال بابا کے کلام میں طنز زیادہ اور مزاح کا عنصر کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ انکی وجہ یہ ہے کہ بابا نے تمام عمر جنگوں اور مبارزوں میں بتا دی تھی۔ اور ایک بہادر اور مبارز انسان کا مزاح کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ البتہ خوشحال بابا نے مزاح کی ایک قسم ”تسخیر“ سے کام لیا ہے۔ یہ مزاح کی وہ قسم ہے جس میں دُزنی چیزوں کو ہلکا اور ہلکی چیزوں کو دُزنی کر کے پیش کیا جاتا ہے“

(علیم اللہ جان لکچر شعبہ پشتو پشاور یونیورسٹی)

عبدالوحید لکچر شعبہ پشتو پشاور یونیورسٹی

”علیم خوشحال۔ عظیم طنز نگار“

خوشحال چونکہ ایک اچھے تنقید نگار بھی تھے اسلئے انہوں نے اپنے سے پہلے گزرے ہوئے ادباء اور شعراء پر منکوم تنقید کرتے ہوئے مزاح کا استعمال بھی کیا۔ مرزا خان انصاری اور ارزانی خویشکی خوشحال سے پہلے پشتو کے معروف شعراء گزرے ہیں۔ انکے متعلق ذیل کے قطع میں خوشحال نے مزاح کا استعمال اس طور کیا ہے کہ مندرجہ بالا اقتباس کے مطابق اپنے آپ کو زنی لیکن ان شعراء کو ہلکا ظاہر کیا ہے۔

قتلمی می ورتہ سازی کرې د قندو
د اوریشو پہ دوديو چې چا شخوند کرو
د مرزا دیوان می او مانډه په گوډی
مسخره می ارزانی خویشکی زمند کرو

ترجمہ:- جو شعراء نان جوئن پر گذارا کرنے والے تھے انکے مقابلے میں میں نے اپنے کلام کے ذریعے شیریں تھکے تیار کئے۔ (اور اس طرح) مرزا کے دیوان کو واپس تھیلے میں بند کر دیا اور ارزانی خویشکی پر لوگوں کو ہنسایا۔

خوشحال بابا کا تمسخر لئے ہوئے ایک اور شعر دیکھیے:-

ترجمہ:- اس شاعر کا منہ کالا ہو جو طمع کی بنا پر ہر در اور ہر در بار میں حاضر رہتا ہے۔
خوشحال کے ہاں طنز کے موضوع پر اس سے بہتر الفاظ نہیں مل سکتے:-

”پھر یہی شاعر (خوشحال) جب طنز پر اترتا ہے تو نہ بادشاہوں کو بخشتا
ہے نہ خود اپنی قوم کو نہ ملاؤں کو معاف کرتا ہے نہ صوفیوں کو نہ اہل

دولت کو چھوڑتا ہے نہ اہل سیاست کو وہ ہر ایک پر نشتر چلاتا ہے اور جس کی دیکھتی رگ پکڑتا ہے اس انداز سے پکڑتا ہے کہ اگر وہ خاموش نہ رہ سکے تو فریاد میں بھی لطف اندوزی کی جھلک نظر آ جائے۔

(محمد جعفر شاہ پھلواڑی رفیق ادارہ ثقافت اسلامی لاہور "پیش لفظ خوشحال و اقبال")

خوشحال کے کلام میں زاہد کے ساتھ مکالمہ کرتے ہوئے اشعار بھی ملتے ہیں۔ ان اشعار میں پنہاں طنز کو تو محسوس کیا ہی جاسکتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ خوشحال کی معاملہ فہمی اور طرز ادا کی بھی داد دینی پڑتی ہے:-

زہ خوسراپی ہم شیخہ خفہ راسرہ جنگ کری

برخی ازلی دی کاش کہ ما د خان پہ رنگ کری

ترجمہ:- اے شیخ میں تو ایک شرابی ہوں تو کیوں مجھ سے لڑتا جھگڑتا رہتا ہے۔ قدرت نے ہر ایک کو اس کا کام سونپا ہوا ہے۔ کاش کہ تو مجھے اپنے رنگ میں رنگ سکتا۔

د زاہد پہ صومعہ کنہی می زرہ تنگ شو

لہ دی پسپی بہ خدمت د می فروش کریم

ترجمہ:- میراجی زاہد کی محبت میں رہتے رہتے گھبرا گیا ہے۔ میں اس کے بعد اب کسی سے فروش کی خدمت کرونگا۔

محتسب چپی بہ احدا د وود مستانو

درندانو سرہ کنہناست بادہ خورشو

ترجمہ:- جو کتبستانوں کا دشمن تھا۔ وہ شرایین کی صحبت میں رہ کر مے خور بن گیا۔

ذکر فکر مونیخ روزہ طاعت ورلہ بویہ

شیخ ملا زاہد عابد صوفی پہ میو خدہ زدہ

ترجمہ:- ذکر 'فکر' نماز روزہ اور اطاعت ہی اگلے کام ہیں۔ شیخ 'ملا'۔ زاہد عابد اور صوفی کو شراب سے کیا واسطہ۔

کو مو شونڈو چہ درود او تسبیحات وے

راشہ او گورہ دیو دینا شو

ترجمہ:- جو لب درود و تسبیحات میں مصروف رہتے تھے۔ آؤ دیکھو کہ وہ مے و مینا کے ہو کر رہ گئے ہیں۔

لہ از لہ نہی رند رند زاہد زاہد کپرو

زہ بہ نہ کپی پیالہی اخلم نہ تسبیح کپہ

ترجمہ:- خالق نے ازل سے رند کو رند اور زاہد کو زاہد بنایا۔ اس لیے (اے شیخ) میں تو مے سے بھرے ہوئے جام پیتا ہوں اور تو تسبیح پھیر۔

خوشحال کے اس قبیل کے چند دوسرے افکار کا ترجمہ یوں ہے:-

ترجمہ:- اے شیخ تو جو خدا کی زیادہ سے زیادہ طاعت بجالا کر جنت مانگتا ہے۔

تو کیا جنت میں جانا بھی انسانی ارادے پر موقوف ہے؟

ترجمہ:- یہ کس مے خانے کی شراب ہے جس کے ایک جرہ سے صوفی مدہوش ہوا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ دوسروں پر طنز کرنے والا یا انہیں مزاح کا نشانہ بنانے والا ضرور ایک صاف گو انسان ہوگا۔ اسی صاف گوئی سے انسان میں آزار بخشی بھی پیدا ہوتی ہے۔ خوشحال کے کلام میں اسکی آزار روی کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ جو عام حالات میں ایک عام انسان کے لیے حیرت کن حد تک باغیانہ روش کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہو سکتیں۔ ان اشعار کے بین السطور طنز یا مزاح کی ہلکی سی لکیر گذرتی نظر آئے گی:-

کہ ستا کو خہ جنت سزہ خوگ سمہ راتہ کیہ دی

کو خہ بہ دی وطن کرم کہ دا عیب وی ہم دی وی

ترجمہ:- اگر کوئی تیرے کوچے کو جنت کے ساتھ پہلو پہ پہلو رکھ دے۔ تو میں تیرے کوچے کو اپنا وطن بناؤں گا۔ اگر ایسا کرنا ایک عیب ہے تو ہوا کرے۔

ددی کلی طیبیان وارہ ناترس دی

د دارو پہ طمع مہ اوسہ بیمار

ترجمہ:- اس گاؤں کے تمام طیب ناترس ہیں۔

اس لئے اے بیمار تو دوا کی امید میں نہ رہ

د تقویٰ پہ کاروبار نہ خبرداریم

ولہی خہ کرم چہ نصیب مہی گمراہی شوہ

ترجمہ:- میں تقویٰ کے کاروبار سے بخوبی واقف ہوں۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ میری قسمت میں گمراہی لکھی ہوئی ہے۔

زاہدان چہی مونخ روزہ کا جنت غواری

ما خوشحال د مزدوریہ طاعت نہ زدہ

ترجمہ:- یہ جو زاہد نماز اور روزے کے ذریعے جنت کے خواہاں ہیں۔ مجھے اس قسم کی مزدوری اور اطاعت نہیں آتی۔

چہی دی سپین بار خو کبود کرم بہ چہی چلو

اوس می نہ گنہی ہالہ بہ می گنہی

ترجمہ:- تم مجھے اب تو نہیں مانتی لیکن وہاں ٹلڈ میں مجھے مان جاؤ گی جب میں تمہارے سفید رخسار دانتوں سے کاٹ کر سرخ کر دوں گا۔

چہی لہ خیلہ کبہ نہ خوری

کہ ولی دے کلہ بنہ خوری

ترجمہ:- جو شخص بھی اپنے ہاتھ اور اپنے ہنر سے کمایا ہوا نہیں کھاتا وہ مٹال نہیں کھاتا چاہے وہ ولی ہی کیوں نہ ہو۔

رنشوران کہ کاروبار نہ کہ معذور وی

روغ سرے بہ ولی نہ کا خیل روزگار

ترجمہ:- بیمار اگر مزدوری و کار و بار نہ کرے اور معذور ہو تو جو صحت مند ہیں وہ کیوں کر اپنا روزگار نہ کریں۔

مزریتوب بویہ دتورو پہ میدان گنبی

پہ خالی میدان خو ہر گیدر مزرے وی

ترجمہ:- شیر دلی تو تلواریں کے میدان میں دکھائی جاتی ہے۔ خالی میدان میں تو گیدڑ بھی شیر ہوتا ہے۔

چپی د بنخو نہ بتر دے ہغہ خوک دے

چپی د بنخو سرہ کا مصلحتونہ

ترجمہ:- جو مرد عورتوں سے بھی بدتر ہے وہ کون ہے۔ وہ دے ہی ہے جو عورتوں کے ساتھ صلاح مشورہ کرتا ہے۔

کہ نہی مومہی اوہے ژمے گبینہ خورہ

خو پہ سودنہی خبر مہ کرہ خیل پلار

ترجمہ:- اگر تمہیں شہد ملے تو اسے گرمی سردی دونوں موسموں میں کھاؤ مگر خبردار اس کے فوائد سے اپنے والد کو آگاہ نہ کرنا۔

اسی قبیل کے چند اور اشعار کا ترجمہ ملاحظہ ہو:-

ترجمہ:- اس کے رخساروں پر دانتوں کی چھاپ ہے

یہ کسی نوآ موز عاشق کی کاٹ نظر آتی ہے۔

ترجمہ:- اپنے گھروں میں زخمی گدھے کی طرح منہ خشک ہوتا ہے

اور وہ سروں کے گھروں میں گھوڑوں کی طرح رات ب کھاتے ہیں

ترجمہ:- جس کا کردار گفتار کے موافق نہ ہو اس جھوٹے کی ڈاڑھی پر نغزین

ترجمہ:- خیل مردار کے پاس اور جھپٹنے والا شاہین شکار کے پاس ہوتا ہے۔

ترجمہ:- حجام کی اپنی حجامت بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ اور دوسروں کی حجامت کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔

ترجمہ:- فصاحت تو باغ کی بلبلوں میں ہوتی ہے۔

کوئے کو فصاحت سے کیا کام

ترجمہ:- تو جو نایاب کو آسان یا تارے دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔

ذرا یہ تو بتانا میرا کن آنکھوں سے انہیں دیکھے گا۔

ترجمہ:- بوڑھا وادھا چاہے اپنے سراور داڑھی کے بالوں کو ہزار بار رنگ لے اور اپنی جوان

دلہن کی کتنی ہی دلجوئی کرے۔ اسکی جوان دلہن اس سے نالاں ہی رہتی ہے۔ خوشحال اپنی

محبوبہ کے ساتھ آنکھیلیوں کے ذریعے بھی طنز و مزاح کے نمونے پیش کرتے ہیں۔

تہ می وز نہ د قصاص اندینہ نہ کہہ

د خیل خون پہ تور بہ ونیسم یو بل شوک

ترجمہ:- تم مجھے قتل کرو اور قصاص کی فکر بالکل مت کرو۔ میں اپنے خون کے بدلے میں کسی

اور کو پکڑ لوں گا۔

ہم دی ووزلم پخپلہ ہم بیا گورہ

بیا پہ ما باندی تہر وہی ماتم کا

ترجمہ:- ایک تو تم نے مجھے قتل کیا۔ اور پھر دیکھو کہ تم سینہ کو بلی کرتے ہوئے میرا ہی ماتم کر رہے ہو۔

خوار خوشحال پہ مرگی حال دے ٹخنکدن کا
راشہ گوردہ پہ ایمان دلیدوستا مری
ترجمہ:- بے چارہ خوشحال نزع کی حالت میں ہے۔ آؤ دیکھو ایمان سے تمہیں دیکھنے کے لیے مر رہا ہے۔

ترجمہ:- خوشحال کو اپنے پیارے ہونٹوں سے بوسے کی اجازت دے دے۔ تاکہ طوطا
مزے لے لے کر قند کھایا کرے۔

ترجمہ:- خوشحال کو قتل کرنے کے لیے گوارا کیوں کھینچتی ہو۔ اسے قتل کرنے کے لیے تو تیری
پلکوں کے ناوک ہی کافی ہیں۔

زہ خوشحال کہ تانہ غولرم مستحق یم
خولہ زکوت راکرہ د حسن لہ نصاب
ترجمہ:- اپنے حسن کے نصاب سے مجھے ایک بوسہ ازراہ زکوٰۃ دے دے۔ کیونکہ میں
خوشحال اس کا مستحق ہوں!

سپینہ خولہ ٹی و ما راکرہ وی می مور شوم
وی ٹی خوارہ و پیہ دا خو نیمرر ٹھے دے
ترجمہ:- اس نے مجھے اپنے سفید چہرے کا بوسہ لینے دیا۔ اور جب میں نے کہا کہ بس میں

سیر ہو گیا ہوں تو کہنے لگی بے وقوف بھوکے یہ تو صرف ناشتہ ہے۔

د سمند سمونہ سرہ پہ وینو دروہی

چرہ بیادہی د چا مینہ کرہ خرابہ

ترجمہ:- تم جس گھوڑے پر سوار جا رہی ہو اسکے سُم خون آلود ہیں۔

تم پھر کس کی محبت کو برباد کر کے آ رہی ہو۔

ترجمہ:- جو آپس میں زور آزمائی کرتے ہیں وہ خسارے میں رہتے ہیں۔

وہ اگر از خود بوسہ دے دے تو زور آزمائی کی حاجت ہی نہ رہے۔

ترجمہ:- اسے یاری کے ہنر کا کچھ بھی پتہ نہیں۔

اگر میں اسے پند سنا تا ہوں تو وہ روئے نکلے گی ہے۔

کلمہ ناز کلمہ کنٹھل کرے کلمہ مہر

د خوشحالہ مرورہ کہ پخلا نی

ترجمہ:- ایک بوسہ لینے پر تم خوشحال سے کس قدر ناراض ہو کہ کبھی ناز دکھاتی ہو کبھی کالیاں

دیتی ہو تو کبھی مہربان ہو جاتی ہو۔

ولہی لیچہی بریندہنی تورہ اوکلاہی

کہ د خوارو د کشتن پہ آہنگ نہ دہ

ترجمہ:- وہ کیوں اپنی بائیں ٹانگی کر کے میان سے ٹکوار نکال رہی ہے۔

کیا اسے اپنے خوار عاشقوں کے قتل ہونے کی آواز سنائی نہیں دیتی۔

پہ بار بار دے د خندا منت راباندی
 چپی لہ وریہ رابنکارہ شی راتہ خاندی
 ترجمہ:- جب تم دور سے نظریں پاتی ہو تو مجھے دیکھ کر مسکراتی ہو۔
 اس مسکراہٹ کا مجھ پر تیرا بار بار احسان ہو۔

چپی دے زہ وی چپی بہ زہ د خوشحال گورم
 راشہ اوگورہ پہ اور اینے کباب
 ترجمہ:- اگر تیرا جی کرتا ہے کہ خوشحال کا دل دیکھے
 تو آ اور آگ پر رکھا ہوا کباب دیکھ لے

ماوے زہ می ستاد مخ پہ اور ورتیوی
 دے وے پر سوردہ چپی، بنہ وریٹ شی دا کباب
 ترجمہ:- میں نے اپنی محبوبہ سے کہا ”میرا دل تیرے چہرے کی تیش سے جل رہا ہے۔
 اس نے کہا اسے یونہی چھوڑ دتا کہ یہ کباب اور بھی بھونا جائے۔

کہ د خپلو سپو نامہ وریاندی کیہ دے
 خوار خوشحال بہ پہ عالم کبشی سریلندکا
 ترجمہ:- اگر تو خوشحال پر اپنے کتوں کا نام رکھ دے
 تو اس کا سر پورے جہان میں بلند ہو جائے

ستا سپيو سره گر خم ستا کو ڇه کڻي

کوندي ماور سره گڏو ڪري پڻ حساب

ترجمہ:- میں تیرے کتوں کے ساتھ ساتھ تیرے کوچے میں پھرتا رہتا ہوں۔ اس امید پر کہ شاید مجھے بھی انکے ساتھ حساب میں شمار کر لو۔

پڻ ڙا مي غني خواست د سپيني خولي ڪرو

پڻ خندا ئي ڏي چي ڇه کا دا سرے

ترجمہ:- میں نے رو رو کر اس سے سفید چہرے کا ایک بوسہ مانگا تو جس کر کہنے لگی کہ یہ مردوا کیا کر رہا ہے۔

پڻ درست جهان به نه وي يوز ما غوندي رسوا بل

ور خم توره وکڻيلے چي منين واورم پڻ تابل

ترجمہ:- پورے جہاں میں مجھ جیسا رسوا شخص کوئی اور نہ ہوگا۔ کیونکہ جب بھی تم پر کسی کو عاشق ہونے کا سنتا ہوں تو اسکی طرف گوار بدست چل دیتا ہوں۔

ایسے ہی چند اشعار کا ترجمہ ملاحظہ ہو:-

ترجمہ:- اس نے ابھی ابھی فزے کا خنجر اپنی کمر سے لٹکایا ہے

معلوم نہیں اس سے رند کو کاٹا جائیگا یا زہد کو

ترجمہ:- میں نے کہا ”میں تمہارے اس گورے حسین چہرے کا عاشق ہوں“

اس نے کہا ”خدا نے عاشقی بھی کیا سہل کر دی ہے۔“

ترجمہ:- ازبک بھی ایسا شب خون نہیں مارتے

جس طرح تیری آنکھیں بے چاروں پر تاخت کرتی ہیں۔

شاعر ہو اور رقیب کا ذکر اسکے کلام میں نہ ملے۔ یہ تو ممکن ہی نہیں۔ رقیب رو سیاہ کا ذکر شاعر کے کلام یا ادیب کے افسانے میں ضرور ملتا ہے۔ نہ ملے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ آئے میں نمک کی کمی رہ گئی ہے۔ تو پھر خوشحال کے کلام میں رقیب کے ساتھ خاصیت کیوں نہ نظر آئے۔

پد خٹہ چل نہی خانے نیولے ستا تر خنگ دے

در قیب خبرہ مہ منہ بدرنگ دے

ترجمہ:- رقیب نے کسی حیلے سے تیرے پہلو میں جا بٹائی ہے

تم اسکی کوئی بات مت مانو کہ یہ بدرنگ (اور جھوٹا) ہے۔

در قیب گونہ چہ بدہ شوہ لیدہ دی

چہ نہ ماتہ پد تہولی کنبہی موسکیدی

ترجمہ:- جب تم اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں میری طرف دیکھ کر مسکرائی تھی تو تم نے دیکھا کہ رقیب کی حالت کتنی غیر ہو رہی تھی۔

یارہ تہ چہ لہ اغیار سرہ خندا کبریٰ

د خوشحال پد لہ مانہ درومی چارہ

ترجمہ:- اے محبوبہ جب تو اغیار کے ساتھ ہنس کر باتیں کرتی ہے۔ تو خوشحال کے

معدے میں چھری گھس جاتی ہے۔

ترجمہ:- وصال یار کے وقت رقیبوں سے امان چاہیے۔ بہار کے موسم میں پریشان کرنے والی بے شمار کھیاں پھرتی رہتی ہیں۔

ترجمہ:- اگر تو یار کی تلاش میں ہے تو جا کر رقیبوں کو ڈھونڈ

گلاب کا پھول وہیں ہوتا ہے جہاں خار ہوتے ہیں

ترجمہ:- جب میں یار کے ساتھ بیٹھتا ہوں تو رقیب ہمیشہ مجھے بری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ کیا یہ اندھے نہیں ہو سکتے۔

ترجمہ:- رقیب کی برائی سے عاشق ایسا کاٹا جاتا ہے۔ جیسے کتے اپنے دانتوں سے آدمی کو کاٹتے ہیں۔

بڑھاپے سے منسلک چند اور اشعار کا ترجمہ جن میں اپنی ذات پر طنز کے تیر برسائے ہیں:-
ترجمہ:- ستر سال سے گذر چکا ہوں۔ کج چشم کو تو ایک کے دو نظر آتے ہیں میں ایک کو سات دیکھتا ہوں۔ اگر میں اسی (۸۰) سال تک پہنچ جاؤں تو ظاہر ہے کہ ایک کے بیس دکھائی دیں گے۔

تو معلوم ہوا کہ خوشحال کے ہاں مزاح کم اور طنز کا استعمال زیادہ ہوا ہے۔ انکی شخصیت میں سموئی صاف گوئی نے بھی انکے کلام میں ایسے اشعار کو جنم دیا ہے جو طنز، ہجو اور مسخر کے زمرے میں آتے ہیں۔ طنز و مزاح اور ہجو و مسخر کے اس ملغوبے سے ہم خوشحال کی ایک نئی اور اچھوتی شخصیت کو ابھرتا ہوا دیکھ سکتے ہیں۔

غالب کے ہاں طنز و مزاح اور شوخی و ظرافت

غالب کے دور میں مغلیہ سلطنت کی شمع حیات ٹٹھانے لگی تھی۔ پھر نذر آیا یہ شمع ہمیشہ کے لئے بجھ گئی اور غالب نے ساٹھ سال کی عمر میں دلی میں انگریزی استعار کی جھلک دیکھی۔ گو کہ وہ تیس برس پہلے ہی اسکی ابتدائی حکومت کا نقشہ کلکتے میں دیکھ آئے تھے۔ ان تمام واقعات و عوامل کے پیش نظر غالب کے رد عمل اور انکی شاعری اور نثر پر ان عوامل کے اثرات کا ہونا بھی لازم ہے۔ مگر جس چیز نے غالب کے کلام اور انکے مکاتیب کو متاثر کیا وہ انکی شخصیت تھی:-

”وہ اپنے محبوب کی موت پر آنسو بہاتے ہیں مگر ان کی ساری عمر آنسو بہانے میں نہیں گذری۔ ایک شوخ اور آزاد طبیعت ان کے یہاں وہ لطیف حسن پیدا کر دیتی ہے جسے (Sense of humour) کہے ہیں۔“

(آل احمد سرود ”غالب کی عظمت“)

غالب کی شاعری چار ادوار پر مشتمل ہے۔ جو آگرہ دہلی اور راجپور پر محیط ہیں۔ جہاں تک انکی شاعری میں طنز و مزاح اور شوخی و ظرافت کا تعلق ہے تو یہ عناصر انکے چوتھے دور میں زیادہ نمایاں ہو کر تشکیل کو پہنچے۔ انکے مکاتیب بھی اسی چوتھے دور کی یادگار ہیں۔ یوں تو غالب کی اردو غزلوں اور قصیدوں کے اشعار کی تعداد پانچ ہزار کے لگ

جھک بتائی جاتی ہے۔ مگر ان سے تقریباً اٹھارہ سو اشعار کا انتخاب کر کے دیوان غالب کے مختلف ایڈیشن چھپوائے گئے۔ جہاں تک دیوان میں شوخ اشعار کا تعلق ہے تو وہ میری تحقیق کے مطابق کم و بیش ڈیڑھ سو بنتے ہیں۔ دیسے تو آپ کو غالب کے اکثر اٹھارہ میں شوخی و ظرافت کی لطیف سی لہر دوڑتی نظر آئے گی۔

دوسری بات جو غالب سے متعلق خاص ہے وہ یہ کہ انکی نثر کا بیشتر حصہ مکاتیب جنہو پر مشتمل ہے اور یہ کہ ان کے مکاتیب میں سے شوخی و ظرافت جھلک جھلک پڑتی ہے۔ یوں غالب پر صغیر کے واحد شاعر و نثار ہوئے جنہوں نے نثر و نظم دونوں میں شوخی و ظرافت کو برتا۔

”غالب کا اصل فن اس کی شوخ نگاری تھی۔ اس کی غیر معمولی رسائی ذہن تھی۔ انداز بیان کی ندرت تھی اور اس کی شاعری کی یہ خصوصیت اس کے ہر صنفِ سخن میں پائی جاتی ہے“
(نیاز فتح پوری ”دوبئی بادہ خوار“)

شیلے نے کہا تھا:-

"Our Sincerest Laughter With some pain is Fought"

جب ہم غالب کی شاعری کا جائزہ لیتے ہیں تو ان میں بیشتر شیلے کے خیالات پر پورا اترتے ہیں۔ بس اتنا ہے کہ انکے اشعار کو سمجھنے اور ان میں سے شوخی کے پہلو کو برآ کر نہ کرنے کے لیے قوتِ تخیل کا استعمال ناگزیر ہے۔

گو کہ غالب کے مکاتیب انکے آخری دور کی یادگار ہیں۔ لیکن ہم یہاں ان کا

ذکر انکی شرح شاعری سے پہلے کرنا چاہیں گے:-

”غالب نے اپنے فطوں میں ظرافت کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ظرافت میں بے فکر اپن نہیں بلکہ ظاہری خوش طبعی اور زندہ دلی کی تہہ میں بھی ان کے تجربات اور جذبات درد کام کر رہے ہیں۔ ان کی ظرافت کے سرچشمے ان کے درد و غم ہی سے پھوٹتے ہیں۔ درد اور ظرافت کا یہی اجتماع حقیقت میں کسی ادب پارے کو اعلیٰ ادب کا درجہ دیتا ہے۔ غالب کی ظرافت میں ان دونوں عناصر کا اجتماع ہے“

(ڈاکٹر سید عبداللہ ”غالب کی اردو نثر“)

جزئیات نگاری اور منظر کشی مرزا پر ختم ہے۔ میر مجروح کو لکھتے ہیں:-

”برسات کا حال نہ پوچھو خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی نگلی سعادت خان کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں عالم بیک کے کڑے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کو جو دروازہ تھا گر گیا۔ سڑکیاں گرا چاہتی ہیں صبح کے بیٹھے کا حجرہ جھک رہا ہے چھتیس چھلنی ہو گئی ہیں۔ سینہ گھڑی بھر رہے تو چھت گھٹ بھر رہے“

سفید بالوں کے نکل آنے پر پیری کا تصور یوں دلایا ہے:-

”۔۔۔۔۔ جب داڑھی مونچھے میں سفید بال آ گئے۔۔۔۔۔ اس سے

بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کید و دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسی بھی چھوڑ دی
اور ڈاڑھی بھی۔“

غالب کے مکتوبات اس قبیل کی مثالوں سے بھرے پڑے ہیں۔ اوپر کی یہ چند مثالیں دے
کر مکاتیب غالب میں شوخی و ظرافت کا باب بند کرتے ہیں۔ اور انکی شاعری میں ان
اصناف کا مطالعہ کرتے ہیں۔

سب سے پہلی بات جو غالب کے اشعار کی شوخی کے ضمن میں سامنے آتی ہے وہ
یہ کہ وہ اپنے اشعار میں منظر کشی کرنے کے بادشاہ ہیں۔ مثلاً تصور کیجئے کہ غالب پیرانہ سالی
میں اپنی عمر کے گھوڑے پر سوار ہیں۔ گھوڑا ہوا سے باتیں کر رہا ہے۔ اور گھوڑا سوار نے اپنے
آپ کو اللہ توکل چھوڑا ہوا ہے۔ یہ منظر ذہن میں رکھتے ہوئے غالب کا منظر کش شعر ملاحظہ
فرمائیں:-

رو میں ہے رخس عمر کہاں دیکھیئے تھے

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

یہ منظر کہ عاشق بھر سے تنگ آ کر خود کشی کی بجائے معشوق کے ہاتھوں قتل ہو جانے کو ترجیح
دیتے ہوئے اپنے سر پر کفن اور کمر سے کموار یعنی آلہ قتل باندھ کر سوئے معشوق چلا جا رہا
ہے اور اسکے لبوں پر یہ شعر ہے:-

آج داں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں

عذر میرے قتل کرنے میں وہ فرمائیں گے کیا؟

جسمانی ناتوانی اور دماغی بدگمانی کی وجہ سے پیدا ہونے والی پیچیدگی کے منظر میں شوخی کا پہلو ڈھونڈ لیجئے:-

اُدھر وہ بدگمانی ہے ادھر یہ ناتوانی ہے

نہ پوچھا جائے ہے اس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

غالب کو کوچہ یار سے بڑی رغبت تھی۔ اس ضمن میں ان کے متعدد اشعار موجود ہیں مگر کوچہ یار یا محبوبہ کے گھر کے پتہ کو رشک کے ساتھ مربوط کر کے غالب نے جو شعر کہا ہے اسکی بات ہی کچھ اور ہے۔ عاشق کو رشک کی بنا پر گوارہ نہیں کہ کسی سے اپنی محبوبہ کے گھر کا پتہ پوچھیں کہ یوں دوسروں کو بھی اسکی محبوبہ سے دلچسپی پیدا ہونے کا ڈر ہے۔ تو لوگوں کو غلط راہ پر ڈالنے کے لیے لوگوں سے پوچھتے ہیں کہ محبوبہ سے ملنے کے لیے میں کس طرف جاؤں:

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں

ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

کوچہ یار سے متعلق تمام ماحول یعنی محبوبہ کے گھر اسکی مجلسِ پاسبانِ دربانِ حتیٰ کہ محبوبہ کے پاس محبت نامے پہنچانے والے نامہ بر کا نقشہ غالب نے اپنے اشعار میں شوخی کی چاشنی کے ساتھ کھینچا ہے۔ چند نمائندہ اشعار ملاحظہ ہوں:-

دائِم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں

خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یا رب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

کیا تعجب ہے کہ اس کو دیکھ کر آجائے رحم
واں ملک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

موج خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستان یار سے اٹھ جائیں کیا

اُس قند خو کے در سے اب اُٹھتے نہیں اسد
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

بعد اک عمر و درج بار تو دیتا بارے
کاش رضواں ہی در یار کا در ہاں ہوتا

یار اور کوچہ یار کے ارد گرد ایک اور شخص بھی گشت کرتا رہتا ہے۔ اور وہ ہے رقیب روسیاء۔
غالب نے مختلف زاویوں سے رقیب کا جائزہ یوں لیا ہے:

ذکر۔ اس پری دش کا اور پھر بیاں اپنا
ہو گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا

تا کرے نہ غمازی ' کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں ہم نے ہم زباں اپنا

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

غیر سے دیکھیے کیا خوب نبھائی اس نے
نہ سکی ہم سے پر اس بت میں وفا ہے تو سکی

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو جی کہتے ہو پھر کہو کہ ہاں کیوں ہو

اقتدار عشق کی خانہ خرابی دیکھنا

غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

بوسہ خاص طور پر مشرقی شعراء کا ہر دلعزیز مضمون رہا ہے جسے ہر ایک نے مختلف زاویوں

سے برتا ہے۔ مگر غالب نے اس مضمون پر جتنے اشعار کہے ہیں وہ تقریباً سب کے سب

طرز یہ ہیں اور ساتھ میں شوخی و ظرافت کی چاشنی بھی موجود ہے۔ ملاحظہ کریں:-

غچہ نو خلقت کو دور سے مت دکھا کہ یوں

بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا

بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

صحت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو

دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کے

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ

جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

دکھا کر جنبش لب ہی تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

اس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں
شوق فضول و جرات رندانہ چاہیے

زلف آنکھیں بھونیں 'ایروڑ خسار' گردن اور کھائی وغیرہ کا بیان تو ہر شاعر کے کلام میں مل جائے گا لیکن غالب کی شوخی طبعیت کا کیا کیا جائے کہ انہوں نے محبوبہ کے پاؤں کی بھی طرح طرح کی تصاویر اتاری ہیں۔ اور ایک شعر میں اپنے پاؤں پر بھی عجیب و غریب نظر ڈالی ہے:-

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیمتن کے پانو
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دکھتے ہیں آج اس بت نازک بدن کے پانو

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جب اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اللہ رے ذوق دشت نور دی کہ بعد مرگ
 جلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانو
 جب بات چل ہی نکلی ہے تو بستر اور بکھے سے متعلق بھی غالب کی نکتہ افروزی اور شوخ طبیعت
 پر اک نظر دوڑا لی جائے:-

خوشا اقبال رنجوری، عیادت کو تم آئے ہو
 فروغ شمع بالیں، طالع بیدار بستر ہے

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجر یار میں غالب
 کہ بیٹابی سے ہر اک تار بستر خار بستر ہے

غش آگیا جو پس از قتل میرے قاتل کو
 ہوئی پھر اس کو مری غش بے کفن نکلیے

مزا ملے کہو کیا خاک ساتھ سونے کا
 رکھے جو بیچ میں وہ شوخ سیم تن نکلیے

مرزا نہ صرف یہ کہ مشرب ممنوعہ کے بے طرح عادی ہو گئے تھے اور اسے اپنی ضروریات

زندگی میں سے سمجھتے تھے بلکہ ان کے کلام میں بھی سے نوشی پر بڑے جاندار اشعار ملتے ہیں
جن میں طہر اور شوفی کی ہلکی سی لہر دوڑتی نظر آتی ہے:-

جان فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں

بہوں شراب اگر خم بھی دیکھے لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کونہ و سبب کیا ہے

چار موج اٹھتی ہے طوفان طرب سے ہر سو
موج گل موج شفق موج صبا موج شراب

موج گل ڈھونڈ بہ غلوت کدہ غنچہ باغ
گم کرے گوشہ میخانہ میں گر تو دستار

کہاں سے خانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پراتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

ہم سے کھل جاؤ بوقت سے پرستی ایکدن
ورنہ ہم چھپریں گے رکھ کر نذر مستی ایکدن

اگر یہ معلوم کرنا ہو کہ کوئی شخص کتنا حوصلے مند ہے اور کتنا جلدی دوسروں میں گھٹنے ملنے والا ہے تو معلوم کرو کہ وہ شخص اپنی ذات پر ہنسنے کا حوصلہ رکھتا ہے یا نہیں۔ معلوم نہیں کسی کا یہ کہا کہاں تک درست ہے مگر مرزا غالب کی حد تک تو یہ سو فیصد صحیح اترتا ہے۔ وہ اپنی ذات پر ہنسنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔

غالب نے ابھی خاصی تعداد میں ایسے اشعار چھوڑے ہیں جن میں وہ اپنی ذات کو طنز و مزاح یا غربت و مسکینی کا نشانہ بناتے نظر آتے ہیں۔

”مزاح کی طرح غالب کی طنز بھی لطیف ہے گواہی براہ راست یا سادہ نہیں۔ ان کے ہاں وہی بات جب تک سادہ اور براہ راست رہتی ہے ہلکے پھلکے مزاح کا نمونہ معلوم ہوتی ہے لیکن جہاں اس میں معمولی بھی غم آیا طنز کا ٹیکسپا بن اور نظرافت کا ستم پورے طور پر نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس غیر معمولی اعتماد اور قابو کی مثالیں کوئی حالی سے پوچھے یا ان دوستوں سے جن کے نام غالب نے ہنس کر خطوط لکھے ہیں یا پھر ان مقطعوں میں دیکھے جن میں کسی نہ کسی بہانے کوئی نہ کوئی سخن گستاخانہ بات آپڑی ہے“

(رشید احمد صدیقی ”کوئی تھلاؤ کہ ہم تھلائیں کیا“)

آئیے ہم بھی ایسے مقطعوں اور دوسرے اشعار سے لطف اندوز ہوں جن میں بظاہر غالب نے اپنی ذات یا اپنے ماحول پر چوٹ کی ہے مگر ایسا کر کے ہمارے لیے طنز و مزاح کا

سامان کر گئے :-

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

دھول دھپا اس سراپہ ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایکدن

چاہتے ہیں خورو یوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہئے

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی
بنا کر فقیروں کا ہم بھیں غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب ایک نہایت ہی صاف گو انسان تھے۔ اور انکی
یہی تصویر اپنے دیوان کے متعدد اشعار سے بھی جھلکتی ہے۔ مرزا نے خدا پر تو طنز کیا ہی ہے۔
انکے قلم کی کاٹ سے فرشتے، فیضیہ شیخ، مختب اور زاہد کوئی بھی نہیں بچا۔ کعبہ، زمر، حرم، دیر
کلیسا، مسجد، مندر اور خانقاہ پر بھی ان کی نظر کرم رہی ہے۔ چند ایک مثالیں پیش ہیں:-

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر باحق
آدی کوئی * ہمارا دم تحریر بھی تھا

اک کھیل ہے اور نگ سلیمان مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

ایمان مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب پہ خیال اچھا ہے

جب میکدہ چھنا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو ' مدرسہ ہو ' کوئی خانقاہ ہو

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یا رب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

ترے سرو قامت سے اک قد آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خطر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے

کعبہ میں جا بجائیں گے ناقوس
اب تو باغِ حیا ہے دیے میں احرام
بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کبھی بھی میسر نہیں انساں ہونا

حضرت تاجِ گُر آدیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

غائب برا نہ مان جو واعظِ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

غالب کو جوانیت اپنے خاندانی ماحول اور درباری رجبے کی وجہ سے ملی اس نے
عزت کی شخصیت پر غیر مثبت اثرات ڈالے مگر ساتھ کے ساتھ انکو یہ حوصلہ بھی بخشا کہ وہ ہر غم
اور ہر مصیبت کے سامنے دیوار بن کر کھڑے ہوں اور نہ صرف اس غم کو سہا بلکہ ایسا کرتے
ہوئے ایک اطمینان اور ایک لطیف شوخی اسکے لبوں پر موجود رہی۔ اور جب کبھی وہ اپنے

آپ کو جتانے کے موڑ میں ہوتے تو خود داری اور عزت نفس کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر
 On the Defensive کے سامنے آتے یہاں تک کہ اپنی معشوقہ کو بھی اکثر
 رکھتے۔

شوقی کے ضمن میں مجھے دیوان غالب کا جو شعر نہایت مرغوب ہے اس پر اس مضمون کو ختم
 کرتا ہوں:-

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
 جلا د کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

خوشحال و غالب اقبال کی نظر میں

اس میں کلام نہیں کہ خوشحال غالب اور اقبال زمانہ ساز شخصیتیں تھیں۔ اگرچہ ہم خوشحال اور غالب کا بلا واسطہ موازنہ کرنے نکلے ہیں مگر اس راستے میں اب ہم ایک ایسے مقام سے گذر رہے ہیں جہاں اقبال کی شخصیت بار بار ہماری نظروں کے سامنے آرہی ہے۔ اسلئے کیا ہی اچھا ہو کہ ہم خوشحال و غالب کی شخصیتوں اور فن کو علامہ اقبال کی نظر سے پرکھیں۔ جو شاید ایک منفرد ادبی تجربہ ہو۔ باوجود یہ کہ اس سے پہلے خوشحال و اقبال اور غالب و اقبال کا موازنہ کسی نہ کسی طور کیا جا چکا ہے۔ آئیے پہلے خوشحال کو علامہ اقبال کی نظر سے دیکھیں:

خوشحال۔ اقبال کی نظر میں

میر عبد الصمد خان کی شہرہ آفاق کتاب خوشحال و اقبال کے صفحہ اول پر خوشحال و اقبال کے یہ دو اشعار لکھے ہوئے ہیں:-

خوشحال لکھ باز پہ لوٹے لوٹے بنکار زما نظر دے

نہ چھ گھر خبی گونگت نیسی باد خورگ یم

ترجمہ:- میری نظریں باز کی طرح بڑے بڑے شکار پر ہوتی ہیں

میں کیڑے مکوڑے پکڑنے والا جانور نہیں ہوں۔

اقبال نگاہ عشق دل زندہ کی تلاش میں ہے

شکار مردہ سزاوار شاہباز نہیں

آگے چل کر اسی کتاب خوشحال و اقبال کے تعارف میں مندرجہ ذیل الفاظ ہماری توجہ اپنی طرف کھینچتے ہیں:

”اقبال اور خوشحال کے زمانوں میں کم و بیش دو سو سال کا فرق ہے۔

اقبال کا حلقہ فکر و نظر لازمی طور پر خوشحال سے وسیع تر ہے۔ علوم

جدیدہ سے ان کی کامل واقفیت اور عصر حاضر کے پیچیدہ ماحول نے

ان کی نظم و نثر کو وہ گہرائی عطا کی ہے جس کی تلاش عہدِ شوق کے کسی

مصنف کی تخلیقات میں لا حاصل ہوگی۔ تاہم اساسی طور پر دونوں

(خوشحال و اقبال) کے افکار کا منبع وہی سرمدی سوتا ہے جو کم و بیش چودہ

سو سال ہوئے ریگزارِ عرب میں سے پھوٹا اور جس کی آبیاری سے

انسانی قلب و نظر کی سچلواہی اب تک ہری بھری ہے۔ اقبال اور

خوشحال میں یہی وہ مشترک عنصر ہے جس سے فقر ’خودداری‘ حریت

پسندی، بلند ہمتی اور سخت کوشی کی اقتدار ان کے کلام میں رہی ہوئی نظر آتی ہیں۔“

(ڈاکٹر ایس اے رحمن جج سپریم کورٹ آف پاکستان، لاہور، ۱۱ ستمبر ۱۹۶۰ء)

اور اسی کتاب ”خوشحال و اقبال“ کے غرض لفظ کے یہ چند الفاظ بھی قابل توجہ ہیں:-

”حیرت و مسرت کی انتہا نہیں رہتی کہ آج سے تین سو سال پہلے ضلع پشاور کے ایک گاؤں اکوڑہ ٹنک میں ایک اور شخص گزرا ہے جسے دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ پشتو کا اقبال بشکل خوشحال تھا یا تین سو سال بعد اردو کا خوشحال بہ شکل اقبال پیدا ہوا۔“

(محمد جعفر شاہ پبلواری رفیق ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور، ۶۰-۶-۱۰)

تاریخ گواہ ہے کہ علامہ اقبال کو ملت افغان سے دلی محبت تھی۔ وہ اسے ایشیا کے دل کی حیثیت دیتے تھے:-

آسیا یک پیکر آب و گل است

ملت افغان در آن پیکر دل است

ایک اور جگہ شاعر مشرق افغانوں کی فضیلت یوں بیان کرتے ہیں:-

”مقتدی تاتار و افغانی امام“

خوشحال کی ترجمانی کرتے ہوئے ایک اور موقع پر ضرب کلیم میں علامہ نے افغان ملت کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے فرمایا:-

”اپنی خودی پہچان اور غافل افغان“

اگر علامہ اقبال نے شاہ امان اللہ خان اور نادر شاہ شہید فرمان رواہان افغانستان کی شان میں قصیدہ (۱) اور مثنوی (۲) کے اشعار لکھے اور خود نادر شاہ کی دعوت پر ہندوستان کے مسلمان رہنماؤں مولانا سلیمان ندوی اور سر سید احمد خان کے نواسے سر راس مسعود کا ایک وفد لیکر کابل کا دورہ کیا تو یہ سب انکی اس تڑپ کے مظاہر ہیں جو وہ ملت افغان کے لئے رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ علامہ کے دوستانہ روابط اُسوقت کے وزیر تعلیم افغانستان کے ساتھ بھی تھے۔ جو خوشحال خان خٹک کی منظومات کے سلسلہ دار انگریزی تراجم علامہ اقبال کو کابل سے بھجوایا کرتے تھے۔ گوکہ اس سے پہلے علامہ نے انگریز مستشرق میجر راورٹی کی انگریزی میں ترجمہ کی ہوئی خوشحال کی سو کے قریب نظموں کا مطالعہ اپنے قیام جرمنی کے دوران کر رکھا تھا۔ اور ان سے متاثر ہو کر حیدر آباد دکن کے انگریزی مجلہ ”اسلامک کلچر“ میں ایک مضمون بعنوان ”The Afghan Warrior Poet“ رقم کر چکے تھے۔ جس میں انہوں نے خوشحال کی شاعری اور شخصیت پر اپنی رائے کا جو اظہار کیا تھا اسے ڈاکٹر سید عبداللہ یوں بیان کرتے ہیں:-

”علامہ اقبال کے جس خیال نے مجھے اپنی طرف فوراً متوجہ کیا وہ یہ تھا کہ:-

”خوشحال خان کی شاعری میں ابتدائی عرب شاعری کی روح کا درما

نظر آتی ہے۔ جب ہم اس کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم اس میں بیان کی فطری اصلیت و صداقت کو واضح شکل میں دیکھتے ہیں۔ اس میں عرب شاعری کی طرح آزادی اور جنگ سے محبت کا اظہار ملتا ہے اور زندگی کے بارے میں نقطہ نظر اور تنقید کا رنگ ڈھنگ بھی ویسا ہی نظر آتا ہے۔“

یہ بھی حقیقت ہے کہ علامہ اقبال کے دل میں عربی شاعری کی روح و آزادی و صداقت کی بڑی عزت تھی چنانچہ انہوں نے اسرار خودی کے دیباچہ میں معاصر شعراء کو عربی شاعری کی پیروی کی تلقین کی تھی اور فرمایا تھا:-

۔ رہتے سوئے عربی بایات

ڈاکٹر سید عبداللہ آگے چلکر فرماتے ہیں:-

”جہاں تک مجھے معلوم ہے علامہ اقبال نے غالب (اور شاید قدرے

نظیری نیشاپوری) کے سوا فارسی اور اردو کے کسی شاعر کو ”یہ وجہ عطا

نہیں کیا جو خوشحال خان کو دیا“

(ڈاکٹر سید عبداللہ ”خوشحال خان کی شاعری میں ابتدائی عرب شاعری کی جھلک خوشحال نامہ“)
خوشحال کا کلام پڑھنے اور اس سے حد درجہ متاثر ہونے کے بعد علامہ اقبال نے نہ صرف افغان وزیر تعلیم کو خوشحال کی شخصیت اور شاعری پر مزید ریسرچ کے لیے کسی جید عالم کو مقرر کرنے کے لیے کہا بلکہ لاہور کی ریسرچ سکاں محترمہ خدیجہ فیروز الدین کو بھی خوشحال پر پی

ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے کی تلقین کی۔ محترمہ خدیجہ نے یہ مقالہ لکھا۔ اور اس پر ان کو ۱۹۴۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی ڈگری عطا کی گئی۔

خوشحال کا کلام پڑھنے کے بعد علامہ اقبال نے جاوید نامہ میں اسے یوں خراج تحسین پیش کیا:-

خوش سرود آں شاعر افغان شناس

ہر کہ بیند باز گوید بے ہراس

آں حکیم ملت افغانیاں

آں طبیب ملت افغانیاں

راز قوسے دید و بے پاکانہ گفت

حرف حق با شوقی رندانہ گفت

اس کے علاوہ علامہ نے خوشحال کی وصیت کو بال جبریل میں یوں جگہ دی:-

قبائل ہوں ملت کی وحدت میں گم

کہ ہو نام افغانوں کا بلند

مہبت مجھے ان جوانوں سے ہے

ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کند

مغل سے کسی طرح کم تر نہیں

کوہستان کا یہ پہچے ارجمند

کہوں تجھ سے اے ہم نشیں دل کی بات
وہ مدفن ہے خوشحال خاں کو پسند
اڑا کر نہ لائے جہاں باد کوہ
مغل شہسواروں کی گردِ سمند

خوشحال و اقبال کے نظریات اور فلسفہ ہائے حیات

زیادہ تفصیل میں جائے بغیر ہم اتنا کہنے پر اکتفا کر سکتے ہیں کہ خوشحال اور اقبال دونوں نے اسلام کی تعلیمات سے استفادہ کیا تھا۔ اس لئے دونوں مسلمانوں کے اتحاد کے نظریہ پر متفق تھے۔ جہاں خوشحال نے مغلوں کے وقتی مظالم سے تنگ آ کر ملت افغان کو متحد کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ اور افغانوں کے تنگ اور عزت کی خاطر اپنی کمر سے گوارا لٹکائی وہاں اقبال نے پوری مسلم ملت کو ایک لڑی میں پروانے کی کوشش کی۔ لیکن اگر بنظرِ مینق دیکھا جائے تو خوشحال جس جغرافیائی اکائی کو مغلوں کی غلامی سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ وہ آج کے مغربی پنجاب صوبہ سرحد کا بل قند ہار اور کشمیر پر مشتمل تھی۔ جہاں ملت افغان کے افراد کم یا زیادہ تعداد میں آباد تھے۔

”علامہ اقبال نے پاکستان کا تصور پیش کرتے وقت شمالی ہندوستان

میں مسلم اکثریت کے علاقوں کے علاوہ کشمیر اور افغانستان کو بھی اپنے تصور کا آزاد اسلامی ملک گردانا تھا جیسا کہ پاکستان کے حروف ”ک“ اور ”الف“ سے ظاہر ہے۔۔۔۔۔ خوشحال خان خٹک ساری عمر پختونوں کے اسی علاقے کے لئے لڑتا رہا جو آج پاکستان کا بازوئے ہندو ق زن کہلاتا ہے اپنے اس علاقے کے لوگوں کو موجودہ مغربی پاکستان کے مسلمانوں سے کبھی جدا نہیں سمجھا۔ وہ پاکستان کے اسی حصے کو ہندوستان سے الگ اور آزاد رکھنا چاہتا تھا۔“

(میر عبدالصمد خان، ”خوشحال و اقبال“)

”جہاں خوشحال نے افغان قوم کے لئے ”پشتو“ پر قائم رہنا ضروری سمجھا وہاں اقبال کے ہاں خود شناسی اور خدا شناسی کے مجموعے ”خودی“ کا نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ ”پشتو“ چند اوصاف کے مجموعے کا نام ہے۔ یہ اوصاف اسلام میں بھی پائے جاتے ہیں یعنی شجاعت، مردانگی، سخاوت، مہمان نوازی، غیرت، ہمت، اولاد عزیزی، استقلال اور ارادے کی پختگی لیکن ”پشتو“ کے نظریہ میں چند غیر اسلامی عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اقبال کی خودی ایک مکمل اخلاقی نظام کے نیچے فرد اور ملت کی تربیت کا نام ہے۔

اسی سلسلے میں خوشحال کی ”پشتو“ کے نظریے سے تنکھیاں مرد یا با تو (غیرت کرنے والا) عزت کے لیے جان پر کھیل جانے والا، تھوڑا بولنے والا، زیادہ عمل کرنے والا، وجود میں آیا تو اقبال کی خودی کے نظریہ سے مرد مومن (توحید کے راستے پر چلنے والا) مرد آزاد

مرد قلندر، مرد کامل اور بندۂ مولا صفات) وجود میں آیا۔ علامہ اقبال اپنے مرد مومن کی تعریف یوں کرتے ہیں:-

ہاتھ ہے اللہ کا، بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کار کشا، کار ساز
خاک کی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی، اس کا دل بے نیاز
اسکی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا و فریب، اس کی نکلہ و نواز
نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو
رزم ہو یا ہزم ہو پاک دل و پاکباز
خوشحال اپنے تنگیال کی ستائش یوں کرتے ہیں:-

ترجمہ:- مرد وہ ہے جو باہمت اور باہرکت ہو

وہ دوسروں کے ساتھ کھائے پیئے اور رہائش رکھے

جس کا قول یکا اور عہد عہد ہو

نتو دروغ گو ہو نہ ہی فریب کار

اونہی ظاہری طور پر پر تپاک ہو

خاموشی سے تھوڑا بولے اور زیادہ عمل کرے

اور غنچے کی مانند اس کا منہ بند ہو کر سینہ چاک
 اور جہاں پستی و بلندی کا ذکر آئے تو
 بلندی میں آسمان ہو اور پستی میں خاک
 باغ میں تازہ و دلگفتہ پھول کی طرح ہو
 جس پر سوبہ بلبلیں منڈلاتی راتی ہیں

غور کریں تو خوشحال کا تنکیال اور اقبال کا مرد مومن ایک دوسرے کے کافی نزدیک نظر آئیے
 یہ اس لیے کہ دونوں نے اپنا تصور انسان قرآن پاک کی تعلیمات اور فلسفے توحید سے لیا
 ہے۔ اور اپنے اپنے رنگ میں پیش کر دیا ہے۔

(میاں سید رسول رسا "مقدمہ ارمغان خوشحال")

مرد مومن اور تنکیال کے علاوہ خوشحال کا باز اور اقبال کا شاہین بھی ایک جیسی صفات کے
 حامل ہیں۔ خوشحال بابا کہتے ہیں:-

نہ مچ یم نہ کلر غہ یم چہ پہ کبر و مرو گھر خم
 یا باز یم یا شاہین یم پہ خیل بنکار مہ زہ خرم دے
 ترجمہ:- میں نہ کبھی ہوں اور نہ کوا کہ مردار چیزوں کے پیچھے پھروں۔ میں تو باز ہوں شاہین
 ہوں میرا دل اپنے شکار کو دیکھ کر خرم رہتا ہے۔
 خوشحال و اقبال دونوں نے فلسفے ستیز اور سخت کوشی پیش کیا۔

جسے خرگندہ سرمایہ کاندی دتورو
 زہ خوشحال ختک تر ہسے ہنر ٹھار شم
 ترجمہ:- جب جنگ میں کموروں کے ساتھ سر کی بازی لگائی جاتی ہے۔ تو خوشحال ایسے ہنر
 کے قربان جاتا ہے۔

اقبال:- بہر یا غلطو بامویش درآویز

حیات جاوداں اندر تیز است

اسکے علاوہ خوشحال و اقبال کی شاعری میں رجائیت 'آرزو' جستجو 'مدعا' حق گوئی اور بیباکی
 کے مضامین میں حد درجہ مماثلت پائی جاتی ہے۔ اغیار اور دوستوں کے لیے انسان کو کیسا
 ہونا چاہیے۔ اس موضوع پر ہمارے ان دونوں ماہر شعراء کے خیالات کی ہم آہنگی ملاحظہ
 کریں۔ خوشحال بابا فرماتے ہیں:-

واغیار تنہ لکھ کانے 'موم و یار تہ

پہ سختی او پہ نرمی کنبی ہفہ زہ یم

اہل شرتہ دشاہین منگل پیدا کرہ

اہل خیروتہ حلیم شہ تر حمام

ترجمہ:- جو اغیار کے لیے پتھر اور دوست کے لیے موم ہو

خفی اور نرمی میں وہ میں ہوں

اہل شر کے لئے شاہین کا بچہ پیدا کر

اور اہل خیر کے لئے کبوتر سے بھی زیادہ نرم ہو جا

اقبال:-

مصافِ زمیگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر

شبستانِ محبت میں تریو پر نیاں ہو جا

ہمارے ان دونوں شعراء کے نزدیک جنت کا تصور بھی تقریباً ایک جیسا ہے:-

خوشحال:-

زاہدانِ چپی مونخِ روژہ کا جنتِ غواری

ما خوشحال د مزدوریہ طاعتِ نہ زندہ

ترجمہ:- یہ جوازِ نمازِ روزے کے بدلے جنت کے خواہاں ہیں۔

مجھے اس قسم کی مزدوری اور اطاعت کرنی نہیں آتی۔

اقبال:- سوداگری نہیں یہ عبادتِ خدا کی ہے

او بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

آخر میں دو ایک عجیب اتفاقات کا ذکر کے اس مضمون کو سمیٹتے ہیں۔ کیا یہ ایک عجیب اتفاق

نہیں کہ خوشحال اور اقبال دونوں نے شاعرانہ ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔

خوشحال:- زہ د شعر پہ کارِ ہیخ نہ یم خوشحال

ولہی خدانے مہی کرو پہ غارہ دا مقال

ترجمہ:- میں شعر و شاعری کے کام سے خوش نہیں ہوں

مگر خدا نے یہ کام میرے گلے میں ڈال دیا ہے۔

اقبال:-

”میں نے اپنے آپ کو کبھی بھی شاعر نہیں سمجھا۔ مجھے شاعری کے فن کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ پھر بھی میرے کچھ مقاصد ہیں جنکو بیان کرنے کے لیے میں نے اس وطن کے حالات اور روایات کی وجہ سے نظم کے ذریعے کو ترجیح دی ہے“

یہ حوالہ ماہنامہ ”دعوتِ اسلام آباد“ مئی ۲۸ نومبر ۱۹۹۹ء

(سہ ماہی ”پشتو“ پشتوا کیڈمی پشاور نومبر-دسمبر ۱۹۹۹ء ص ۷۱)

دوسرا عجیب اتفاق یہ ہے کہ خوشحال و اقبال دونوں نے اپنی موت سے پہلے پشتگوئی کے انداز میں اشعار کہے ہیں جو انکے آخری الفاظ کہے جاسکتے ہیں اور جن میں حدودِ جدِ ممالکت پائی جاتی ہے۔

خوشحال:-

نہ بہ زما غوندي بل ننگياله راشي

نہ بہ زما غوندي بل جنگياله راشي

ختک لا پر سروده به درست افغان کښي

عجب که هسي فرهنگياله راشي

ترجمہ:- نہ ہی میرے بعد میری طرح کا کوئی تنکیال آئے گا

نہ ہی میرے بعد میری طرح کا کوئی جنگجو آئے گا
 تنگ قوم کا تو کیا کہنا بلکہ پوری افغان
 قوم میں شاید کہ میری طرح کا کوئی دانشمند آئے
 اقبال:-

نہیے از حجاز آید کہ نہ آید
 وگر دانائے راز آید کہ نہ آید

اس مضمون کو ذیل کے اقتباس پر ختم کرتے ہیں:-

”خوشحال کی علمی، ادبی فتوحات کا سلسلہ بہت وسیع ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ اپنی گونا گوں خصوصیات اور صلاحیتوں کے پیش نظر اتنا عظیم اور جیمکس فنکار ہے کہ پورے ایشیا میں اُس کا جانی پیدا کرنا محال ہے۔ تو بیجا نہ ہوگا۔ اس نے سب سے پہلے انسان کامل کا تصور خودی کا فلسفہ اور شاہین کا سہل پیش کیا۔ قوم کو بیدار کرنے کے لیے اس نے (ان) تین ستونوں پر اپنی شاعری کی عمارت اٹھائی۔ ادھر ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ اقبال کی شاعری بھی ان ہی بنیادوں پر استوار ہوئی ہے۔ یہ کوئی حسن اتفاق نہیں۔ بلکہ کھلی حقیقت ہے کہ علامہ اقبال نے سب سے پہلے میجر راورٹی کے حوالے سے خوشحال کی نظموں کا اردو مضبوط ترجمہ پیش کیا۔ اسی طرح خوشحال کے خودی کے

قلم کی شاہین کی علامت کو اسی کے پیش کردہ صفات و خصوصیات کے ساتھ اپنایا اور ان سے ملت خرابیدہ کو بیدار کرنے کے لیے خاطر خواہ کام کیا۔

(فارغ بخاری رضا ہدائی) ”خوشحال خان خٹک‘ تلاش اور منکوم ترجمہ“ ص ۱۶، لوک ورثہ اشاعت گھر اسلام آباد ص ۱۹۸۰ء)

غالب۔ اقبال کی نظر میں

خوشحال کو اقبال کی فکر سے دیکھنے کے بعد ہم غالب کی طرف آتے ہیں۔ جیسا کہ معلوم ہے غالب نے اردو شاعری کو ایک نئے رنگ میں ڈھالا اور وہیں سے اردو کی جدید شاعری کی ابتداء ہوئی۔ اس کا اثر اردو غزل پر خاص طور سے پڑا جو حالی و اقبال سے ہوتا ہوا آج کے شعراء میں آجھٹکا ہے۔ گو کہ اقبال نے غزل کو بھی نبھایا لیکن انکا اصل میدان نظم میں ہے۔ بہر حال جب غالب کا ذکر کرتے ہیں تو انکی انفرادیت انکے زور تخیل اور انکی فکر کی سرعہ و منت سمجھی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں اقبال نے غالب کو اپنی عقیدت کا تذکرہ یوں پیش کیا ہے۔

فکر انسان پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے یہ مرغ تخیل کی رسائی تا کجا

لفظ گویائی میں تیری ہم سری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکر کامل ہمنشین

تو کیا اقبال نے غالب سے فیضان حاصل کیا جس سے ظاہر ہو کہ اقبال کی نظر میں غالب کا کیا مقام ہے:-

”غالب سے صحیح معنوں میں اگر کسی نے فیضان حاصل کیا ہے تو وہ اقبال ہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ اقبال نے غالب کا تتبع کیا ہے۔ اقبال کی شخصیت غالب سے بالکل الگ ہے اور اتنی منفرد کہ ان کے بنیادی عناصر میں کوئی مشابہت نہیں۔ سر عبدالقادر مرحوم نے بالک دراکا دیباچہ لکھتے وقت یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ”اگر میں سلسلہ تاریخ کا قائل ہوتا تو سمجھتا کہ غالب کی روح نے اقبال کے جگر میں دوبارہ جنم لیا ہے۔“ یہ تنقید درست نہیں۔ اقبال نے غالب سے اسی طرح فائدہ اٹھایا ہے جس طرح انہوں نے ہاشمی کے تمام بلند پایہ شاعروں سے۔ انہوں نے اردو فارسی کے ادب عالیہ کی تمام زندہ روایات کو اپنے اندر سمولیا ہے۔۔۔ لیکن غالب کی طرف

انہوں نے اس لیے زیادہ رجوع کیا کہ غالب ہی اس وقت تک اردو میں اکیلے شاعر تھے۔ جن کے یہاں فکر کے عناصر ملتے ہیں۔ اقبال جو بات کہنی چاہتے تھے وہ ولی، قائم، میر، مومن یا خود ان کے استاد داغ کی زبان میں ادا نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے لامحالہ غالب کے طرز گفتار سے انہوں نے فائدہ اٹھایا لیکن ان کی شخصیت اور ان کا وجدان بالکل غالب سے منفرد ہے۔ اس لیے موضوعات کے سلسلے میں انہوں نے نئی سمت سفر کیا۔

(فلیل الرحمن اعظمی ”غالب اور عصر جدید“)

جاوید نامہ میں غالب کے متعلق اشعار ان سے سوال و جواب اور ان کی ایک مشہور فارسی غزل کے منتخب اشعار کی نقل سے واضح ہوتا ہے کہ اردو شعراء میں اقبال سب سے زیادہ غالب سے متاثر تھے۔ وہ ان کو محض فنکار ہی نہیں بلکہ اس سے زیادہ سمجھتے تھے۔

زندگی مضمر ہے تیری شوخی تحریر میں

تاب گویائی سے جنبش ہے لب تصویر میں

جب ہم انفرادیت پسندی کی بات کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے پرانے دور کے شعراء کسی نہ کسی بسکہ بند شاعری پیروی کرنے ہی کو شاعری کا کمال سمجھتے تھے۔ اس دور کے بڑے شعراء یعنی میر اور مومن کی بات ذرا مختلف ہے۔ انہوں نے اپنا الگ رنگ بنانے کی کوشش کی کہتے ہیں کہ غالب کی کامیابی کا راز ہی ان کی انفرادیت میں مضمر ہے:-

”نظم کے شعراء اپنی شخصیت اور انفرادیت کے اظہار سے زیادہ شغف رکھتے ہیں۔ اس انفرادیت پسندی کی ابتداء غالب سے ہوئی اور ہمارے ہاں کے جدید رنگ کے شعراء ابھی تک اسی نیچ پر چل رہے ہیں۔ اقبال کی دنیا غالب کی دنیا سے کسی قدر مختلف ہے۔ ان دونوں میں واقعی بعد المشرقین ہے۔ غالب ہندوستان میں مظلیہ دور کے کلچر کا آخری ترجمان ہے اور اقبال مشرق میں مغربی فکر و خیال کا سب سے بڑا نمائندہ مگر شاعری کو اپنی شخصیت اور انفرادیت کا عکس بنانے کے نقطہ نظر سے اقبال نے غالب کی قائم کردہ روایت نباہی ہے“

(آفتاب احمد ”اردو شاعری میں غالب کی اہمیت“)

ایک اور خصوصیت جس کی وجہ سے اقبال نے غالب کے کلام کو پسند کیا وہ غالب کی شاعری میں ابتدائی عرب شاعری کا رنگ ہے۔ ان کو ابتدائی عرب شاعری کا یہ رنگ پشتو، اردو اور فارسی کے شعراء میں سے خوشحال غالب اور کسی حد تک نظیری غیثا پوری کے سوا کسی میں نظر نہیں آیا۔

اقبال کا مطالعہ اپنے زمانہ تک کے تمام انسانی علوم پر محیط ہے۔ اسی لئے مشرق و مغرب اور ماضی و حال کی بہت سی شخصیتیں اقبال کے زیرِ تجربہ آئیں۔ یہ سارے علوم و اشخاص اقبال کے فکری و فنی مقصود کے محض وسائل ہیں۔

”یہی سبب ہے کہ اقبال کے حلقہٴ تاثر میں متنوع بلکہ متضاد شخصیتیں بڑے توازن کے ساتھ اسیر ہیں۔ چنانچہ دوسرے بے شمار لوگوں کی طرح غالب سے بھی انہوں نے اسی طرح اخذ کیا ہے۔ ان کا ذہن و مزاج اردو شعراء میں سب سے زیادہ غالب کے مماثل ہے۔ اس سے قطع نظر کہ غالب ہی کی طرح اقبال کا بھی اصل سرمایہٴ فکر و فن فارسی میں ہے۔ یہ واقع ہے کہ ہمارے ادب کے ان دو عظیم ترین نابغوں کے تصور و تخیل میں بنیادی طور پر بڑی مشابہت پائی جاتی ہے۔ دونوں کے درمیان چند اہم اوصاف مشترک ہیں۔ شوخی، اندیشہ، رفعت خیال، ندرت فکر، شوکت اسلوب، آتش لوائی، رمزنائی، تصور، مستی و تمدی، ظاہر ہے کہ یہ مجرد اوصاف یکے نہیں جاتے بلکہ طبعی طور پر پائے جاتے ہیں“

(پروفیسر عبدالغنی (پنڈ) ”موازنہ اقبال و غالب“)

باوجود ان تمام حقائق کے جناب شہرت بخاری کا خیال ہے کہ اقبال و غالب کا مقابلہ مشکل ہے۔ اگر چنانچہ میں چند باتیں مشترک ہیں مگر وہ سطحی سی ہیں۔ غالب محض شاعر تھا اور اسکو اقبال کی طرح دنیا کو یہ پیام نہیں پہنچانا تھا۔

”بڑا فرق جو اقبال اور غالب میں محسوس کیا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ غالب جس قدر انسانی زندگی کو قریب سے دیکھتا ہے اقبال اس کا مشاہدہ

نہیں کر سکتا۔ اقبال کا تمام تجربہ کتابی ہے اس کی زندگی اور اسکے فلسفے میں ایک خلج حائل ہے مگر غالب زندگی کی تلخ ترین اور غلیظ ترین حقیقت کی نقاب کشائی میں جھجک نہیں پاتا۔“

(شہرت بخاری ”غالب کی فارسی شاعری“)

مثال کے طور پر غالب و اقبال کے فارسی کلام سے جنت کے متعلق ان اشعار سے دونوں کے فکرو فن کا موازنہ ہو جاتا ہے:-

غالب:

د ر آں پاک میخانہ بے سروش
چہ گنجائش شورش و نائے نوش

اقبال:-

مزی اندر جہانے کور ذوقے
کہ یزدان دارد و شیطان ندارد

یہی شعری موازنہ ہم غالب و اقبال کے اردو کلام میں بھی کر سکتے ہیں۔ اسکے لیے موضوع تو بہت سے ہو سکتے ہیں۔ لیکن ہم یہاں چند ایک پر اکتفا کریں گے:-

”فلسفہ جزو کل کا ذکر ہو تو غالب کے ہاں ”جز“ ”اپنے“ ”کل“ میں شامل ہونے کے لیے بے قرار ہے کیونکہ وہ اسی کا حصہ ہے اور اسی سے جدا کیا گیا ہے۔

قطرہ دریا میں جوٹل جائے وہ دریا ہو جائے
 کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے
 مگر اقبال کے ہاں ”جڑ“ ”کُل“ کو اپنے اندر جذب کرنا چاہتا ہے۔
 تو ہے محیطِ بیکراں میں ہوں ذرا سی آب جو
 یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر

(پروفیسر افضل حسین اعظمی ”غالب و اقبال کی ہم آہنگی“)

تصوف کا موضوع غالب و اقبال دونوں کے ہاں موجود ہے۔ پہلے غالب کو لیجئے:-
 ”وحدت الوجود کے نظریے کا اثر غالب پر اتنا گہرا ہے کہ اسے کسی
 طرح رکی نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اس کا تجربہ کرنے سے یہ ضرور پتہ
 چلتا ہے کہ غالب اس کی طرف دل کی بجائے ذہن کے راستے سے
 آئے لیکن اسے اپنی طور پر قبول کرنے کے بعد انہوں نے اس سے
 جذباتی وابستگی بھی پیدا کی کیونکہ اس کے بغیر مسائل تصوف کے بیان
 میں وہ نجوش نہیں پیدا ہو سکتا تھا جو مثال کے طور پر ان کے اس شعر میں
 موجود ہے:-

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
 ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایمان ہو گئیں

(ابو محمد سحر ”غالب کا فلسفہ“)

اور اقبال کے ہاں تصوف کا یہ رنگ ہے:-

”اقبال کی ہال جبریل کی غزلوں میں تصوف رچا ہوا ہے۔ اسی تصوف کی بدولت اقبال کی شاعری میں ایک مفکرانہ سنجیدگی اور ایک پاکیزہ تاثر پیدا ہو گیا ہے۔ اقبال سے پہلے ہمارے غزل گو شعراء کے تصوف میں ایک چیز کی کمی تھی وہ یہ کہ اجتماعی زندگی کے ارتقاء پر تصوف کی روشنی نہیں ڈالی گئی تھی۔ اقبال کے متعدد اشعار واقعیت اور روحانیت کے اس امتزاج کا پیش خیمہ ہیں جس کے لیے انسانیت آج گوش برد آواز ہے۔ معرفت الہی حاصل کرنے کے لیے حواس ظاہری کی ضرورت نہیں بلکہ اسی کے لیے حواس خمسہ باطنی کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے:-

مشام تیز سے ملتا ہے صحرا میں نشان اس کا
ظن و تخمین سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاری
ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدار دل وا کرے کوئی

(پروفیسر افضل حسین اعظمی ”غالب اور اقبال کی ہم آہنگی“)

جب ہم کسی شخص کے لب و لہجہ کی بات کرتے ہیں تو اسکی شخصیت سے اسکا تعلق ضرور بنتا ہے اور شخصیت پر اس شخص کے ارد گرد کے حالات کا۔ غالب و اقبال کے شاعرانہ لب و لہجہ میں

بڑی ماسٹت پائی گئی ہے۔ غالب نسلًا ترک تھے۔ اس لیے ترکوں کی تمام خصوصیات انکی شخصیت پر اثر انداز ہوتی رہیں۔ وہ کسی کے سامنے جھک نہیں سکتے تھے۔ پر جوش تھے۔ وضعدار تھے آن رکھتے تھے۔ ان تمام خصوصیات کا اثر انکی شاعری کے لب و لہجہ میں صاف جھلکتا ہے۔ اردو میں بھی اور فارسی میں بھی۔ مگر پروفیسر یوسف زاہد کے مطابق فارسی میں ان کا یہ قاہرانہ و باغیانہ لب و لہجہ اور بھی تند و تیزی اور جوش و استقامت کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ جہاں تک اقبال کے شاعرانہ لب و لہجہ کی بات ہے تو غالب کے کلام کا عمیق مطالعہ اور انکی اپنی حساسیت اس کے محرک بنے۔

”بہر حال غالب کے لب و لہجہ کے یہ مختلف پہلو اردو شاعری میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ان کی آواز میں جو قوت، صلابت، جوش، گری، یقین و اعتماد اور مردانہ قاہرانہ انداز ہے وہ ان کے بعد ہمیں اقبال ہی کی شاعری میں ملتا ہے۔ اور اقبال پر اس پہلو سے غالب ہی کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ ان کے لب و لہجہ میں بھی ایک گھن گرج، اثبات، خود داری، دلیری اور قاہری ہے لیکن غالب کی آواز اقبال سے کچھ زیادہ باغیانہ اور قوت و جبروت کی حامل معلوم ہوتی ہے“

(پروفیسر یوسف زاہد ”غالب کا شاعرانہ لب و لہجہ“)

غالب و اقبال کے نظریات اور فلسفہ ہائے حیات

حقیقت یہ ہے کہ غالب محض ایک شاعر تھے۔ اور انکی شخصیت میں قوم کو کوئی پیغام دینے یا اسکے ضمیر کو سمجھوڑنے کا کوئی عنصر موجود نہ تھا۔ حالانکہ تاریخی طور پر انہوں نے مغلیہ سلطنت کا خاتمہ اور انگریزی حکومت کی عملداری کی شروعات اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں۔ انکی طبیعت کی شوخی اور انکی یار باشی کا جذبہ بھی انکی شخصیت کی بنت میں اہم مقام رکھتے تھے۔ اس زاویہ سے دیکھا جائے تو قوم کو پیغام دینے کے لحاظ سے ان کا کوئی نظریہ حیات یا فلسفہ حیات نہیں تھا۔ لیکن انکا اپنی ذات کی حد تک ایک نظریہ حیات ضرور تھا:-

”غالب کی شاعری کے لب و لہجہ کو ان کے نظریہ حیات نے بھی

تقویت بخشی جس کو باہر نے یوں بیان کیا ہے۔۔۔ باہر بہ پیش کوش

کہ عالم دو بارہ نیست یعنی زندگی کی مسرتوں کے حصول میں پوری

کوششوں سے کام لینا (لیکن اس سے مراد بے فکری اور بے بھری

نہیں) اور یہی غالب نے کیا“

(پروفیسر یوسف ذہاب ”غالب کا شاعرانہ لب و لہجہ“)

اس کے برعکس اقبال ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے بالخصوص اور مسلمانان عالم کے لیے بالعموم اتحاد و یکجہتی کا پیغام لے کر اٹھے۔ وہ ایک طرف مسلمانان ہند کو انگریزوں اور

ہنود کے تسلط سے چھڑا کر انکے لیے اپنے ایک خط زمین کے خواب دیکھتے تھے۔ تو دوسری طرف اسلامیان عالم کو ایک ملت کے پلیٹ فارم پر لاکھڑا کرنا چاہتے تھے۔ یہ سب کچھ حاصل کرنے کے لیے انہوں نے مسلمانوں کی روحانی تربیت کرنے کی ٹھانی اور ایسا کرنے کے لیے خودی، مرد مومن اور شاہین کا تصور پیش کیا۔ یوں انہوں نے اپنی پوری شاعری کو اس مقدس فریضہ کو پورا کرنے کے لیے وقف کر دیا۔ اس مقام پر آ کر ہمیں غالب و اقبال کے کلام میں جھانک کر دونوں کی ہم آہنگی کا جائزہ لینا ہے:-

”فن کے بحیثیت فن کچھ تقاضے ہیں۔ جن سے عہدہ برآ ہونے والے شعراء یقیناً ایک مشترک راہ پر گامزن ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے غالب اور اقبال کو بھی ایک دوسرے کے برابر لا کر دیکھا جاسکتا ہے۔ غالب کی بیشتر شاعری عشقیہ ہے۔ اقبال کی شاعری کا صرف ایک حصہ عشقیہ ہے اور بیشتر غزلوں کی روح تصوفانہ ہے۔ غالب کے ہاں تصوف کسی باقاعدہ رجحان کی صورت میں نہیں ہے۔ مختلف اسالیب میں کہیں کہیں منتشر مضامین ہیں اور اس سلسلے میں دونوں شعراء کو اپنے سامنے لایا جاسکتا ہے“

(پروفیسر افضل حسین اعظمی ”غالب اور اقبال میں ہم آہنگی“)

منظر اک بلندی پر اور ہم بٹا سکتے
عرش کے ادھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا غالب

تو شاہین ہے پرواز ہے کام تیرا
 تیرے سامنے آسمان اور بھی ہیں اقبال
 لازم نہیں کہ خطر کی ہم پیروی کریں
 مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر لے غالب
 تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
 رستہ بھی ڈھونڈ خطر کا سودا بھی چھوڑ دے اقبال
 طاعت میں تار ہے نہ مے انگلیں کی لاگ
 دوزخ میں ڈال دو کوئی لیکر بہشت کو غالب
 سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
 او بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے اقبال
 زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
 غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں غالب
 علاج درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں
 جو تھے چھالوں میں کانٹے نوک سوزن سے نکالے ہیں اقبال
 آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہوتے تک
 کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہوتے تک غالب

گیسوںے تابدار کو اور بھی تابدار کر
 ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر اقبال
 اس ہم آہنگی کے باوجود غالب و اقبال کے فنی اور جذباتی افق بالکل جدا بھی ہو جاتے ہیں:

دیے و حرم آئینہ تکرار تمنا
 و ماندگنی شوق تراشے ہے پنا ہیں غالب
 گرچہ ہے میری جستجو دیے و حرم کی نقش بند
 میری فضاں سے رستخیز کعبہ و سومات میں اقبال

بہر حال یہاں تک آ کر اب ہم یہ جان چکے ہیں کہ غالب کا زمانہ اقبال کے حالات سے
 مختلف تھا۔ اس لیے اقبال کے برعکس انکے پاس قوم کے لیے کوئی پیغام نہ تھا۔ دوسری
 طرف اقبال ایک نظریے اور قوم کے لئے ایک پیغام لے کر آ گئے بڑھے۔ غالب و اقبال
 کی ہم آہنگی انکے کلام میں پائی جاتی ہے۔ اقبال نے غالب کا مطالعہ کیا اور کسی بھی
 دوسرے اردو شاعر سے زیادہ وہ غالب ہی سے متاثر دکھائی دیتے ہیں:-

”دونوں کے درمیان چند اہم اوصاف مشترک ہیں۔ شوخی، اندیشہ،
 رفعت خیال، ندرت، فکر، شوکت اسلوب، آتش لوائی، رعنائی تصور،
 ملتی و متحدی۔۔۔۔۔ ان کے اشتراک سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال و
 غالب کی فنی ساخت اصلاً ایک دوسرے سے ملتی جلتی تھی۔ ان کے
 نفس کا میلان اور مزاج کا رنگ ایک سا تھا۔ خود آگاہی، وسعت نظر“

لطافت تخیل کے سرمایہ دار دونوں تھے۔ خود سری' بے ہاکی' ہمت و
 اختراع سے دونوں بہرہ ور تھے۔ ان سب سے اہم بات یہ ہے کہ
 دونوں کا شعور فلسفیانہ اور ذوق عاشقانہ تھا۔ چنانچہ دونوں "درائے
 شاعری چیز سے دگر" کے قائل ہیں اور شاید اسی "پیغمبرانہ" احساس
 کے سبب ایک خود کو "عندلیب گلشن نا آفریدہ" اور دوسرا اپنے پارے
 میں "من شاعر فردا ستم" کہتا ہے۔

(پروفیسر عبدالغنی (پٹنہ) "موازنہ اقبال و غالب")

خوشحال و غالب

اپنے اشعار کے آئینے میں

خوشحال و غالب جیسی عالی شخصیتوں سے قطع نظر جب دو عام شخصیتوں کا بھی موازنہ کرنا ہو تو احسن طریقہ یہی قرار پایا ہے کہ ان شخصیات کے موافق اور مخالف ہر دو پہلوؤں پر روشنی ڈال کر انکا موازنہ کیا جائے۔ اس لیے جب ہم خوشحال و غالب کے کلام کا موازنہ کرنے چلے ہیں۔ تو ان دونوں کے کلام میں فکر موافق اور فکر مخالف کا جائزہ لینا ہوگا۔ اور اس باب میں ہم نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ دنیا میں کوئی دو شخصیتیں بھی بالکل ایک جیسی پیدا نہیں ہوتیں۔ شخصی خصوصیات میں فرق فطری ہے۔ اور یہی اس جہان رنگ و بو کی یو قلمونی کا ثبوت ہے۔ اسلئے ہم دو شخصیتوں میں شخصی اور فنی ہر دو میلانات میں موازنہ کر کے انکی موافق اور مخالف خصوصیات کو پرکھ کر آشکارہ کرتے وقت قدرت کی شان کو اجاگر کر رہے ہوتے ہیں۔ آئیے اب خوشحال و غالب کے اشعار کی روشنی میں قدرت کے اس کمال کا جائزہ لیں۔ جہاں اس باب میں دئے گئے اشعار کے لیے دونوں شعراء کے دیوان و کلیات کی چھان پنک شامل ہے۔ وہاں اس ریسرچ کے دوران مجھے جناب محترم ڈاکٹر درویش خان یوسفزے کے اس مقالہ سے بہت مدد ملی جو انہوں نے خوشحال اور غالب کے عنوان سے لکھا اور پشتو سرمانی تاترہ و پشاور اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۱ء میں چھاپا

گیا۔ اس مقالہ کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب اس دشت کی سیاحتی میں نوے کی دہائی سے مصروف رہے ہیں۔ بارے انکی یہ کاوش میرے بہت کام آئی۔ جس کے لیے میں انکا ممنون احسان ہوں۔ عجیب اتفاق ہے کہ اپنی اس موجودہ تصنیف ”موازنہ خوشحال و غالب“ کی شروعات میں نے بھی ۱۹۹۴ء میں کیں۔

تقابلی مطالعہ (ہم آہنگی فکر)

غالب

خوشحال

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیر بن ہر پیکر تصویر کا

صورت گرجی نہ صورت پہ دیوال ساز کہ
کل عالم نسبی پہ صفت زبان دراز کا
ترجمہ:- جب مصوروں پر کوئی اچھی تصویر بناتا
ہے۔ تو لوگ اس کی بہت تعریف کرتے ہیں۔

نوٹ:- قارئین کی دلچسپی کے لئے عرض ہے کہ خوشحال کا یہ شعر ان کی اس پہلی غزل کا پہلا شعر ہے جو منتخبات خوشحال خان خٹک میں چھاپی گئی۔ ادھر غالب کا مندرجہ شعر بھی انکے دیوان کی پہلی غزل کا پہلا شعر ہے۔

پہ درون کھنسی مہ پرانہ دی دہر گنج جو نہ
 پہ معنی کھنسی لکھ کان دسیم و زریم
 ترجمہ:- میرے درون میں بہت بڑے گنج
 (خزانے) چھپے ہوئے ہیں۔ (اسلئے) معنی
 کے لحاظ سے میں دزری کی ایک کان ہوں۔

گنجینہ معنی کا ظلم اس کو سمجھئے
 جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

دا عالم لکھ طفلان ورتہ بیکار سپہی
 د طفلانو پہ بازی پوری خندا کا
 ترجمہ:- مارف کو یہ دنیا بچوں کا ایک تماشا نظر
 آتی ہے۔ جس پر وہ ہنستا ہے۔

باز بچہ المقال ہے دنیا مرے آگے
 ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

پلار نیکہ مہ شہیدان و گور نہ تللی
 پشت پہ پشت مے ہنر دادے آل پہ آل
 ترجمہ:- میرے باپ دادا سب شہید ہوئے
 ہیں۔ میری کئی پشتوں سے بڑوں اور چھوٹوں
 سب میں یہ کمال پایا گیا ہے۔

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری
 کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے

د الہام غنڈی خبر وی چھی وادرومی
 چھی زما پہ زراۂ نزول کسا لایزال
 ترجمہ:- اک بات ہوتی ہے کہ جسے خدائے
 پاک بالکل الہام کی طرح میرے دل میں
 اتارتا ہے۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
 غالب صریح خامہ نوائے سرودش ہے

لہ دی خاورو نہ چھی گل رہی خوشحالہ
 دا پہ دا چھی تل ور درومی ماہ جبینی
 ترجمہ:- اے خوشحال اس مٹی سے یہ جو
 پھول نکلتے ہیں۔ وہ اس لیے کہ بڑی مرغبین
 حسینائیں اس کے تلے دھنی رہی ہیں۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
 خاک میں کیا صورتیں ہو گئی کہ پنہاں ہو گئیں

چھی یو زمان لہ سترگو جدا کیسی
 د خوشحال پہ مخ د اوہنکو محی رودون
 ترجمہ:- جب محبوب ایک لمحے کے لیے بھی
 خوشحال سے جدا ہوتا ہے تو خوشحال کے
 چہرے پر آنسوؤں کی نہریں بہنے لگتی ہیں۔

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوش انگ سے
 بیٹھے ہیں ہم جہیہ طوقاں کئے ہوئے

دیدی کلی طبیبان وارہ ناترس دی
 ددرو پہ طمع مہ اوسہ بیملو
 کہیں حقیقت جانکاہی مرض لکھیے
 کہیں مصیبت نامرانی دوا کیسے
 ترجمہ:- اے پیارو! کی امید میں نہ رہ کہ
 اس گاؤں کے تمام طبیب ناترس ہیں۔

ہیخ حجت نہ ہیجا مہ کوہ خوشحالہ
 ہر چہی تاوتہ خوگ وانسی تہ ہفہ
 ترجمہ:- اے خوشحال تو کسی سے کچھ حجت نہ کیا
 کر۔ تم وہی ہو جو لوگ کہتے ہیں۔
 ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
 تم ہی کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

د صبا بادہ گذر پہ چمن بیا کرہ
 پہ چمن کینسی رنگارنگ گلونہ واکرہ
 ترجمہ:- اے باد صبا تو پھر چمن پر گذر کر۔ اور
 چمن میں رنگارنگ پھولوں کو داکر۔
 ہاں نشاط آمد فصل بہاری داد داد
 پھر ہوا ہے تازہ سوائے غزلخوانی مجھے

چپی ٹیپ سو رہی وہ پہ مالک بادشاہ ووم
 ہمانی وہ ستاد تور و زلفو سیوپ
 ترجمہ:- جب تک مجھ پر تیری کالی زلفوں کا
 سایہ رہا تو میں بادشاہ کی مانند تھا۔ کیونکہ تیری
 کالی زلفوں کا سایہ ہمہ گیر تھا۔

د صبا پہ باد نشاط وی د مگلونو
 کہ جنبش کا د بلبل لہ شور و شرہ
 ترجمہ:- پھولوں کو باد صبا سے نشاط ملتی ہے۔ یا
 یہ پھول بلبل کے شور سے جنبش میں آتے
 ہیں۔

خدا یہ ہو مرہ ژوندون و کرہ پہ جہان کنہی
 چپی کارہ کارونہ سم کاندی خوشحال
 ترجمہ:- اے خدا تو خوشحال کو اتنی عمر دے کہ
 وہ اپنے پیچیدہ کاموں کو پایہ اختتام تک
 پہنچا سکے۔

د تقویٰ پہ کاروبار نہ خبرداریم
ولہٰ خدہ کرم چہ نصیب مہی گمراہی شوہ
ترجمہ:- میں تقویٰ کے کاروبار کا بخوبی علم رکھتا
ہوں۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ میری قسمت میں
گمراہی لکھی ہوئی ہے۔

چہ نہ زہ ترکانہ سخت دے ہری مین شوم
لاس دی نہ شی دسری ترکانہ لاندی
ترجمہ:- میں ایک سنگدل پر عاشق ہوا ہوں۔ کسی کا
مجبوری و دعوائے گرفتاری اللہ
دست درنگ آمدہ بیان وفا ہے
ہاتھ پتھر کے نیچے نہ آئے۔

دا اوپدہ اوپدہ غمونہ پریشانی
چہ زما دی دائی خوی داغے دختیو
ترجمہ:- میرے لیے غم اور پریشانی اسکی
تو اور آرائش غم و کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز
زلفوں کی دین ہے۔

زاہدان چہی مونخ روژہ کا جنت غواری
 ما خوشحال د مزدوریہ طاعت نہ زدہ طاعت میں تارہے نہ سے دانگیں کی الگ
 ترجمہ:- یہ جو زاہد نماز روزے کے بدلے دوزخ میں ڈال دے کوئی لیکر بہشت کو
 جنت کے خواہاں ہیں مجھے اس قسم کی مزدوری
 اور اطاعت نہیں آتی۔

خوشحال کہہ نہیں نہ دیہ نصیحت خوئی خوار مد کمرہ
 الہام دیہ چہی نہی وانی دا کلام بہ افغانی دیکھو غائب سے گر الجھا کوئی
 ترجمہ:- گو کہ خوشحال نبی نہیں ہے مگر اسکی نصیحت کو تو مان۔ ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا
 کہ وہ پشتو زبان میں جو کلام کہہ رہا ہے وہ الہام کا درجہ
 رکھتا ہے۔

د ساقی د میو ہسی شان اثر و
 پہ خمار کنہی مہی دستار د سرہ خپور شو موج گل و صوف پہ خلوت کدہ غنچہ بارغ
 ترجمہ:- ساقی کی شراب میں کچھ ایسا سرد تھا کہ گرم کرے کوشہ میخانہ میں گر تو دستار
 خمار کی وجہ سے میرے سر سے دستار کھسک کر نکھر
 گئی۔

نمر پہ کوم لوری ہر بوزی کوم خوا خیزی
 پہ خوشحال باندی یوہ شوہ تورہ سپینہ
 ترجمہ:- سورج کس اوڑ غروب ہوتا ہے اور کس
 طرف سے نکلتا ہے خوشحال کو کچھ نہیں دکھتا
 کیونکہ اس کے لیے سیاہ و سفید ایک ہو گئے
 ہیں۔

جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا
 وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونگر ہو

زیہ چہ خود دہنکلی مخ دمنی نہ وی
 پکھنی مات شدہ دتیرہ تو بری سغال
 ترجمہ:- جو دل خوبصورت چہرے کا عاشق نہ ہوا
 اس میں تیز دھار تیر کی نوک کے ٹکڑے چھیں۔

خبر سے چیرینہ اگر دل نہ ہو دینم
 دل میں چہری چھوڑ کر خوشچکاں نہیں

پہ کالیو سرہ مخ بنائستہ کیہی
 ستا پہ مخ بنائستہ ستا د مخ کالی دی
 ترجمہ:- زیورات تو چہرے کو خوبصورتی بخشتے
 ہیں مگر تیرے چہرے پر زیورات کی خوبصورتی
 تیرے چہرے کی وجہ سے ہے۔

ترے جواہر طرف کد کو کیا دیکھیں
 ہم اوج طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

کہ ستا کو شہ جنت سرہ خوک سعد راتہ کنہی دی
 کو شہ بہ دی وطن کرم کہ داعیب وی ہم دی وی
 ترجمہ:- اگر کوئی میرے سامنے تیرا کوچہ جنت کے
 مقابلے میں رکھ دے۔ تو میں تیرے کوچے کو اپنا وطن
 جانوں گا۔ اگر ایسا کر داعیب ہے تو یوں ہی سی۔

چہی بلانی دقامت راتہ ہنکارہ شوہ
 گویہ پاخیدہ بلاد قیامت
 ترجمہ:- جب میں نے اسکے قد کی بلا کو
 دیکھا۔ تو گویا قیامت کی بلا جاگ اٹھی۔

چہی دی سپین بارخو کبود کرم بہ چہچلو
 اوس شہ نہ گھنہی حالہ بہ مہی گھنہی
 ترجمہ:- تم مجھے اب تو نہیں مانتی۔ مگر وہاں
 (خلد میں) مجھے مان جاؤ گی۔ جب میں
 تمہارے سفید رخسار دانتوں سے کاٹ کر
 سرخ کر دوں گا۔

وہاں نہی تہول زما پہ غارہ

فستونے د عقل دہ خو چہ بدان وژنی اسد بیل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
ترجمہ:- عقل کا فتویٰ یہ ہے کہ تم جتنے بڑے تو مشق تازہ کر خون دو عالم میری گردن پر
لوگوں کو مار سکو۔ اس کا سارا وبال میری گردن

پ۔

ذری تہ چہی ہسی بریشی منورہ

کہ خبر نہی دا بریننادی دہ دنمرہ ہے تجلی تری سامان وجود
ترجمہ:- اے ذرے یہ جو تجھ سے روشنی چمککتی ہے ذرہ بے پروا خود شید نہیں
اگر تم جانو تو یہ سورج کی روشنی ہے۔

ساقی نن زما پہ دور جام گردان کرہ

گھورہ گماندہ بہ د چادور گردان شی کون ہوتا ہے حریف مئے مردانگن عشق
ترجمہ:- ساقی آج تم میرے نام سے جام ہے مکر ر لب ساقی پہ صلا میرے بعد
کا دور چلاؤ۔ کیا جانے آئندہ کس کے نام
کا جام چلے۔

چہی شو نلہی کیہ پدی د جام پہ مورگو
 اویسہ پہ جام کینہی رُب انار کیری کرے ہے بادہ تراب سے کب رنگ فروغ
 ترجمہ:- جب وہ اپنے لال ہونٹ جام کے خطِ پیالہ سراسر نگاہ گل جیس ہے
 کنارے پر رکھتی ہے۔ تو جام کا پانی انار
 رنگ ہو جاتا ہے۔

خوار خوشحال پہ مرگی حال دے ٹنکن کا
 راشہ گورہ پہ ایعان د لیدو سنا مری
 ترجمہ:- بے چارہ خوشحال قریب المرگ ہے اور
 نزع کی حالت میں ہے آؤ دیکھو ایمان سے
 تمہیں دیکھنے کے لیے مر رہا ہے۔

ہم دی ووژلم پخپلہ ہم بیا گورہ
 بیا پہ ما باندی تہروھی ماتم کا
 ترجمہ:- ایک تو تم نے مجھے قتل کیا اور پھر
 سینہ کو پی کرتے ہوئے میرا ہی ماتم
 کرے ہو۔

پہ زہر مہی ہسی نال نی ایر لہ دودہ سترگو غانیہ
 کہہ بلکہ نامہ اخلم نوم مہی ستا راشی پہ زہہ
 ترجمہ:- اے میری آنکھوں سے جو جھل محبوب تم
 یہ کہہ سکتے ہو تم دل میں نہیں ہے یہ تو کلام
 کہ جب دل میں تم ہی تم ہو تو آنکھوں سے تھیں کیوں ہو
 میرے دل میں اس طرح سے سرایت کر گئے ہو۔
 کہ اگر میں کوئی اور نام بکا رہا چاہوں تو بھی میری
 زبان پر حیرانی نام آ جاتا ہے۔

تل دتن ہلونہ راولو کاپرم پہہ نو کونو
 غم نی دنلوگ خورم جیری مات نہ شی پیکان
 ترجمہ:- اس ڈر سے کہ کہیں اس کے تیر کی نوک (میرے
 دھم میں) ٹوٹ نہ جائے میں اپنے تن کی ہڈیاں انگلیوں
 کی بجائے ناخنوں کی مدد سے نکالتا ہوں۔
 دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے
 ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

کلہ کلہ ہسی وخت پہہ سری راشی
 چہی دگلونو پہہ کتل نہ وی محفوظ
 ترجمہ:- انسان پر کبھی کبھی ایسا وقت بھی
 آتا ہے کہ وہ پھولوں کے دیکھنے سے محفوظ
 محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
 کہ سوج ہوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا
 نہیں ہوتا۔

ہیچ بہ منہج کبھی نیشتہ بہ خالی دوکان غوغادہ
 سا جی فکرو و کمر و بارہ وہم خوب و خیال دے
 ترجمہ:- یہ دنیا ایک ایسی خالی دوکان کی مانند ہے
 جس میں کوئی چیز موجود نہ ہو۔ جب میں نے اس
 نکتے پر سوچا تو کھلا کہ یہ سب کچھ خواب و خیال ہے۔

بہ بیمار و سترگو تل بھی کینوے شی
 د خوشحال بہ لیمو بنیہ کیندہ گستاخ
 ترجمہ:- بیمار آنکھوں پر ہمیشہ روئی کے پائے
 رکھے جاتے ہیں۔ اے گستاخ تو بھی خوشحال کی
 (بیمار) آنکھوں پر اپنے پاؤں رکھ دے۔

د لیجن بہ سترگو و تحلیل ستوری
 و عالم و تہ نہی جفی کمری جی نمر دے
 ترجمہ:- دیکھتی آنکھوں والے پرستارے روشن
 ہوئے تو زور زور سے لوگوں کو بلا کر چننا کہ سورج
 نکل آیا ہے۔

د منت دارو کہ سرم پکار می نہ دی
کہ علاج لہرہ می رانی مسیحا ہم
ترجمہ:- مجھے اپنی بیماری کے لیے منت کی دوا
قبول نہیں چاہیے میرے علاج کے لیے حضرت
عیسیٰ بذات خود شریف کیوں نہ لے آئیں۔

ورو منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا نہ انا ہوا

ما خوشحال وتہ پہ زورہ ناری اوکری
چلو ماوتہ ونبیل چھی خوشحال نشتہ
ترجمہ:- میں نے خوشحال کو نعرے لگا کر بلایا
کیونکہ کسی نے مجھے بتایا کہ خوشحال کہیں کھو گیا
ہے نظر نہیں آتا۔

اے ساکنان کوچہ دلدار دیکھنا
تم کو کہیں جو غالب آشفہ سر ملے

دیر مینی د خوشحال عقل خراب کرو
لکہ نور کلمہ ہونیار وو ہسی نہ دے
ترجمہ:- عشق کی زیادتی نے خوشحال کی عقل مار
دی ہے۔ وہ پہلے کی طرح ہوشیار نہیں رہا۔

عشق نے غالب کما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

نندار چہی چہی ورتہ گوری حیرانیہی
 باز مگر چہی پہ بازو کنہی بلا کا
 ترجمہ:- جب بازو اپنے کرب دکھاتے ہیں تو
 دیکھنے والا قماش بین حیران رہ جاتا ہے۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
 دیتے ہیں دھوکہ یہ باز مگر کھلا

ہمیشہ بہ پہ ہند نہ اوسہ خوش حالہ
 عاقبت بہ عاصی ووزی لہ جحیم
 ترجمہ:- اے خوشحال تم ہمیشہ ہندوستان میں
 (قید) نہیں رہو گے۔ انجام کار گنہ گار دوزخ
 سے نکل جائے گا۔

بیضہ آسانک بال وپر ہے یہ کج نفس
 از سر نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے

د دانش مار غٹہ می ہو مرہ پور تہ لارو
 چہی ہو ری د کتہ بازو پرواز نیستہ
 ترجمہ:- میری دانش کا پرندہ اتنی اونچائی اور رفعت
 تک پہنچ گیا ہے کہ جہاں جیم اور نمونہ بازو کی
 اذان نہیں پہنچ سکتی۔

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل ہار ہا
 میری آہ آنکھیں سے بال عطا جل گیا

زنا خوشحال کہ لانا غوارم مستحق یم

خولہ زکواۃ راگرہ د حسن لہ نصاب

ترجمہ:- حسن کے نصاب سے مجھے ایک بوسہ از

راہ زکواۃ دے دے کہ میں خوشحال اس کا مستحق

ہوں۔

چی نہ مٹی نہ معشوقہ نہ گشت د گلو

دغہ عمر دے د غم او غرامت

ترجمہ:- نہ شراب ہو۔ نہ معشوقہ ہو اور نہ ہی پھولوں

کی سیر ہو تو یہی عمر غم اور تادان کی ہے۔

کار زما او د مجنون سرہ یو رنگ دے

لکہ دود لڑکھی پہ اور کنہی سر پہ سر

ترجمہ:- میرا اور مجنون کا کام ایک ہی طرح کا

ہے۔ جیسے آگ میں جلتی ہوئی ساتھ ساتھ رکھی

ہوئی دو کڑیاں۔

راز نہی ولی، نیکارہ وہ نہہ چہ پہ دار شو

د منصور سزا سردا وہ لا بسرہ قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا یکن

ترجمہ:- منصور نے راز کی بات کیوں کھولی۔ ہم کو تقلید تک طرفی منصور نہیں

اچھا ہوا کہ اسے دار پر چڑھایا گیا۔ بلکہ اسکی سزا

تو اس سے بھی بدتر ہونی چاہیے تھی۔

د زاہد پہ صومعہ کنبی می زیرہ تنگ شو

لہ دی پستی بہ خدمت دے فروش کرم کعب میں جا بھائیں گے ناقوس

ترجمہ:- زاہد کی صحبت سے میرا دل بے زار ہو گیا اب تو پاندھا ہے دیر میں احرام

ہے۔ اس کے بعد میں اب (کسی) سے فروش کی

خدمت کروں گا۔

پہ ہر مخ کنبی نندارہ د ہغہ مخ کرم

چہ د دیر پیدایی نا پدید شہ جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود

ترجمہ:- میں ہر چیز میں اسی ایک رخِ زیبا کا پھر یہ ہنگامے خدا کیا ہے

نظارہ کرتا ہوں۔ جو کثرتِ شہود کی وجہ سے

نامشہود ہو گیا ہے۔

ہر نشہ چہی د وحدت پہ سینہ سیراب شہ

نور ہمہ جہان و دہ وتہ سراب شہ ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد

ترجمہ:- جو یہاں ایک دفعہ دریائے وحدت سے عالم تمام حلقہٴ دام خیال ہے

سیراب ہو جائے۔ تو پھر ساری دنیا اس کی نظر میں

سراب بن جاتی ہے۔

نورِ خُوکِ نشہ لاندی باندی

وارہ دے دے چہی خہ کاندی ہر چند ہر شے میں تو ہے

ترجمہ:- اس (خدا) کے سوا کوئی بھی موجود پر تجھ سی کوئی شے نہیں ہے

نہیں۔ تم کچھ بھی کرو۔ وہ سب کچھ ہے اور ہر

جگہ ہے۔

ہائے توبہ د عشق د پتو سرو لمبو نہ

نہ نہی تاؤ شتہ نہ نہی لو گھے لگی پہ تا دل مرا سوز نہاں سے بے محابہ جل گیا

ترجمہ:- ہائے توبہ عشق کے مخفی سرخ شعلوں آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

سے کہ نہ تو ان کی تپش اور نہ ہی ان کا دھواں تجھے

محسوس ہوتا ہے۔

پیری را غلہ زیون شوم کہ شد نور شد علالت شو
 چہ زہ کرم ہفتہ نہ شی ہفتہ ملک ہفتہ عالم دے
 ترجمہ:- بڑھاپے نے مجھے زخمی و بے حال کر دیا ہے
 - یا یہ کوئی اور بیماری ہے کہ جو میں چاہتا ہوں - ویسا
 نہیں ہوتا حالانکہ وہی ملک ہے اور وہی لوگ ہیں۔

چہ ہریار نہ می تر خولہ ویوست آواز
 ز رہہ وارہ عالم خورشو ہفتہ راز
 ترجمہ:- میں نے جس بھی دوست کو اپنی کوئی
 بات بتائی تو بہت جلد پوری دنیا میں میرے اس
 راز کا چہ چاہونے لگا۔

چہ لہ ہسی محبوبا خوشحال جدا شو
 د آتش لعبی نہی دور می لہ بسترا
 ترجمہ:- جب سے خوشحال اپنی محبوبہ سے
 جدا ہوا ہے۔ اسکے بستر سے آگ کے شعلے
 نکل رہے ہیں۔

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجر یار میں غالب
 کہ بے تابی سے ہر اک تار بستر خار بستر ہے

خوک چہ ستر گھن غروی لہ هغہ وارو
 ماہہ ہنو ستر گھو ہنہ نندارہ اوکری
 ترجمہ:- لوگ کرا آ نکھوں سے جو کچھ دیکھتے
 ہیں میں نے بند آنکھوں سے اُن چیزوں کا
 خوب خوب نگارا کیا۔

کلہ ناز کلہ کنخل کرہ کلہ مہر
 د خوشحالہ مروہ کہ پخلانی
 ترجمہ:- ایک بوسہ لینے پر تم خوشحال سے
 کس قدر ناراض ہو کہ کبھی ناز دکھاتی ہو کبھی
 گالی دیتی ہو تو کبھی مہربان ہو جاتی ہو۔

وہ نہی در بہ کرم بوسہ دنرو شونديو
 رانزدہی شوہ رانزدہی خورانی نہ کرہ
 ترجمہ:- محبوبہ نے مجھ سے کہا کہ تمہیں
 اپنے پہلے ہونٹوں کا بوسہ دیتی ہوں۔ وہ
 میرے نزدیک آئی اور نزدیک آئی مگر
 بوسہ نہ دیا۔

غنیہ ناگفتہ کو دور سے مت دکھا کر یوں
 بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کر یوں

عاشقی کہ سراسر وارہ بلا دہ
 ما پہ خان او زہرۂ قبولہ دا بلا کرہ
 ترجمہ:- گو کہ عاشقی سرتا پا ایک بلا ہے۔
 مگر میں نے دل و جان سے اس بلا کو قبول
 کیا۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
 درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

دانن شبہ چہ پہ خوشحال د فراق را غلہ
 وردی نہ شی ہسی سختہ پہ دشمن شبہ
 ترجمہ:- یہ جو آج خوشحال پر شب فراق آئی
 ہے۔ ایسی سخت رات خدا دشمن پر بھی نہ
 لائے۔

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب فم بری بلا ہے
 مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

گورہ کوم لوری تہ لارہ موندہ نشی
 د خوشحال د زرہ پیدا چرتہ سراغ کرہ
 ترجمہ:- دیکھنا کہاں چلا گیا ہے۔ کہیں مل نہیں
 رہا۔ ذرا خوشحال کے دل کا سراغ تو لگاؤ۔

کہتے ہونہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
 دل کہاں کہ گم کیجئے ہم نے دعا پایا

سنا د زلفو پہ تور تم کبھی می زہر ورک شو
 چہی نہی بیسا موسم ہسکارہ د مخ چراغ کمرہ
 ترجمہ:- میرا دل تیری زلفوں کے اندھیرے میں
 کہیں گم ہو گیا ہے۔ ذرا اپنے رخ کا چراغ دکھاؤ
 کہ میں اپنا دل دھونڈ سکوں۔

ہور ہا ہے جہاں میں اندھیرا
 زلف کی پھر سر رشتہ داری ہے

ہر چہی نہی د محبت پہ اور وراثہ شو
 خہ پرواہ لری د اورہ د دوزخ
 ترجمہ:- ہر کوئی جو محبت کی آگ میں جل
 چکا ہو۔ اسے دوزخ کی آگ کی کیا پرواہ۔

آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں
 سوز غمہائے نہانی اور ہے

ولہی لیچی بریندہنی تورہ اوکا پی
 کہ د خوارو د کشتن پہ آہنگ نہ دہ
 ترجمہ:- کیا اسے اپنے خوار عاشقوں کے قتل ہونے
 کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ وہ کیوں اپنی باہیں تنگی
 کر کے (میان سے) تلواریں نکال رہی ہے۔

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
 یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

غنچہ گل چہ ستاد مخ سرہ سیالی کا
 خولہ نہی باد پہ طمانچہ کمرہ فراخہ
 ترجمہ:- جس غنچہ گل نے ترے رخِ زیبا
 کی برابری کا دعویٰ کیا۔ ہوا نے ایک
 طمانچہ مار کر اس کا منہ کھول دیا۔

کہ ہر خو نہی پہ سور اور کبھی لولہ کمری
 دیاقوت داویو دار دگداز نشتہ
 ترجمہ:- ہر چند کہ تم یاقوت کو آگ کے سرخ
 شعلوں میں پھینک دو۔ اے نقصان کا کوئی
 اندیشہ نہیں۔

مغنی پہ چغانہ دی لیندہ کبیرہ
 پہ نغمو پہ پردو وغورہ ہر تار
 ترجمہ:- اے مغنی اپنا ساز سنجال اور
 اسکے ہر تار سے (نضا میں) نغمے نکھیر
 دے۔

پہ اختر پہ جمعہ خہ غرض زما
 زہ مجنون ہم سرنیولے پہ صحرا
 ترجمہ:- مجھے عید اور جمعہ سے کیا غرض
 میں تو صحرا میں سرپکڑ کر بیٹھا ہوا مجنون
 ہوں۔

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
 بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

تسرا ترسریا کہ فہم اوکھڑی
 پہ خلور کنجہ غوغا د محبت دہ
 ترجمہ:- اگر غور کرو تو بلندی اور پاتال تک
 چاروں سمت محبت کا غوغا ہے۔

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
 انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

لہ د مہر د وفا خوبونہ زدہ کمرہ
 د جفا خوبونہ دہر درخخہ شتہ
 ترجمہ:- ذرا مہر و وفا کی عادت بھی ڈال
 - مانا کہ تیرے پاس جفا کی عادتیں دافر
 مقدار میں موجود ہیں۔

بھی نکی بھی اس کے جی میں گرا جائے ہے مجھ سے
 جفا نہیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

گل چپی ستا پہ لاسو درغے تازہ شو
 لاس دی لا شرف لری دگل تر شاخ
 ترجمہ:- پھول جب تیرے ہاتھوں میں آیا تو
 ترو تازہ ہو گیا۔ تیرے ہاتھ شاخ گل سے
 زیادہ شرف رکھتے ہیں۔

گلشن کو تری صحبت از بسکہ خوش آئی ہے
 ہر غنچہ کا گل ہونا آغوش کشائی ہے

جاہل سرہ گل گشت لکہ دوزخ دی
 لہ دانا سرہ راضی یم کنیں مہی بند کا
 ترجمہ:- جاہل کے ساتھ چمن میں جانا دوزخ
 کے برابر ہے۔ (مگر) دانا کے ساتھ مجھے لہ
 میں بھی اکٹھا بند ہو جانا منظور ہے۔

فائدہ کیا سوچ آفر تو بھی ہے دانا اسد
 دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائے گا

غم نہی نہ دے پیدا کرے ہی حکمتہ
 دنا مرد او مرد تر مینخہ غم محک دے
 ترجمہ:- خدا نے غم کو بغیر کسی حکمت کے پیدا نہیں
 کیا۔ غم مرد اور نامرد میں تیز کرنے کی کسوٹی ہے۔

غم آغوش بلا میں پردش دیتا ہے عاشق کو
 چراغ روشن اپنا قلم صرصر کا مر جاں ہے

محنت سب چہ پہ احدا دود مستانو

د رندانو سرہ گنہیناست بادہ خور شو

ترجمہ:- جو محنت مستانوں کا دشمن تھا۔ وہ

شرابیوں کی صحبت میں رہ کر مے خور بن گیا۔

گلزار تہ راغلہ گلونہ چونی

تر مخ نہ دی لالہ مخ رونہی

چہ کور تہ درومی لہ گلستانہ

گل نہی لمن نیسی لالہ لستونی

ترجمہ:- وہ حیدر گلزار میں آئی اور پھول

چن رہی ہے لالہ کے پھول اسکے چہرے

کی ہمسری نہیں کر سکتے۔ جب وہ گلستاں

سے گھر واپس لوٹنا چاہتی ہے تو پھول

اسکے دامن اور لالہ اسکی آتسین سے لپٹ

جاتے ہیں کہ ہم سے جدا مت ہو۔

سائے کی طرح ساتھ پھریں سرود صنوبر

تو اس قدر دلکش سے جو گلزار میں آوے

جنت ٹخانے دہر ہیز گارو دے خوشحالہ
 لہ جنت ونہ ہوس پہ گوم عمل کری
 ترجمہ:- اے خوشحال جنت تو پر ہیز گاروں کی جگہ
 ہے۔ تم جنت کی خواہش کس عمل کی بنیاد پر کر رہے
 ہو۔

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
 شرم تم کو مگر نہیں آتی

کہ درست باغ د منبو دک و مانہ کبہ دی
 تر ہمت پوری صی خہ دے بو خستہ
 ترجمہ:- اگر شراب سے بھرا ہوا پورا باغ بھی
 میرے سامنے رکھ دو تو یہ میری ہمت کے سامنے
 ایک تنکے کی حیثیت بھی نہیں رکھتا۔

بیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
 یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سیو کیا ہے

د خوشحال قدر کہ اوس پہ ہیجا نشہ
 پس د سرگ بہ نہی یاد کما دہر عالم
 ترجمہ:- گو کہ اس وقت خوشحال کی قدر کسی کو
 نہیں لیکن موت کے بعد اسے دنیا بہت یاد
 کرے گی۔

جو چاہئے نہیں وہ مری قدر و منزلت
 میں پوسف بھیمت اول خریدہ ہوں

ماویہ زہ بدنہی عمل سرہ نسبت کرم
د دشنام نہی پہ ہل پیر دے تلذز
ترجمہ :- میں نے سوچا کہ انہیں شہد سے
نسبت دوں کیونکہ اسکی گالیوں میں ایک عجیب
طرح کی لذت ہے۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

د ماسرے تورہ نہی خہ تورہی پر بیاسی
چہی پہ زہ نہی یو گذار وی سل ہر ہار
ترجمہ :- اسکے شکوے کی تلواریں کیسے کیسے دار کرتی
ہے۔ کہ دل پر چلتی تو ایک بار ہے مگر سو زخم چھوڑ
جاتی ہے۔

پہ نیم فزہ ادا کر حق و دیت ناز
نیام پردہ زخم جگر سے نجر کھینچ

د گلزار گلونہ خہ دی راشہ محورہ
لہ گلونو خائستہ دواہ رخسار
ترجمہ :- اگر یہ دیکھنا ہو کہ گلزار کے پھول کیسے
ہوتے ہیں تو آؤ میرے یار کے دونوں رخسار
دیکھو کہ پھولوں سے زیادہ خوبصورت ہیں۔

عارض گل دیکھ روئے یار یاد آئے اسد
جو شش فصل بہاری اشتیاق انگیز ہے

خوار خوشحال نہ لکھ خس ہسی لاہو کرو
 جس د عشق سیلاب را اوخوت لہر لہر
 ترجمہ:- جب عشق کا سیلاب لہر لہر اٹھا تو بے
 چارے خوشحال کو خس کی طرح بہا کرے گیا۔

میں نے روکا رات غالب کو دگر نہ دیکھتے
 اس کے سیل گرپ میں گردوں کتب سیلاب تھا



فکرِ مخالف

خوشحال

غالب

چہ می خپل مین نیولے تر آغوش دے
د جہان ہوس می وارہ فراموش دے
ترجمہ میں نے جو اپنے محبوب کو آغوش میں لیا
ہو ہے تو ایسی حالت میں میں نے تمام دنیا کی
ہوس کو فراموش کر دیا ہے۔

کہ می شعر و شاعری سرگندولے
ما بہ دہر کہے د خپل بادشاہ صفت وو
ترجمہ:- اگر میں نے اپنی شعر و شاعری چکانی
ہوتی تو میں اپنے بادشاہ کی خوب خوب تعریفیں
کرتا۔

مزا لے کہو کیا خاک ساتھ سونے کا
رکھے جو بچ میں وہ شوخ سیم تن بکلیہ

غالب دیکھتہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
دو دن گئے جو کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

خلفہ زہد تو روزِ زلفو لیونے ہم

لا مہی بندہ پہ زنجیرو نو و ترونی
 قید میں تھی ترے وحشی کو دی زلف کی یاد
 ترجمہ :- اے لوگو میں سیاہ زلفوں کا
 ہاں کچھ اک رنج گراں پائی زنجیر بھی تھا
 دیوانہ ہوں۔ مجھے زنجیروں سے اور بھی
 کس کر باندھو۔

زم ازہ پہ دا دامن دے

غمم بادی دوارہ تیر سیدی
 بھوم غم سے یاں تک سرگونی مجھ کو حاصل ہے
 ترجمہ :- میرا دل اس لئے حوصلہ مند
 کہ تار دامن و تار نظر میں فرق مشکل ہے
 ہے کہ غم اور خوشی دونوں گذر جاتے
 ہیں۔

دوارہ شوئی دی خوبی شکر پاری دی

د گلابو گل دی دوارہ رخساری دی
 پوچھ مت رسوائی انداز استغنائے حسن
 ترجمہ :- اے محبوب! تیرے دونوں ہونٹ
 دست مرہون حنا رخسار رکنِ غارہ تھا
 شیرین شکر پارے ہیں۔ اور تیرے دونوں
 رخسار گلاب کے پھول ہیں۔

تہ محبوبا کہ شیرینہ ددی وخت نہی

زہ خوشحال داوسنی دور کو ہکن ہم

ترجمہ:- اگر تم اس وقت کی محبوبہ اور شیریں ہو

تو میں خوشحال موجودہ دور کا کوہکن ہوں۔

تجھے بغیر مرنے کا کوہکن اسد

سرکشہ، غبار رسوم و قیود تھا

زہ فرہاد دزمانی ہم

تہ شیرینہ ددی دور

ترجمہ:- میں اس زمانے کا فرہاد

ہوں۔ اور تم اس دور کی شیریں ہو۔

عشق و مزدوری عشرت مجھے خسرو کیا خوب

ہم کو منظور بگو نامی فرہاد نہیں

ددی دور شیخان دہر دی لور پہ لور
 اور نگزیب بادشاہ دوار و دیے رنخور
 پہ ہغہ چارہ قلم ساز کرہ قرآن کنسی
 پہ ہغہ چارہ شہ رنگ ہریکا د وروز
 ترجمہ:- اس دور میں ہر جاشیوخ بیمار زیادہ تعداد
 میں پائے جاتے ہیں لیکن ان میں سب سے بڑا
 شیخ خود اورنگزیب بادشاہ ہے۔ وہ جس چھری سے
 قرآن پاک لکھنے کے لیے قلم تراشتا ہے۔ اسی
 چھری سے اپنے بھائی کی شرگ بھی کاٹا ہے۔

غالب بھی گرنے ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں
 دنیا ہو یا رب اور مرا بادشاہ ہو

چہ خوشحال خنک نہی وانی پہ ہینتو زبہ خبری
 پہ فلرسی۔ زبہ بہ نہ وی کہہ یو ہیرہی سخن ہسی
 ترجمہ:- اگر تو سمجھے تو خوشحال خنک پشتو زبان میں
 جو کچھ کہتا ہے وہ فارسی زبان میں کہاں۔

فارسی میں تاپہ بینی نکشہائے رنگ رنگ
 بگوراز مجموعہ اردو کہے رنگ من است

خٹہ سختی لری خوشحالہ

دادی زردہ دیے کسہ فولاد
 ترجمہ:- اے خوشحال تم کتنے سخت
 میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
 دیکھ کر طرز چپاک الی دنیا جل گیا
 جان ہو۔ یہ تمہارا دل ہے کہ فولاد۔

د جھان غمونہ وارہ پکبني ڄاڻي شو
شڪر دا چي نبي لونبي زره واکرو و ماہم
ترجمہ:- دنیا کے تمام غم اس میں سما گئے ہیں۔
شکر ہے کہ خدا نے مجھے بڑا دل عطا کیا ہے۔

میری قسمت میں غم گرا تا تھا
دل بھی یا رب کئی ویسے ہوتے

چي پھ نوم بنی آدم دی
پھ لا تقنطوا تکبہ ده
ترجمہ:- تمام بنی آدم کا ناامید نہ
ہونے پر نگہ ہے۔

کہتے ہیں جیتے ہیں امید یہ لوگ
ہم کو بچنے کی بھی امید نہیں

د بنادی پھ امید تہ اوسد پھ غم کبني
تل پھ شپہ ہسي رادرومی ورخ پیوستہ
ترجمہ:- غم کے دوران خوشی کی امید میں رہو۔
کہ رات کے بعد ہمیشہ دن آتا ہے۔

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

ترجمہ:- "میں نے خوشحال کے دل کا
خوب تماشا کیا جو سمندر (۱) کی طرح
آگ کے شعلوں میں کہیتا ہے"

ستا دژبی د سر دہر منت را باندی
چہی دایم نہی را بر خیر دے تلذذ
ترجمہ:- تو نے جو مجھے اپنی زبان کا
بوسہ دیا ہے۔ اسکی لذت ہر دم ظاہر
ہوتی رہتی ہے۔

(۱) ایک کینز آگ میں بھی زندہ رہتا ہے۔ اور راکھ میں رہتا ہے۔

باب سوئم

تنقید

خوشحال و غالب کے چند اہم محققین و نقاد

خوشحال و غالب کے چند اہم محققین و نقاد

غالب کے چند اہم محققین و نقاد

یوں تو غالب نے اردو میں کم و بیش پانچ ہزار اشعار کہے تھے۔ لیکن ان میں سے صرف اشعارہ سو کے قریب اشعار کا انتخاب کر کے دیوان غالب چھاپ گیا۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن یہ کانٹ چھانٹ غالب نے کی تھی۔ اور اسی لیے غالب خود اپنے پہلے نقاد ٹھہرے:-

”اگر تنقید و تخلیق کی ان دو دنیاؤں کو یکجا کیا جائے اور نقاد غالب کے تنقیدی شعور کی روشنی میں شاعر کے کلام انتخاب کلام اور معیار کلام کا جائزہ لیا جائے تو یقیناً ان دونوں شخصیتوں کی یہ ملاقات مفید ہوگی۔

نقاد غالب وہ ہے جو قاتل سے دست و گریباں ہوتا ہے۔ خسرو کے سوا ہندوستان کے کسی فارسی شاعر کے ذوق پر ایمان نہیں لاتا (یہ اور بات ہے کہ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے) اور مومن اور ذوق کے اچھے اشعار پر جھوم کر اپنا سارا دیوان ایک شعر پر غار کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ خود اپنے دیوان کے متعدد بہ

جیسے پر خط نسخ کھینچ دیتا ہے۔ شاعر غالب وہ ہے جو مذاق شعر کا اس درجہ قدردان ہے کہ شیفتہ کی داد اس کے لیے حاصل کلام ہے اور فضل حق کا علم و فضل اس کے نزدیک مسلم۔

(ڈاکٹر محمد حسن ”غالب کے چند اہم نقاد“)

بعض دوسرے مخصوص حالات میں غالب کو اس وقت دوسروں کی تنقید کا نشانہ بننا پڑا جب وہ (غالب) ان دوسروں کی ادبی کاوشوں کے ناقد بنے۔ اس سلسلہ میں جو واقعہ بہت مشہور ہوا اسکی روداد پیش ہے۔ ایک دفعہ اپنی فارسی وانی کی بناء پر غالب کو کسی دوسرے مصنف کی تصنیف پر تنقید کے نتیجے میں عدالت تک جانا پڑا۔ ہوائیوں کہ جب غالب قدر کے زمانہ میں غلوٹ نشیں ہوئے تو ایسے میں کتب بینی ہی میں وقت گزارتے تھے۔

اتفاق سے فارسی کی مشہور لغت ”برہان قاطع“ پر غالب کی توجہ ہوئی۔ اور اس لغت میں ہزار ہا غلطیاں پائیں۔ ہزار ہا بیان الغلوٹ نظر آئے اور عبارت کو پوچھ پایا۔ پھر کیا تھا سو دو موافقت کے اغلاط لکھ کر ایک مجموعہ بنایا اور ”قاطع برہان“ کے نام سے ۱۸۶۲ء میں چھپوا دیا۔ اس کتاب کا شائع ہونا تھا کہ علمی دنیا میں ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ کچھ کتابیں ”قاطع برہان“ کی موافقت میں اور کچھ مخالفت میں لکھی گئیں۔ اس ضمن میں مولوی امین الدین کا رسالہ ”قاطع القاطع“ (جو قاطع برہان کی مخالفت میں لکھا گیا تھا) گالیوں سے بھرا ہوا تھا۔

تب غالب نے ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ مولوی امین الدین کے خلاف عدالت میں دائر کر دیا۔ یہ مقدمہ ۲ دسمبر ۱۸۶۷ء سے شروع ہو کر ۲۳ مارچ ۱۸۶۸ء کو راضی

نام کی صورت میں ختم ہوا۔ یہ غالب کی موت سے تقریباً ایک سال پہلے کا واقعہ ہے۔

غالب کے بعد شیفتہ غالب کے پہلے نقاد ہیں، شیفتہ اس دور میں بھی غالب کی قدر کرتے تھے۔ جب غالب کو ناقد ردانی کا سامنا تھا۔ شیفتہ روایت کے بھی قدردان تھے۔ وہ غالب کے کلام میں روایت کی خصوصیات ڈھونڈتے تھے۔ اور یوں انہیں ظہوری اور نظیری کے درجہ پر لا کھڑا کرتے۔

غالب کے اگلے نقاد ان کے شاگرد مولانا حالی تھے۔ جنہوں نے ”یادگار غالب“ لکھ کر مرزا کو زندہ جاوید کر دیا۔ اس زمانے میں مغربی علوم ہندوستانی سوسائٹی میں اپنی جگہ بن رہے تھے۔ اسی لئے حالی نیچرل شاعری کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے۔ ان دنوں ادب برائے ادب کی بجائے ادب برائے زندگی پر زور دیا جانے لگا تھا۔ اسی لیے ادب سے مقصدیت کے تقاضے کئے جا رہے تھے۔ نتیجتاً ادب کو اخلاق کی کسوٹی پر پرکھا جانے لگا۔ اس تناظر میں حالی نے غالب کے کلام کو بھی اخلاقی نکتہ نظر سے پرکھا۔ انہوں نے یہ بھی جاننے کی کوشش کی۔ کہ کیا غالب کا قوم کے نام کوئی پیغام ہے اور یہ پیغام قوم کی اصلاح کرنے میں کس طور پر ثابت ہو سکتا ہے۔ کیا ان کے کلام میں روایت کے مقابلے میں جدت مضامین ہے۔ کلام غالب کے مطالعہ سے حالی نے جانا کہ روایت کے مقابلہ میں یہ ایک دوسرا ہی عالم ہے۔ یہاں خیالات کی طرح کلی، ظرافت اور چونکا دینے والے استعارے اور کنائے اور ذومعنی اشعار پائے جاتے ہیں۔ اس میں نیا لہجہ ہے نئی فکر ہے یہاں اور ہی سماں ہے۔

ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری غالب کے وہ نقاد ہیں جنہوں نے یہ کہہ کر سب کو چونکا دیا کہ ”ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ ایک ”وید مقدس“ اور دوسری ”دیوان غالب“ کہتے ہیں کہ بجنوری نے غالب کے اردو اشعار کی تشریح و تفسیر کی ہے۔ اور انہیں اپنی فلسفیانہ فکر کے ترازو پر تولی ہے۔ اسے تنقید غالب نہیں کہہ سکتے۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن ”بجنوری کا مقدمہ تنقید غالب نہیں۔ غالب کی خدمت میں نئی نسل کا خراج عقیدت ہے“ بجنوری کے نزدیک مضامین کا تنوع اور فکر کی وسعت غالب کے کلام کا بنیادی آہنگ ہے۔

چونکہ بجنوری غالب کے کلام کے تجزیہ کو ایک خاص Climax تک لے گئے تھے۔ اس لیے ایک Anti-climax نے جنم لیا اور یہ غالب کے تیسرے نقاد ڈاکٹر سید عبداللطیف کی شکل میں منظر پر آیا۔ دراصل ڈاکٹر لطیف کا ”غالب کی شاعری“ کے عنوان سے ایک مختصر انگریزی مقالہ بجنوری کی ہیرو پرستی کے خلاف ایک مدائے احتجاج ہے۔ انہوں نے بجنوری کی رومانی طرز تنقید کو بالکل ناپسند کیا ہے اور غالب کے کلام کو پرکھنے اور اس کی شخصیت کا اندازہ لگانے کے لئے چند کڑے تنقیدی اصول قائم کئے ہیں۔ نیز انہوں نے مغربی شاعری کے چند نمونے سامنے رکھ کر غالب کے کلام کو ان پر جانچا ہے۔ ڈاکٹر لطیف کے مقالہ سے یہ چند الفاظ کتنے معنی خیز ہیں:

”کلام غالب کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ ظاہر ہوگا کہ اس کا اصلی رنگ ذاتی اور ذاتی ہے۔ زندگی بھر شاعری یہ آرزو رہی کہ وہ فکر

واکھار میں اچھوتا معلوم ہو۔ اور ایک لحاظ سے اس کا یہ مقصد پورا بھی ہوا۔ لیکن اس سے اس کی شاعری ماری گئی۔ اسکے اردو کلام میں شاعری سے زیادہ فن بلکہ صنعت گری نمایاں ہے۔ اور احساس سے زیادہ فکر و تخیل یا خیال آرائی کے آثار پائے جاتے ہیں۔“

(ڈاکٹر سید عبداللطیف ”غالب کی شاعری“)

ڈاکٹر عبداللطیف کے نزدیک غالب کے کلام کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا حصہ ان اشعار پر مشتمل ہے جن پر عقلی رنگ چڑھا کر پیش کیا گیا ہے:-
 بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
 موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا
 دوسرے حصے کے اشعار میں خیال آرائی اور ترکیب تراشی نمایاں ہیں:-
 شوق ہر رنگ رقیب سر و سماں نکلا
 قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا
 غالب کے کلام کے تیسرے حصے پر خالص وجدانی شاعری کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ کیونکہ زبان کے قلب میں جو شاعرانہ جذبہ جھلک رہا ہے۔ اس کو حقیقی طور پر شاعر نے محسوس کیا اور ان اشعار کو ہر تکلف صنعت گری سے پاکہ جولاں نہیں کرتا:-

سنجھانے دے مجھے اے نا امید کی کیا قیامت ہے

کہ دامان خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
ڈاکٹر عبداللطیف نے غالب کے کچھ اشعار کو لفظی کھیل سے زیادہ نہیں مانا اور ان میں پیش
کئے گئے تصور کو معمولی قرار دیا ہے:

ہے پرے سرحد اور اک ہے اپنا مجھ کو

قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے

عرش سے ادھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

ڈاکٹر لطیف کے انگریزی مقالہ کے آخری الفاظ یہ ہیں:-

”یہ ہے کہانی ہمارے شاعر کی۔ اس نے ایک منتشر زاویہ نگاہ کے

سایہ میں منتشر زندگی بسر کی اور ہمارے لئے ایسی شاعری چھوڑی جو

خود ہم آہنگی سے معرا ہے۔ اس کا شمار مشاہیر عالم میں نہیں ہو سکتا“

(ڈاکٹر عبداللطیف ”غالب کی شاعری“)

ڈاکٹر عبداللطیف نے کلام غالب سے متعلق اپنے خیالات کو جس نچ پر ختم کیا تھا۔ محمد اکبر ام

نے اپنے خیالات کا ڈانڈا اور پر ملا کر غالب میں فلسفیانہ یک جہتی کے عدم وجود کا جواز

”غالب نامہ“ میں یوں پیش کیا ہے:-

”ہر بڑا شاعر زندگی - اثر ڈالتا ہے۔ اور انتہائی شاعرانہ عظمت کے

معیار ہی میں انسانی زندگی کو بدلنے کی قابلیت ہوتی ہے۔ لیکن اس اثر اندازی کے لیے یہ ضروری نہیں کہ شاعر کسی معین فلسفہ زندگی یا پیغام کا حامل بھی ہو۔ یہی نہیں بلکہ دنیائے شعر میں انتہائی عظمت اکثر انہی لوگوں نے حاصل کی ہے۔ جنہوں نے انسانی عقائد اور زندگی کے فلسفوں کو تو نہیں چھوا لیکن اپنے کلام میں تخیل کی تربیت اور نشو و نما کا ایک ایسا سامان چھوڑ گئے جس سے انسانی فطرت میں ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے۔۔۔۔۔ ایک پہلو پر زور تو وہ دے جسے دوسرے پہلو نمایاں نظر نہ آتے ہوں۔“

(محمد اکرام ”غالب نامہ“)

ڈاکٹر اکرام غالب سے فلسفہ فکر کا تقاضا نہیں کرتے بلکہ اسی کمی کو غالب کے فن کا سب سے بڑا حسن قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن کے مطابق اکرام نے غالب کے مطالعے کے سلسلے میں سب سے بڑی خدمت یہ انجام دی ہے کہ ان کے کلام کو مختلف ادوار میں تقسیم کر کے ان ادوار کی بنیادی خصوصیات تلاش کیں۔ اکرام ”مرزا کے کلام کی مقبولیت کے اسباب تنوع“ تجزیہ اور طرزِ فکر کو قرار دیتے ہیں۔

مہد جدید میں غالب کے نقادوں میں فیض احمد فیض نے کلام غالب میں ایک واضح اور نمایاں وحدت کی تلاش کرتے ہوئے ”اداسی“ کو کلام غالب کی بنیادی کیفیت قرار دیا۔ اور ایک قدم آگے جاتے ہوئے اس اداسی کو ہماری پوری نسل کی اداسی سے جوڑ

دیا ہے۔

فیض کے بعد ڈاکٹر سید محمود اور قاضی عبدالغفار ہمارے عہد میں غالب کے نقاد ہیں۔ انہوں نے کلام غالب کے ڈانڈے اس کے اپنے عہد کی قومی ناہمواریوں کے ساتھ ملائے ہیں۔ ان کے بعد غالب کے جو قابل قدر نقاد منظر عام پر آئے وہ احتشام حسین اور آل احمد سرور ہیں۔

احتشام حسین نے اپنے مقالہ ”غالب کا ٹکڑا“ میں دراصل یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ غالب کے کلام کی جدت ادا اور اس میں کے لاتعداد نئے مضامین کے سماجی عوامل کیا ہو سکتے ہیں۔ احتشام کے مطابق ان وجوہات کو غالب کے سفر کلکتہ سے جوڑا جاسکتا ہے کہ غالب کو اپنے اس سفر میں وہاں کے مغربی حکمرانوں کے سرمایہ کارانہ تصورات کو جانچنے کا موقع ملا۔ غالب نے اس نظام کے خلاف جنگی عوامی طبقاتی کشمکش کا مطالعہ بھی کیا۔ اس طرح غالب کے ذہنی پس منظر اور دلی دلکھوں میں بیٹھے ہوئے ان کے ہمعصر شعراء کی ذہنی سطح میں وہ فرق پیدا ہوا جو غالب کو اپنے ہمعصروں سے ممیز کرتا ہے۔ لیکن یہ تصویر ابھی پایہ تکمیل کو نہیں پہنچی کہ حقیقتاً کلکتے کا یہ سفر واقعی غالب کے ٹکڑے میں وہ تبدیلی لاسکا جس سے ان کے کلام پر اتنے اثرات ہو سکتے تھے۔

آل احمد سرور نے کلام غالب کو صحت مند تشکیک کی کسوٹی پر پرکھا ہے۔ غالب ایسے دور میں ایک طرف ہندوستان کی پرانی سماجی قدریں بدل رہی تھیں اور ان کی جگہ بعض مقامات پر مغربی سرمایہ کاری نظام اپنے پنجے گاڑنے میں کامیاب ہو رہا تھا

غالب اپنی روایات سے مکمل طور پر کٹ بھی نہیں سکتے تھے۔ اور نہ ہی وہ مکمل طور پر نئے نظام میں اپنے آپ کو ڈھال سکتے تھے۔ انکے سامنے مستقبل کی صورت واضح نہیں تھی۔ ان عوامل کا علاج ان کے نزدیک ایک ایسے صحت مند تفکر کی صورت میں ابھرا جس میں پناہ لیتے ہوئے وہ کبھی رند کبھی فلسفی اور کبھی قلندر کے روپ میں اپنی شاعری کا کردار بنے رہے۔ ساتھ میں انکو اپنی پرانی روایات کے مٹ جانے کا شدید احساس رہا۔

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق

بے کسی ہائے تنہا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند

گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

اسلوب احمد انصاری نے کلام غالب کا عمیق مطالعہ کر کے ان کی شاعری کے چند بنیادی عناصر پر ایک پر مغز مقالہ لکھا ہے۔ ان کے مطابق یہ بنیادی عناصر مندرجہ ذیل ہیں:-

(۱) فلسفہ (۲) معینہ اقدار و تصورات (۳) کائنات

(۴) عقیدہ وحدت الوجود (۵) تفکر (۶) نکتہ افرمی

(۷) پہلو و شاعری (۸) رمز بلغ (۹) تخیل

(۱۰) قانونی اصطلاحات کا استعمال (۱۱) حسن کا احساس (۱۲) حکیمانہ مزاج

(۱۳) فکر اور جذبہ

یاد رہے کہ انصاری نے ”چند“ بنیادی عناصر کا ذکر کیا ہے۔ تمام کا ذکر ہونا بھی باقی ہے۔

ماضی قریب اور عصر حاضر میں غالب کے محققین و ناقدین میں قاضی عبدالودود، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ہمیش پرشاد مالک، رام امتیاز علی عرشی، غلام رسول مہر، مختیار الدین، حمید احمد خان اور سعید حسن رضوی کے نام سرفہرست ہیں۔ ظاہر ہے غالب جیسی نابغہ ہستی کے فن پر نقد و نظر کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔ جس کو سرانجام دینے کے لیے بیسیوں محققین و ناقدین نہ صرف اس وقت اپنے کام میں مصروف ہیں بلکہ مستقبل میں بھی یہ کام جاری رہے گا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج تک جو نقد و نظر کلام غالب کے حوالے سے ہم تک پہنچا ہے۔ اس میں ابھی کافی کھنگلی باقی ہے۔ یہ تنقید اس وقت پایہ تکمیل کو پہنچے گی جب مرزا کے اس شعر کے مطابق ہم ان کے عہد اور ان کے فن کے ارتقاء کو جان جائیں گے:

عجبینہ معنی کا ظلم اس کو سمجھئے

جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

خوشحال کے چند اہم محققین و نقاد

اس سے پہلے کہ ہم خوشحال کے اہم نقاد کا ذکر کریں یہ بتادینا مناسب ہوگا کہ خوشحال خود بھی ایک اچھے نقاد تھے۔ انہوں نے اپنے کلام میں تو قطع برید نہیں کی مگر اپنے سے پہلے اور ہمعصر شعراء و باہ پر تنقید کی۔ اس صورت حال کو ہمایوں ہمدرد نے یوں سمیٹا ہے:-

”خوشحال کی شعری عظمت اور تنقیدی سوچ ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ وہ ایک ایسے نقاد ہیں کہ خود پر بھی تنقید کرتے ہیں اور دوسروں پر بھی۔ انہوں نے اپنے عصر سے پہلے کے شعراء اور اپنے ہمعصر شعراء کے کلام میں گنجائش دیکھی تو اس پر تنقید کے تیر بر سائے۔ لیکن خوشحال کسی پر بے جا تنقید برائے تنقید نہیں کرتے۔ جو کچھ کہتے ہیں اپنی بصیرت اور آگہی کی روشنی میں کہتے اور غرہ ہو کر کہتے ہیں۔ وہ اپنی تنقید میں کسی قسم کی مصلحت اور منافقت سے کام نہیں لیتے۔ ان میں ایک اچھے نقاد کی تمام خوبیاں موجود تھیں“

(ہمایوں ہمدرد ”خوشحال خلک کا تنقیدی شعور“)

خوشحال کے تین بیٹے عبدالقادر ٹٹک، صدر خان ٹٹک اور سکندر خان ٹٹک صاحب دیوان شعراء گذرے ہیں۔ پوتوں اور پڑپوتوں میں افضل خان ٹٹک، سعید خان ٹٹک، کامگار خان ٹٹک اور کاظم خان شیدا پشتو شعر و ادب کے درخشاں ستارے تھے۔ بیٹی بی بی حلیمہ اپنے کلام کے لئے شہرت رکھتی ہے۔

خوشحال کے بیٹوں اور پوتوں پڑپوتوں کا ذکر اسلئے کیا گیا کہ ان میں سے اکثر نے اپنے باپ اور دادا (خوشحال) کے کلام پر اپنے خیالات کا اظہار اپنے اشعار میں کیا ہے۔ یہاں چند ایک کا ذکر اس لئے ضروری ہے کہ خوشحال کے بعد خوشحال کی اولاد میں بھی انکے مؤرخ، محقق اور نقاد گذرے ہیں۔

اشرف خان بھری نے خوشحال کی موت کی تاریخ اپنے فارسی قطعہ میں یوں نکالی:-

سال ہجران او اگر خواہی

موطن خیر، مجدد احسان بود

”موطن خیر“ سے خوشحال کی تاریخ وفات ۱۱۰۰ھ بمطابق ۱۶۸۹ء نکلتی ہے۔

خوشحال کے ایک اور بیٹے گوہر خان نے اپنے فارسی قطعہ میں خوشحال کی تاریخ وفات کے متعلق کہا:-

چوں ز تاریخ فوت خان خرم

شد ز مارت زیں جہاں پدرم

”ز مارت زیں جہاں پدرم“ سے بھی ۱۱۰۰ھ بمطابق ۱۶۸۹ء کی تاریخ نکلتی ہے۔

کلام خوشحال کی تعریف میں خوشحال خان کے سب سے بڑے پسر اشرف خان ہجری کا یہ شعر ملاحظہ کریں:-

تول نہی اوسپارو پہ ما سریر د نظم

ہفہ "نمر" چہ نن د خاورو پہ بستر دے

ترجمہ:- وہ سورج (خوشحال) جو کہ آج مٹی کے بستر پر ہے نظم کا سارا قلمدان مجھے سونپ گیا ہے۔

خوشحال کے ایک اور صاحب دیوان بیٹے عبدالقادر خان ٹنگ اپنے والد کی شاعری میں یوں رطب اللسان ہیں:-

دا غزل پہ پنتوڑہ چہ بیان عبدالقادر کرو

دروغڑن یم کہ "ہی خانہ" وائی بل یو پنتون ہسی

ترجمہ:- یہ غزل جو پشتو زبان میں عبدالقادر نے کہی ہے۔ مجھے جھوٹا کہنا اگر خان (خوشحال) کے علاوہ کوئی دوسرا پشتون ایسی غزل کہہ سکے۔

خوشحال خان ٹنگ کی زندگی اور فن پر جو تحقیقی کام ہوا ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر خالد ٹنگ کے مطابق "تاریخ مرصع" وہ پہلی کتاب ہے جس میں خوشحال کے قاضی پوتے افضل خان ٹنگ نے خوشحال کی زندگی کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب اب ۱۹۷۴ء میں جناب دوست محمد خان کمال کے حواشی کے ساتھ پشاور سے شائع ہوئی ہے۔ کاظم خان شیدا کی رامپور ہندوستان میں رہائش تھی۔ وہاں اس نے اپنے پر دادا

خوشحال کا نام یوں زندہ رکھا:

د پښتو شعر معلوم وو

په معنی کښي کالعدم وو

چي قلم په لاس د "خان" شو

مرتب شي لوتي ديوان شو

هر شاعر چي د افغان دے

ريزه چين د خان د خوان دے

ترجمہ:- پشتو کا شعر اصلی معنی میں معدوم تھا۔ لیکن جب خان (خوشحال) کے ہاتھ میں قلم

آیا تو ایک بہت مخیم دیوان مرتب ہوا۔ افغان (قوم) کا جو بھی شاعر ہے۔ وہ خان

(خوشحال) کے خوان کا ریزہ چمن ہے۔

مغربی مستشرقین

خوشحال خان کی اولاد کے علاوہ ان کے دوسرے نفاذ مغربی مستشرقین ہیں۔ ان میں انگریز اہل علم سرفہرست ہیں۔ جن کو اپنی حکمرانی کے دور میں کم و بیش اسی (۸۰) برس تک پشتون اقوام کے ساتھ رہے جس نے اور اس دوران پشتو زبان سیکھنے اور اس پر تحقیق و تنقید کرنے کا موقع ملا۔ یہی وجہ ہے کہ پشتو کی اولین گراہر اور ڈکشنری لکھنے کا سہرا بھی انہی مستشرقین کے سر ہے۔

”خوشحال کے احوال زندگی اور اسکے افکار پر تحقیق“ تنقید اور ترجمہ کے کام کی ابتداء مستشرقین نے کی۔ ان میں مچرا اور فی سی ای بیڈلف، ہنری ییلو پادری ہیوز، اولف کیرد اور ڈاکٹر ڈی این میکزی کے نام خصوصی ذکر کے حامل ہیں (۱)۔

(ڈاکٹر محمد اقبال نسیم خٹک ”پیش لفظ خوشحال اور جمالیات“)

”اس فہرست میں ایسٹورٹ الفنسٹن سرائیلن ہاول اور چند روسی محققین کے نام بھی شامل

(۱) نوجوان محقق محمد زبیر حسرت کی تحقیق کے مطابق ان مستشرقین کی فہرست میں جے بی ٹی ٹوور (پھونرگی)، مارگن ٹاکن (ٹاروے)، اور جنرل ایملسن (سیٹی گل) بھی شامل ہیں۔

(محمد زبیر حسرت۔ جدید پشتو ادب میں تحقیق کی صورت حال) ، تارہ جنوری۔ مارچ ۲۰۰۲ء

سمجھے جائیں۔

”خوشحال کے کلام کا انگریزی ترجمہ اور اس پر تنقید کرنے والے اولین مستشرقین میں میجر راورٹی کا مقام بہت اونچا ہے۔ میجر راورٹی نے خوشحال کے متعلق کہا ہے کہ ”مغرب کے شعراء کی طرح کوئی ایسا مضمون نہیں جو اس کے لیے بیگانہ ہو۔ شاعرانہ مضامین کے تنوع میں خوشحال خان مشرق کی نسبت مغرب کے شعراء سے نزدیک ہے اس کی شاعری کے لیے انسانی زندگی کا ہر پہلو ایک موزوں مضمون ہے۔ کیونکہ وہ انہیں قادر الکلامی کے ساتھ شاعرانہ اور ادبی رنگ میں پیش کر سکتا ہے۔ خوشحال اس صفت میں پشتو ادب کی ایک یکتا شخصیت ہے“

(سید رسول دسا ”مقدمہ ارمغان خوشحال“)

”میجر راورٹی پشتو کی متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ پشتو گرامر اور پشتو دشمنی ان ہی کی تصنیفات ہیں۔“

(شیر افضل بریکوٹی ”دبدبہ خوشحال“)

میجر راورٹی نے Selection from the poetry of the Afghans میں خوشحال کی ۹۸ منتخب نظموں اور غزلوں کا انگریزی ترجمہ ۱۸۶۲ء میں شائع کیا۔ کہا جاتا ہے کہ علامہ اقبال اسی ترجمے کے ذریعے خوشحال کے افکار سے متعارف ہوئے تھے۔ میجر راورٹی نے خوشحال کے ایک عشقیہ شعر کو انگریزی میں یوں ڈھالا ہے۔

خوشحال خٹک چہی بیا موندو لذت دیار د شونہو
 دہ وتہ نور وارہ د جہان خواہ گندیردی
 "Since khushal khattak has drunk nectar from
 the lips of his beloved all the other sweets of the
 world are to him nauseous poison"

ڈاکٹر خالد خٹک کے مطابق کیمرج یونیورسٹی کے سی ای بڈلف نے ۱۸۹۰ء میں خوشحال کے
 کلام کا دوسرا انگریزی ترجمہ کیا۔ اور Selection from the poetry of khushal
 khan khattak کے نام سے لندن سے شائع کیا۔ بڈلف نے خوشحال کے فن پر جو تبصرہ
 کیا ہے۔ وہ جناب م رشفیق کی زبانی سینے :-

”خوشحال ایک ہمہ صفت ادیب تھے۔ انکی شاعری پشتون قوم کے
 اخلاق اور زندگی کا آئینہ تھی۔ انکی شاعری احساسات، ہمت اور
 شجاعت بھرے جذبات کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ خیالات اور روحانی
 افکار کا قابل قدر مجموعہ ہے۔“

(م رشفیق ”زمانے کا غیر متند خوشحال“) تاثرہ اکتوبر- دسمبر ۲۰۰۱ء، ص ۱۳۱
 ایک اور انگریزی عالم مونت اسٹیورٹ الفنسٹن نے بھی پشتو زبان میں تحقیق کا کام کیا۔
 اس نے کلام خوشحال پر ان الفاظ میں تنقید کی ہے جس سے خوشحال کا ادبی مقام متعین ہوتا
 ہے :-

”خوشحال خان خٹک نے ایسی نظمیں تخلیق کی ہیں جن میں ہر قسم کے

اجتماعی واقعات کو جگہ دی گئی ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ خوشحال کی اپنی زندگی کی تصویر بھی منعکس ہوتی ہے۔ اسکی شاعری کے موضوعات کا سلسلہ کافی طویل ہے“

(ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک ”خوشحال خان خٹک“ ماہنامہ پشتو پشاور، خوشحال نمبر ۲۰۰۱ء، ص ۲۱)

۱۹۶۳ میں پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی کے زیر اہتمام کلام خوشحال کی سولہ منتخب غزلوں، سات قصائد اور تین قطعات کا انگریزی ترجمہ لیے ہوئے سر ایولن ہاؤیل اور سر ادا لف کیرو کی لکھی ہوئی کتاب ”دی پائٹرف آف خوشحال خان خٹک“ شائع ہوئی۔ میں چاہوں گا کہ اس انگریزی ترجمے کا ایک نمونہ دیکھنے سے پہلے سر ادا لف کیرو کی وہ تنقید دیکھیں جو اس نے (اپنی اسی کتاب میں) خوشحال کی شاعری کے بارے میں کی ہے:-

“It is worth while to dwell at some length on khushal's life and thoughts for he is a pathan of pathans. With all his weaknesses with all his vainglory, there is something splendid about the man. He compels affection and even love. And to understand him is the beginning of knowledge for him who would know pathan.

Those of his works which have come down to us consist in the main of a very large corpus of pakhto poetry of which the most

famous odes are still on the lips of every pathan.
But he also wrote in prose on subjects ranging
from religion and philosophy to sport and
falconry"

خوشحال کے کلام میں سب سے زیادہ تر غزل آفریدی قبیلے کی شاخ آدم خیل کی دو شیرازوں کے
حسن و جمال سے متعلق ہے۔ سراوانف کیر و اور سراوانف ہاؤل نے اس غزل کو بھی انگریزی
ترجمے کے لیے چنا ہے اس غزل کا انگریزی ترجمے کے لئے چنا جانا ہمارے نزدیک مثبت
تنقید کی حیثیت رکھتا ہے۔ غزل کے پہلے دو اشعار ہی سے اسکی دلکشی کا اندازہ ہو جاتا
ہے:-

آدم خیل افریدی دی سری او سپینی
پکبھی شتہ دی بنائستہ پہ رنگ رنگینی
غٹھی سترگھی لونہ بانہ فراخی وروخی
شکر لبی گل رخساری مہ جبینی

انگریزی ترجمہ:-

"Rosy and fair to the eyes are the daughters of Afridi Maids of
the Adam khel, Lovely how they are lovely Large and liquid the
eyes, brows arched, long lashes, sugar lips, Cheeks like
flowers, foreheads as bright as the moon"

اردو ترجمہ:-

آدم خیل افریدی دوشیزائیں سرخ و سپید ہیں۔ ان میں خوبصورت اور یکن صورت والی پائی جاتی ہیں۔ بڑی بڑی آنکھوں، لمبی لمبی پھنوس اور فراخ ابروؤں والی، شکر لب، گل رخسار اور ماہ جمین“

ایک اور مستشرق N. Mackenzi ا تھے جس نے Poems from the Diwan of khushal khan khattak کے نام سے خوشحال بابا کے چیدہ چیدہ کلام کا ترجمہ ۱۹۶۵ء میں لندن سے شائع کیا۔ اور یوں خوشحال کے کلام کو مغرب میں متعارف کروایا۔

افغانستان میں خوشحال کے محققین اور نقاد

انگریزوں اور دوسرے مغربی مستشرقین کے علاوہ افغانستان کے محققین اور نقادوں نے خوشحال بابا پر جو قابل قدر کام کیا ہے اس کا تفصیلی جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔ ان محققین اور نقادوں میں علامہ عبدالحی حبیبی، گل باچا الفت، عبدالرؤف بیضا، صدیق اللہ رحمان، عبدالشکور رشاد، قیام الدین خادم، محمد اکبر مہمند، محمد شیرین سنگوی، خوشگیا نی، عبداللہ بخانی، ڈاکٹر دولت محمد لودین، ڈاکٹر عارف عثمان، حبیب اللہ رفیع، زرین انور، ڈاکٹر گل محمد نوروزی اور نوجوان محقق بیواہل شامل ہیں۔ ان سب نے خوشحال پر جو کتابیں مقالے اور مضامین لکھے ہیں۔ وہ بے مثال ہیں۔ ان کے ادبی کام کی نوعیت ایسی ہے کہ ان کی وجہ سے پشتون قوم خوشحال خان کے نام اور کام دونوں پر ہمیشہ کے لیے ناز کر سکتی ہے۔ ڈاکٹر خالد خان خٹک کے مطابق ان ادبی کاوشوں کی تفصیل درج ذیل ہے:-

(۱) ۱۹۳۸ء میں علامہ آقائے حبیبی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ”خوشحال ملفطزے“

(خوشحال کے موقی) کے نام سے خوشحال کا مکمل دیوان دو جلدوں میں شائع کیا۔

(۲) ۱۹۵۰ء میں ”خوشحال خان خٹک خٹہ وائی“ کے عنوان سے عبدالرؤف

بیضا نے خوشحال خان کے فن پر پہلی تحقیقی کتاب کا بل سے شائع کی۔

(۳) ۱۹۵۳ء میں خوشحال خان کی تصانیف طب نامہ اور باز نامہ پشتو اکٹھی کابل نے شائع کیں۔

(۴) ۱۹۵۸ء میں عبدالرؤف بینو نے ”خوشحال اوپسرے“ نامی کتاب کابل سے شائع کی اس کتاب میں خوشحال خان خٹک کے بہار سے متعلق اشعار کو اکٹھا کیا گیا ہے۔

(۵) افغانستان کے مشہور ادیب گل باچا الفت نے خوشحال کے فن اور شخصیت پر ”ملی قہرمان“ نامی کتاب ۱۹۶۵ء میں کابل سے شائع کی۔ گل باچا الفت کے ایک مقالے سے یہ اقتباس دیکھیے:-

”فردوسی نے اگر اپنی مادری زبان فارسی کی خدمت کی ہے تو اس سے زیادہ خدمت خوشحال خان خٹک نے اپنی مادری زبان پشتو کی ترقی کے لیے کی ہے۔ کلچر اور تہذیب اسی وقت ترقی کر سکتے ہیں جب ان میں فردوسی اور خوشحال جیسے زبان دان پیدا ہوں“

(۶) افغان محقق صدیق اللہ رشیدین نے اپنی شاہکار کتاب ”تاریخ پشتو ادب“ میں خوشحال اور اسکی اولاد کی علمی اور ادبی خدمات کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ فاضل محقق نے خوشحال کی تین کتابیں باز نامہ طب نامہ اور فضل نامہ بھی چھپوانے کا اہتمام کیا اور اس طرح پشتون قوم کو خوشحال خان خٹک کی تعلیمات سے روشناس کرایا۔

(۷) محترمہ معصومہ عصمتی کی خوشحال خان پر فارسی میں تحقیقی کتاب ”خوشحال خان خٹک کیست“ بھی افغانستان میں شائع ہوئی۔

(ڈاکٹر خالد خان خلک۔ خوشحالیات ”خوشحال نامہ“)

افغانستان کے گل محمد نوروزی نے خوشحال کی زندگی کے ادبی آثار اور ادبی خدمات پر مقالہ لکھ کر ماسکو یونیورسٹی سے ۱۹۶۹ء میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔

نوجوان افغان محقق اور نقاد ہیوادل نے خوشحال بابا کی کتاب ”فراق نامہ“ چھپوائی ہے۔ اس کتاب سے مغلوں کی قید و بند میں خوشحال پر روارکھی جانے والی سختیوں کا پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب خوشحال نے اسی قید و بند کے دوران رخصتور (بچے پور) اور دلی میں لکھی۔ فراق نامہ سے غزل کے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔ غزل کے مقطع سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزل دلی میں نظر بندی کے دوران لکھی گئی تھی:-

د فراق غمونه لور پہ لور انبار دی

پہ کاغذ بانندی د کوم یوہ حساب کنیم

کہ د خوہ خاطر لہ حال چاتہ کنبل کرم

ہما آہونہ یا آریا بہ عذاب کنیم

ما خوشحال پہ خوب دا حال لیدلے نہ وو

چی بہ دا د غم بیتونہ پہ پنجاب کنیم

ترجمہ:- ہر طرف ڈھیر کے ڈھیر جدائی کے غم ہیں

اب میں کاغذ پر کن کن کا حساب لکھوں

اگر میں اپنے دلی کا حال کسی کو لکھوں

تو یا اپنی آؤ فریاد یا ورد کا بیان ہی لکھوں گا
مجھ خوشحال نے تو یہ حال کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا
کہ غم کے یہ اشعار میں پنجاب میں بیٹھ کر لکھوں گا۔

برصغیر پاک و ہند میں خوشحال کے محققین اور نقاد

بیسویں صدی کے دوران علامہ اقبال برصغیر پاک و ہند کے وہ پہلے مسلمان نقاد
ہیں۔ جنہوں نے خوشحال کی شخصیت اور کلام سے متاثر ہو کر انکی شاعری کی تعریف کی اور
انہوں نے خوشحال کے متعلق جاوید نامہ میں جو کچھ فرمایا ہم اسے علامہ اقبال کی طرف سے
خوشحال کی شخصیت اور کلام پر انکی تنقید سمجھتے ہیں:-

خوش سرو آں شاعر افغان شناس

آں کہ جند باز گوید بے ہراس

آں حکیم ملت افغانیاں

آں طبیب ملت افغانیاں

راز قومی دید و بے باکانہ گفت

حرف حق با شوخی دندانہ گفت

علامہ اقبال نے کلام خوشحال کو برصغیر کے انگریزی دان طبقے میں متعارف کرانے کے لیے حیدرآباد دکن سے شائع ہونے والے انگریزی مجلہ ”اسلامک کلچر“ میں ایک مضمون بعنوان ”The Afghan Warrior poet“ چھپوایا۔ اس مضمون میں خوشحال کی شاعری اور شخصیت پر اپنی رائے کا اظہار علامہ اقبال نے یوں کیا:-

”خوشحال خان کی شاعری میں ابتدائی عرب شاعری کی روح کارفرما نظر آتی ہے۔ جب ہم اس کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم اس میں بیان کی فطری اصلیت و صداقت کو واضح شکل میں دیکھتے ہیں۔ اس میں عرب شاعری کی طرح آزادی اور جنگ سے محبت کا اظہار ملتا ہے اور زندگی کے بارے میں نقطہ نظر اور تنقید کا رنگ و جھنگ بھی ویسا ہی نظر آتا ہے“

لاہور کی ریسرچ سکا لرحترمہ خدیجہ فیروز الدین نے علامہ اقبال کے کہنے پر خوشحال کی شخصیت اور فن پر مقالہ لکھ کر پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۳۰ء میں ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔

بیسویں صدی ہی کے دوران صوبہ سرحد میں خوشحال کے سب سے پہلے مسلمان محقق اور نقاد ہونے کا سہرا جناب دوست محمد خان کامل مرحوم کے سر ہے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ خوشحال کے کلام کے قلمی نسخے ڈھونڈ کر اکٹھے کئے بلکہ ان کے ذریعے کلیات خوشحال خان مرتب کر کے ایک بڑے مفرد مقدمہ کے ساتھ چھپوایا۔ کامل صاحب نے خوشحال کی

شخصیت اور کلام پر کتابیں اور مقالے لکھے۔ اور تبصرے بھی کئے۔ ان کے علاوہ انہوں نے اردو میں فن و حیات خوشحال خان خٹک پر اپنی شہرہ آفاق کتاب ۱۹۵۲ء میں شائع کی۔ جس میں ان کے کلام کا اردو ترجمہ بھی شامل ہے۔ خوشحال خان کے متعلق خارجی روپیہ کو عنوان بناتے ہوئے انہوں نے انگریزی میں ایک مدلل اور سیر حاصل کتاب : "On A Foreign Approach to Khushal Khan Khattak" لکھی۔ پشتو زبان کے متعلق خوشحال بابا کے احساسات کا ذکر جناب کامل صاحب نے اپنے ایک پشتو مقالہ میں یوں کیا ہے:- ترجمہ:-

”اس آگہی اور احساسات کا مالک اپنی قوم کی زندگی میں زبان کی ترقی، ادبی تحقیق اور ثقافتی سرمائے کے وجود اور اس کو بڑھا دینے کی اہمیت سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ علم و آگہی سے محبت اور ان کی تحقیق، قوم کی تہذیب و تمدن اور ادبی و ثقافتی ترقی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ محبت جتنی بڑھتی جاتی ہے اور محبت کرنے والا ترقی کرتا جاتا ہے اتنا ہی تہذیب و تمدن، ادب اور ثقافت بھی پھیلتے جاتے ہیں اور ہر قوم کی تہذیب، معاشرہ اور کلچر اپنی زبان کے ساتھ بچھ کر رہے ہیں۔ قوموں کی اجتماعی زندگی اور اس حقیقت کا احساس و شعور اور اس پر دو ٹوک عمل خوشحال خان کے ادبی آثار میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے ہم محسوس کر سکتے ہیں کہ وہ پشتو زبان اور

ادب کی اپنی ریت قائم کرنے اور انہیں ترقی دینے کی شعوری کوشش کرتے ہیں۔ اور انکی ضرورت و اہمیت کو محسوس کرتے ہیں۔ وہ خود پشتو زبان کی محبت میں جھلا ہیں اور پوری قوم کو اپنے ہمراہ اس محبت میں جھلا دیکھنا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ انکے ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے:-

اردو ترجمہ:- مجھے فارسی شعر کہنا بھی آتا ہے میں پشتو اور فارسی دونوں کا سلیقہ رکھتا ہوں۔ لیکن میں نے پشتو کو فارسی پر اس لئے فوقیت دی کیونکہ ہر شخص کو اپنے لوگ پسند ہوتے ہیں“

”میں نے پشتو کو رمز‘ مضمون‘ نزاکت اور تہذیب میں عین فارسی تک پہنچا دیا ہے“

”میرا ہر کلام چاہے آو رد ہو یا الہام میں نے اسے بحر کی تقطیع میں بند کر دیا ہے“

”جب میں نے پشتو زبان پر اپنا علم بلند کیا تو گویا باتوں کا ملک اپنے گھوڑے کی ٹاپوں سے فتح کیا“

(دوست محمد کامل ”خوشحالی ادب میں ملی شعور“ تاثرہ اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۱ء)

خوشحال خان خٹک کے ایک اور مشہور مؤرخ اور نقاد جناب سید رسول رساجیں۔ انہوں نے خوشحال کی بیشتر منظوم تصانیف کو یکجا کر کے ایک ضخیم کتاب کی صورت میں ”ارمغان

خوشحال“ کے نام سے ۱۹۶۳ء میں شائع کیا۔ جس کے ساتھ ۱۳۳ صفحے کا ایک طویل مقدمہ بھی شامل ہے۔ یہ مقدمہ لکھ کر جناب سید رسول رسا نے نہ صرف خوشحال کی زندگی کے حالات کو آنے والی نسلوں کی آگہی کے لیے قلمبند کر دیا ہے بلکہ خوشحال کے فن پر اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔

اس کے بعد ہم جس نقاد کا ذکر کریں گے۔ وہ پشتو کے معروف ادیب جناب فضل حق شیدا تھے۔ انہوں نے خوشحال کے فن پر متعدد مقالے سپرد قلم کئے۔ وہ خوشحال کے فن میں انکی حماسی شاعری پر گراں قدر خیالات کا اظہار کرنے کی وجہ سے یاد رکھے جائیں گے۔

استاد محترم پروفیسر تقویم الحق کا کاخیل مرحوم خوشحال بابا کی شخصیت اور فن پر ایک مستند محقق اور نقاد تھے۔ انہوں نے خاص طور سے خوشحال بابا کے تصور جمال پر تحقیق و تنقید کی ہے۔ ان کا پر مضر مقالہ ”خوشحال خان کا تصور جمال“ ان ہی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

جناب امیر حمزہ خان شنواری مرحوم عصر حاضر کی پشتو شاعری خاص طور پر غزل کے میدان کا ایک قابل قدر نام ہے۔ شاعری کے علاوہ وہ فلسفہ اور تصوف پر بھی ایک مستند حیثیت کے مالک تھے۔ انہوں نے خوشحال بابا کی شاعری میں تصوف پر نہ صرف تحقیق کی بلکہ انکے فلسفہ وحدت الوجود پر کبے گئے ایک صوفیانہ شعر پر ایک پوری کتاب لکھ ڈالی۔ جو ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی۔

ڈاکٹر سید انوار الحق نے خوشحال بابا کی غزلیات، قصائد، رباعیات، قطعات، متفرقات اور انکی دیگر تصنیفات یعنی فضل نامہ، باز نامہ اور سوات نامہ وغیرہ سے چیدہ چیدہ کلام کا انتخاب

کر کے پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی کے زیر اہتمام ”منتخب خوشحال خان خٹک معہ اردو ترجمہ“ چھپوا کر پشتو دان طبقہ سے زیادہ اردو دان طبقہ کی خدمت سرانجام دی ہے۔ اور یوں وہ پشتو اردو اتحاد کے سفیر کے طور پر ابھرے ہیں۔ خوشحال بابا کے کلام پیغام اور فلسفے سے آگاہی کے لیے اس کتاب کا مطالعہ خاص طور سے اردو دان حضرات کے لیے مفید ثابت ہوگا۔

خوشحالیات کی ترویج و توسیع میں میر عبد الصمد خان افریدی کی خدمات کو ہمیشہ گراں قدر نظروں سے دیکھا جائے گا۔ انہوں نے اپنی شہرہ آفاق اردو کتاب ”خوشحال و اقبال“ لکھ کر نہ صرف خوشحال بابا اور علامہ اقبال کی شخصیتوں اور فن کا قابل قدر موازنہ کیا ہے بلکہ اپنی اس کتاب کے ذریعے اپنے اہل وطن پاکستانیوں کے تشخص اور جذبہ اتحاد کو مزید مستحکم کرنے کی سعی بھی کی ہے۔ جس میں وہ خاصے کامیاب رہے ہیں۔ اور یوں اردو دان طبقہ کو خوشحال اور پشتو دان طبقہ کو اقبال سے نہایت متاثر کن طریقے سے روشناس کرایا ہے۔ میر عبد الصمد خان افریدی کی دوسری تصنیف ”تعلیمات خوشحال“ بھی اردو میں لکھی گئی۔ اس کتاب میں خوشحال کے افکار اور تعلیمات کی وضاحت کی گئی ہے۔

اہل پاکستان کی جانی پہچانی شخصیت جناب پروفیسر پریشان خٹک مرحوم نے خٹک ہونے کے ناطے پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی کے سربراہ بکر اور ایک قدم آگے بڑھ کر اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد کے صدر نشین کی حیثیت سے خوشحال بابا کی شخصیت اور فن کو اجاگر کرنے کے لیے از حد کاوشیں کیں۔ تحقیق کے علاوہ خوشحال خان پر انکے

مقالات اور تصانیف موجود ہیں۔ انکی ”پشتو شاعری کی تاریخ (ایک تحقیقی جائزہ)“ نامی کتاب اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد نے جنوری ۱۹۸۸ء میں چھاپی۔ اس کتاب میں پریشان خٹک مرحوم نے ”گوشہ خوشحال خان خٹک“ کے عنوان سے ہمارے عظیم شاعر کی زندگی اور فکر و فن پر ایک خصوصی مقالہ سپر قلم کیا ہے جو خوشحالیات کے سلسلہ میں مطالعہ کے لیے ایک خاصے کی تحریر ہے۔ اسکے علاوہ خوشحال بابا کی تین سو سالہ برسی کے موقع پر ۲۹، ۳۰، ۳۱ مارچ ۱۹۸۰ء کو اباسین آرٹس کونسل پشاور کے زیر اہتمام جو قومی مجلس مذاکرہ منعقد کی گئی۔ اس میں پڑھے گئے مقالات کو پریشان خٹک مرحوم نے جناب خاطر غزنوی مرحوم کی معاونت میں ترتیب دیکر ”خوشحال نامہ“ کے عنوان سے کتابی صورت میں چھپوایا۔ اس کتاب میں شامل انکے مقالے ”خوشحال بابا“ کی آخری سطروں سے یہ اقتباس قابل غور ہے:-

”مراد کہنے سے یہ ہے کہ اسے (خوشحال بابا کو) ایک مختصر مقالے میں متعارف کرنا کیسے ممکن ہے۔ جسکے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ فطرت کی خوبصورتی کے بیان میں ہومر، رزم میں فردوسی، اخلاق میں سعدی، عشق و تصوف میں حافظ، فلسفہ میں خیام، عشرت میں بونو اس اور فصاحت میں حضرت حسان کا تابع ہونے کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت کچھ ہے اور پھر یہ کہ صرف فردوسی نہیں خود رستم بھی ہے اور سب سے بڑی بات کہ جو کہتا ہے وہی کرتا ہے اور جو کرتا ہے وہی کہتا ہے۔

وہ ایک ایسا آفاقی شاعر ہے جسکی نظیر دنیا میں بہت کم نظر میں آتی ہے۔ لیکن ابھی تک دنیا والوں نے خوشحال خان کو وہ مقام کیوں نہیں دیا جو اس کا حق ہے۔ حالانکہ اس کا خیال تھا:-

د خوشحال قدر کہ اوس پہ ہیچا نشستہ
پس لہ مرگہ بہ نہی یاد کا دیر عالم
ترجمہ:- ”خوشحال کی اب اگر کوئی قدر نہیں کرتا۔ موت کے بعد ایک
عالم اس کو یاد کرے گا“

لیکن ایسا ہوا نہیں۔ اسلئے میں نے اپنے شعر میں اسے یوں مخاطب کیا ہے:-

قصور کیا ہے ترا جو کبھی معاف نہ ہو
زمانہ تجھ سے ہمیشہ نظر چراتا رہا
کسی نے سنا نہ چاہا کوئی سمجھ نہ سکا
میں تمیں سال تیری داستاں سناتا رہا“

پروفیسر پریشان خٹک کے بھائی حاجی پر دل خان خٹک بھی خوشحالیات کے میدان میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انہوں نے پشتو اکیڈمی پشاور کے خوشحال ریسرچ سیل میں جو تحقیقی خدمات سرانجام دی ہیں وہ ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ انہوں نے خوشحال خٹک کی کتاب ”دستار نامہ“ کی تالیف کر کے ۱۹۹۱ء میں پشتو اکیڈمی سے شائع کیا۔ علاوہ ازیں حاجی پر دل مرحوم نے ”پشتو شاعری قدیم و جدید شعراء“ میں بھی خوشحال کے فن پر مفید

روشنی ڈالی ہے انہوں نے پہلی پشتو اردو لغت کی ترتیب و تدوین کر کے مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے زیر اہتمام شائع کروائی۔ انکی ادبی خدمات کی وجہ سے انہیں تین سال کے لیے R.C.D پروگرام کے تحت ترکی میں مزید تحقیقی کام کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

جناب فارغ بخاری اور رضا ہدائی نے ۱۹۸۰ء میں ”خوشحال خان خٹک۔ تلاش اور مظلوم ترجمہ“ کے نام سے اپنی اردو کتاب لوک ورثہ اشاعت گھر اسلام آباد سے شائع کی۔ اس کتاب میں خوشحال بابا کے کلام کی تمام اصناف یعنی غزلیات، نظمیں، رباعیات و قطعات، حمد، نعت اور منقبت سے چیدہ اشعار کا اردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ اسکے علاوہ باز نامہ، جنسیات اور باز و شاہین سے متعلق خوشحال بابا کے اشعار کا اردو ترجمہ بھی شامل کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر سید مرتضیٰ جعفری نے خوشحال بابا کی فارسی شاعری پر تحقیق کرتے ہوئے ان کے کم و بیش دو اڑھائی سو فارسی اشعار پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ یہ فارسی اشعار خوشحال بابا کے پشتو دیوان ہی کا حصہ ہیں۔ ڈاکٹر جعفری فرماتے ہیں:-

”خوشحال خان خٹک کے ضخیم دیوان میں صرف پچیس فارسی غزلیں دستیاب ہوئیں ہیں۔ جس میں اشعار کی مجموعی تعداد کم و بیش دو اڑھائی سو کے لگ بھگ بنتی ہے۔ لیکن اس قدر کم شعر کہہ کر بھی خان نے فارسی ادب میں اپنے لئے ایک ایسا مقام پیدا کیا جس کی ایرانی ناقد بھی تائید کرتے ہیں۔“

(ڈاکٹر سید مرتضیٰ جعفری "خوشحال بابا کی فارسی شاعری")

پشتو کے نامور محقق جناب ہمیش خلیل نے خوشحال بابا کی تصنیف "اخلاق نامہ" کی ترویج و تدوین کر کے کتابی صورت میں چھپوایا۔

جناب خاطر غزنوی نے خوشحال بابا کی نثری تحریر "دستار نامہ" کا اردو ترجمہ بمبہ تہرہ ۱۹۸۰ء میں پشتو اکیڈمی پشاور کے زیر اہتمام شائع کیا۔ اس کتاب میں جناب خاطر غزنوی نے خوشحال بابا کی نثر پر سیر حاصل تبصرہ بھی کیا ہے۔ اور یوں خوشحال بابا کو جدید پشتو نثر کا بانی کہا ہے۔

جناب قلندر مومنند خوشحالیات کے میدان میں ایک نقاد کی حیثیت سے یاد رکھے جائینگے۔ ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک اور محسن احسان نے رباعیات خوشحال کا منظوم اردو ترجمہ کر کے ایک یادگار ادبی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اسکے علاوہ بھی ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک خوشحالیات پر ایک ماہر اور اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی کے صدر نقشین کی حیثیت سے بھی خوشحال بابا کی شخصیت اور فن کو اجاگر کرنے کے لیے انتھک کام کیا ہے۔ اس ضمن میں ان کے پُر مغز مقالے یادگار حیثیت رکھتے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر اقبال نسیم خٹک اپنی مشہور تحقیقی کتاب "خوشحال اور جمالیات" (خوشحال اور جمالیات) کے لیے یاد رکھے جائینگے۔ یہ کتاب دراصل ڈاکٹر صاحب کی پی ایچ ڈی کے لیے لکھی گئی تھیسس کی کتابی صورت ہے۔ یہ کتاب خوشحال ریسرچ سِل پشتو اکیڈمی پشاور کے زیر اہتمام ۱۹۸۷ء میں شائع کی گئی۔ اس کتاب میں خوشحال کے تصور جمال کے علاوہ

انکے فن پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

پروفیسر نواز حائر نے ڈائریکٹر پشتو اکیڈمی پشاور کی حیثیت سے تاریخ ادبیات پشتو کی تالیف کر کے ”رودنی ادب“ کے نام سے ۱۹۸۷ء میں شائع کی۔ اس کتاب میں بھی خوشحال بابا کے فن پر ادبی بحث کی گئی ہے۔

خوشحال بابا کی تصنیف ”سوات نامہ“ کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر کلکیل احمد نے پشتو اکیڈمی پشاور کے زیر اہتمام کتابی صورت میں شائع کیا۔ ویجاچہ ڈاکٹر راج دلی شاہ خٹک نے انگریزی میں سپرد قلم کیا ہے۔

جناب شیر افضل خان بریکوٹی نے ”ویدہ خوشحال“ کے نام سے خوشحال خان کے فن پر کتاب ۱۹۹۵ء میں شائع کی۔ اس کتاب میں خوشحال بابا کی حقیقی اور مجازی شاعری پر سیر حاصل بحث خوشحال بابا کے اشعار کی روشنی میں کی گئی ہے۔

ناپاسی ہوگی اگر اس باب میں جناب ڈاکٹر وردیش خان یوسف زئی کی ان تحقیقی کاوشوں کا ذکر نہ کیا جائے جن کے نتیجے میں انکا پر مغز پشتو مقالہ بعنوان ”غالب اور خوشحال“ (غالب اور خوشحال) پشتو سہ ماہی مجلہ ”تاتارہ“ پشاور اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۰۱ء میں چھپ کر اہل نظر کے سامنے آیا۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی دس سال سے زیادہ عرصہ پر محیط تحقیقی عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔ اس میں غالب و خوشحال کے چیدہ چیدہ اشعار کی روشنی میں دونوں تاجہ شعراء کے فن کا موازنہ کیا گیا ہے۔

خوشحالیات کے میدان میں ڈاکٹر خالد خان کے مضامین اور مقالات پڑھنے کی حامل

تحریریں ہیں۔ انکی تحقیق کا دائرہ ویرش میوزیم لاہور بری لندن تک پھیلا ہوا ہے۔

ان کے علاوہ خوشحال خان خٹک پر متعدد معزز اہل قلم کے نام تحقیق و تحریر کے سلسلے میں لئے جانے کے قابل ہیں۔ ان میں جناب پروفیسر ڈاکٹر اعظم اعظم پروفیسر افضل رضا مرحوم جناب نواز خٹک جناب عقاب خٹک جناب حمد اللہ جان بگل جناب سلیم راز جناب داود خان داؤد پروفیسر نعیم تقویٰ محترمہ پروفیسر ڈاکٹر سلٹی شاہین جناب محمد پرویش شاہین جناب پروفیسر محمد قاسم مظہر جناب ہمایون ہما محترمہ ڈاکٹر بی بی مریم جناب روحان یوسفزئی اور نوجوان محقق ڈاکٹر زبیر حسرت شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بھی دوسرے معزز ادباء ہو گئے جو خوشحال کے فن پر کام کر رہے ہیں۔ میں ان سب سے معذرت خواہ ہوں۔ اگر اس ضمن میں انکے اسمائے گرامی اور انکے کام سے متعلق یہاں پڑ کر نہ کیا گیا ہو۔

خوشحال بابا کے ایک قابل قدر نقاد جناب پروفیسر محمد قاسم مظہر ہیں۔ انکی تنقید میں سے ایک اقتباس پر یہ مضمون ختم کرتے ہیں۔ اس اقتباس میں آپکو غالب کے مشہور نقاد ڈاکٹر سید عبداللطیف کارنگ چھلکا نظر آئے گا:-

”اگرچہ پشتون ادیبوں اور باہر کے لوگوں نے خوشحال خان کے متعلق بیسویں صدی کے دوران منائی گئی برسیوں میں تاریخی انکشافات کئے ہیں اور انکی تاریخی شخصیت اور ادبی خدمات کو کما حقہ منظر عام پر لائے ہیں۔ لیکن پھر بھی خوشحال کی متنوع شخصیت اور تاریخی اقدامات اس سے بھی زیادہ انکشافات کے متقاضی ہیں۔

کیونکہ کچھ وقت کے لیے منطقی استدلال کے زور پر نکلے گئے
چند مقالے بعض لوگوں پر پیشکش کے کمال کے زور پر اتنا اثر ڈال
چکے ہیں کہ ان کو صحیح سمجھا جائے۔ بعض دوسرے ادیبوں نے جوابی
کاروائی کے زور پر نہ صرف اس استدلال کو رد کیا ہے۔ بلکہ تحقیق کا
رخ دوسری طرف موڑ دیا ہے۔ اس مثبت اور منفی عمل سے کم از کم یہ ہوا
کہ ادباء کو مجبور ہونا پڑا کہ خوشحال خان کو صحیح طریقہ پر ایک طرف تو
ما فوق الفطرت عالم بالا سے نیچے لایا جائے اور دوسری طرف تحت
الارض میں گرانے سے بچایا جائے۔ تاکہ وہ زمین کی سطح پر اچھے
برے، علم و فہم، کامیابیوں اور ناکامیوں کے ساتھ جڑ کر ایک ہوشمند
باخبر اور انسانی زندگی کے ترجمان مفکر کے طور پر سامنے آئے۔“

(پروفیسر محمد قاسم مظہر ”خوشحال خان خٹک“ خوشحال مطالعہ، ص ۱۳۰، ۱۳۱)

موازنہ خوشحال وغالب

تلخیص

اس کتاب کے سارے مضامین کا مطالعہ کرنے کے بعد اب ہم ایسے مقام پر کھڑے ہیں جہاں خوشحال وغالب کی شخصیت و فن کا ایک خصوصی موازنہ کر سکیں۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ شخصیت و فن کے لحاظ سے ان نابہ شعراء میں قدر موافق بھی پائی جاتی ہے اور قدر تفاوت بھی۔ اس لئے ان اقدار پر تفصیل سے نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

شخصیت کے لحاظ سے خوشحال وغالب میں بہت سے پہلو ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ ان میں یہ حقائق شامل ہیں کہ ہماری یہ دونوں نابہ روزگار بستیاں مغلیہ دور میں ہو گزاری ہیں گو کہ دونوں کے ادوار میں لگ بھگ پونے دو صدیوں کا فاصلہ جائل ہے۔ دونوں دربار مغلیہ سے منسلک رہے۔ بچپن میں دونوں نے نوابانہ ماحول اور ناز و نعم میں پرورش پائی۔ دونوں کتب سے باہر کے ماحول میں خوش رہے۔ دونوں کو تعلیمی اور فکری استعداد بڑھانے کے لئے اچھے اساتذہ میسر آئے۔ اگر خوشحال نے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی اور شاہ اولیس ملتانی جیسے جید اساتذہ سے استفادہ کیا تو غالب کو ملا عبدالصمد کی صورت میں ایک نہایت عالم و فاضل استاد ملا۔ خوشحال کے والد شہباز خان میدان جنگ میں زخمی ہو کر وفات پا گئے تھے تو غالب کے والد عبداللہ بیک خان نے بھی میدان جنگ

میں لڑتے ہوئے وفات پائی۔ خوشحال وغالب دونوں کو اپنے اپنے خاندانوں اور آباء کی پہہ گری پر ناز تھا۔ دونوں کو مقلیدہ دربار سے خلعتیں اور نقد انعامات عطا کئے گئے۔ دونوں نے اپنے اپنے جائے مولود سے دور کئی مقامات کے سفر اختیار کئے۔ دونوں بااخلاق انسان تھے اور دوستوں کو عزیز رکھتے تھے۔ دونوں نے چھوٹی عمر میں شاعری شروع کی اور دونوں کی شادیاں نسبتاً جلدی کر دی گئی تھیں۔

دونوں نے آخری عمر میں اس بات کا شکوکہ کیا کہ انکے فن کی قدر و منزلت ان کی امیدوں کے مطابق نہیں ہوئی۔ دونوں نے چٹنگوئی کی کہ انکی موت کے بعد انکے فن کو تمام عالم میں سراہا جائے گا۔ ان دونوں پر اپنے اپنے حالات کے پیش نظر بڑھاپے میں ابتلاء کا دور آیا۔ اگر خوشحال کو انکے علاقہ میں قحط و خشک سالی کے دوران اپنے عزیز واقارب کی وفات کا صدمہ سہنا پڑا اور اپنے جواں سال اور چہیتے بیٹے نظام کی موت نے انہیں غمگین کیا تو غالب کو ندر کی صعوبتوں، عزیز واقارب کے قتل اور اپنے اکلوتے بھائی کی موت جیسے صدمات نے زندہ درگور کیا۔ غالب کے بھانجے عارف کی جواں سالی میں موت ان تمام صدمات کے علاوہ ہے۔ جہاں غالب کی تمام اولادیں بچپن ہی میں داغ جدائی دے گئیں وہاں خوشحال کو اولاد کی نافرمانی کا دکھ اٹھانا پڑا۔ دونوں نے ستر سال سے زیادہ کی عمر پائی۔ خوشحال وغالب خلفائے اربعہ کا احترام کرتے تھے اور اہل بیت نبی کے خاص معتقد تھے۔ دونوں پر رافضی ہونے کا الزام لگا اور دونوں نے ایسے الزام کو جھٹلایا۔ گو کہ غالب کی وفات کے بعد سنی اور شیعہ طبقات میں اپنے اپنے عقائد کے مطابق انکی تجویز و تکلیف کے سلسلے میں

بدگمانیاں پیدا ہوئیں مگر آخر کار غالب کو کسی عقیدہ کے مطابق دفن کیا گیا۔ ادھر خوشحال ایک راسخ العقیدہ سنی تھے اور انکو اسی کے مطابق سپرد خاک کیا گیا۔

یہ تو تھیں خوشحال و غالب کی شخصیتوں میں موافقت کی باتیں۔ اب ذرا شخصیت ہی کے ضمن میں ان دونوں میں موجود تفاوت پر بات کرتے ہیں۔ جسمانی ساخت کے زمرے میں ظاہر ہے کہ پہاڑوں کے پروردہ پشتون (خوشحال) اور آگرہ کے محلات میں پلنے والے ترک زادے (غالب) میں فرق تھا۔ خوشحال تو موند تھے اور مرد تیر و تنگ ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے۔ مگر غالب شاعری کے علاوہ کسی دوسرے میدان کے دشمن نہ تھے۔ غالب ہمیشہ عشرت کے دلدادہ تھے تو خوشحال سادگی پسند تھے۔ خوشحال کا رجحان مذہب کی طرف تھا تو غالب آزاد منش انسان تھے۔ غالب اپنا پرست تھے تو خوشحال غیرت پر مرمٹنے والے تھے۔ خوشحال Extrovert تھے اور گھر سے باہر کے امور میں زیادہ خوش رہتے تو غالب مزاجاً Introvert تھے۔ کمرے میں اٹکیٹھی جلا کر بیٹھنا اور شعر و شاعری کرنا زیادہ پسند کرتے تھے۔ غالب نے غیر آسودہ گھر یلو زندگی سے فرار کے طور پر جوانی میں عشق کا تجربہ کر ڈالا تھا مگر خوشحال اس جھنجھٹ سے دور رہے۔ خوشحال نے ۱۳ سال کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ یوسفویوں کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔ تو غالب اتنی ہی عمر میں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔

آئیے اب ذرا اپنے ان نابغہ شعراء کے فن میں جھانک کر ان میں ہم آہنگی تلاش کریں۔ اس بات میں سب سے پہلی چیز جس کی طرف نظر جاتی ہے۔ وہ یہ کہ دونوں

نے شاعری کا آغاز چھوٹی عمر میں کیا۔ اس پر اتنا اضافہ اور ہے کہ جہاں غالب نے دس برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا وہاں خوشحال کو شاعری شروع کرنے میں دس برس مزید لگ گئے۔ خوشحال و غالب نے اپنی اپنی زبان کی جن اصناف شاعری کو درجہ کمال تک پہنچایا ان میں غزل، قصیدہ اور رباعی شامل ہیں۔ دونوں نے نثر میں بھی لکھا اور اپنی اپنی جودت طبع کے مطابق جدید نثر کے بانی کہلائے۔ خوشحال نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ”دستار نامہ“ کی طرز تحریر کے ذریعے پشتو نثر کو سادہ اور روزمرہ کے مطابق بنا کر جدید دور میں داخل کر دیا۔ ادھر غالب نے اپنے مکاتیب کے ذریعے اردو نثر کو جدیدیت بخشی۔

خوشحال و غالب دونوں نے تاریخ نویسی بھی کی۔ غالب نے فارسی میں مقلیدہ خاندان کی تاریخ (مہر نیم روز) اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے حالات (دشتیو) لکھنے کا کارنامہ سرانجام دیا تو خوشحال نے اپنے قصیدوں میں شہر دہلی اور وہاں گزرنے والے افغان بادشاہوں کے حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ دونوں نے شعر و شاعری خاص طور پر غزل کے میدان میں نئے تجربات کئے ہیں۔ اگر غالب نے اسحاق میہ طرزی کی اردو غزلیں لکھ کر اور چھوٹی بحر کی فارسی سے پاک غزلیں پیش کر کے شاعری کے میدان میں نئے تجربات کئے تو خوشحال نے پشتو شاعری میں قسبہ طرزی اور سوال و جواب لئے ہوئی غزلیں لکھیں اور ایک ہی شعر کے دو مصرعے الگ الگ زبانوں یعنی پشتو اور فارسی میں لکھنے کا تجربہ کیا۔ اگر خوشحال نے پشتو نثر و شاعری کے نئے دور کا آغاز کیا تو غالب نے جدید اردو نثر و شاعری کا آغاز کیا۔ یوں یہ دونوں تابعدار روزگار ستیاں اپنی اپنی زبان کے شعر و نثر پر

شبہت ہو گئیں۔

خوشحال و غالب کا نظریہ شعر ایک دوسرے سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ جہاں غالب نے اپنا نظریہ شعر اختصار سے بیان کیا ہے۔ خوشحال نے اسکی تفصیل کو ”دستار نامہ“ میں نمایاں جگہ دی۔ ہمارے ان ہر دو نامہ شعراء کے کلام میں سائنسی توجیحات ملتی ہیں جو حیران کن حد تک گہرے سائنسی ادراک کا پتہ دیتی ہیں۔ جہاں تک علامہ اقبال کا تعلق ہے تو انہوں نے خوشحال و غالب دونوں کو اپنے کلام میں سراہا ہے۔

خوشحال و غالب کے فن میں تفاوت بھی پایا جاتا ہے۔ جہاں خوشحال نے غزل کے علاوہ حماسی شاعری کی اور وطن کی محبت میں قصیدے رقم کئے وہاں غالب نے دوسری اصناف یعنی سہر و غیرہ پر بھی اپنا قلم آزمایا۔ خوشحال کے پاس قوم کے لئے ایک واضح پیغام تھا۔ انہوں نے باز اور شکلیال کا تصور دے کر اپنی قوم کو متحد کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور یوں ایک سیاست دان اور مفکر کے درجہ تک پہنچ گئے۔ ادھر غالب کی شاعری میں ایسا کوئی پیغام نہ تھا۔ ہاں البتہ انہوں نے غزل کی بوقلمونی کے ذریعے جدید اردو شاعری کی بنیاد ڈالی

قصیدہ گوئی کے میدان میں دیکھیں تو غالب نے قصیدے کو مدح حضرت علی اور تعریف شاہنک محمد و درکھا۔ ادھر خوشحال نے اپنے بیشتر خیالات کا اظہار قصیدے کے ذریعے کیا۔ اکسٹیں اور گنزیب بادشاہ کی جہو بھی شامل تھی۔

جہاں غالب کے ہاں تاریخ نویسی کا فن تو موجود ہے اور تاریخ گوئی مفقود وہاں خوشحال نے تاریخ نویسی اور تاریخ گوئی دونوں میں نام پیدا کیا۔ خوشحال نے اپنی شاعری

میں صوفیانہ خیالات کا اظہار کیا کیونکہ انہوں نے اسلامی صوفی تحریک کا مطالعہ کر رکھا تھا لیکن غالب نے اسلامی یا یونانی صوفی تحریک کا کوئی باقاعدہ مطالعہ نہیں کیا تھا۔ بالاس ہمدان کے کلام میں اچھے صوفیانہ اشعار بھی ملتے ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ غالب ہادہ خوار کیونکر صوفی ہو سکتے تھے۔

خوشحال و غالب کے فلسفہ غم میں تفاوت پایا جاتا ہے۔ جہاں خوشحال ہر غم کو سینے سے لگانے اور اس کا ہوادہ کرنے کا خواہشمند نظر آتا ہے۔ وہاں غالب غم کا اسیر ہوتا ہے۔ لیکن اپنی خوشدلی طبع کی ڈھال سے غم کا حملہ روکنے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔

خوشحال و غالب نے فارسی کلام بھی کہا مگر غالب کی فارسی شاعری میں کلام نہیں انہوں نے فارسی میں جو شاعری کی اس میں انکی اردو شاعری کی نسبت زیادہ جذبہ اور بدبہ پایا جاتا ہے۔ خود انہوں نے بھی اپنی فارسی شاعری کو اردو شاعری سے بہتر جانا۔ اور اپنی اردو شاعری کو فارسی شاعری کے مقابلے میں ”بے رنگ“ کہا۔ ادھر خوشحال کی مادری زبان فارسی نہ ہوتے ہوئے بھی انہوں نے فارسی شاعری کی گو کہ اُن کے پشتو دیوان میں ہی بچیس فارسی غزلیں ملی ہیں۔ جو تقریباً دو سو پچاس اشعار پر مشتمل ہیں۔

جرات اظہار اور بے باکی کے میدان میں خوشحال نے گویا پشتو شاعری میں ایک ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ انہوں نے کسی کو نہیں بخشا۔ مغلوں سے لیکر اپنے افغان ہم وطنوں حتیٰ کہ اپنے قبیلے خٹک اور اپنی اولاد تک کو نہیں بخشا اور سب کو بے نطق کی ستائی ہیں۔ خوشحال نے اپنی شاعری میں جنسی بے باکی کو درجہ کمال تک پہنچایا۔ غالب نے ایسی

کوئی بات نظر نہیں آتی۔ وہ محبوبہ کے پاؤں تک چھونے سے گھبراتے ہیں اور یہی فکر دامنگیر رہتی ہے کہ کہیں ایسا کرنے سے محبوبہ ناراض نہ ہو جائے۔ بوسہ مانگتے ہیں تو وہ بھی ڈر اور ہے۔

حسن و عشق کی بات ہو۔ تو بھی خوشحال و غالب کی شاعری میں تفاوت پایا جاتا ہے۔ جہاں خوشحال حسن کے دلدادہ اور عشق کے متوالے ہیں وہاں غالب اس میدان میں نہایت احتیاط سے رک رک کر قدم رکھتے ہیں۔ گو کہ غالب کی فارسی شاعری میں اردو شاعری کی نسبت عشق کا جذبہ زوروں پر رہتا ہے۔

قطرہ مزاج کے میدان میں بھی ہمارے ان شعراء آفاق شعراء کے معیار مختلف ہیں جہاں خوشحال طنز کا حیر استعمال کرتے ہیں اور مزاج اُنکے مزاج میں نہیں۔ وہاں غالب کے کلام میں طنز بھی پایا جاتا ہے اور مزاج بھی۔ یہاں تک کہ غالب کے شاگرد مولانا حالی نے اپنے استاد کو ”حیوان ظریف“ تک کہہ ڈالا۔

خوشحال و غالب کی شاعری میں سے اور سے خانہ کے متعلق جو اشعار ملتے ہیں۔ ان سے تو بادی النظر میں یہی اندازہ ہوتا ہے کہ گویا دونوں پر لے درجے کے میخوار تھے۔ لیکن درحقیقت جہاں خوشحال شراب کا ایک قطرہ بھی چکھے بغیر میخوار کی حد تک پہنچے وہاں غالب نے سے پرستی بھی کی اور میخواری بھی۔ ان الفاظ کے ساتھ موازیہ خوشحال و غالب الختام پذیر ہوتا ہے۔